پاکستان کا مستقبل

مصنف

سعید ملک

مرتب

مقبول الرحیم مفتی

فہرست

پیش لفظ	محمد احسن تہامی	۵
حرف تمنا	ارشاد احمد حقانی	۷
سعید ملک، جماعت اسلامی اور "پاکستان کا مستقبل"	مقبول الرحیم مفتی	۱۱

پاکستان کا مستقبل

از: سعید ملک

دیباچہ طبع اول ۳۰

پیش لفظ ۳۲

حصہ اوّل

تاریخی پس منظر ۳۵

قیام پاکستان کے بعد ۵۳

بے مقصدیت اور سطحیتِ فکر ۶۳

حصہ دوم

تمہید ۶۹

قیام نظام کی شرائط ۷۳

عمل پیرا ہونے کی صورت ۸۰

دستور کی حیثیت ۱۰۳

دستور اور نظام کا تعلق		۱۱۰

حصہ سوم

اصلاح کی ضرورت		۱۲۴
زندگی کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا		۱۲۶
پیش نظر کام کی نوعیت		۱۳۱
آسان نسخوں کی تلاش بے سود ہے		۱۴۵
پاکستان میں اصولی تحریکوں کے امکانات		۱۴۹
انتشار کی وبا		۱۶۶
محض انتخابی پروگرام سے تعمیر نہ ہوسکے گی		۱۷۰
کام کیسے انجام پائے		۱۷۴

ضمیمے

ا۔ جماعتِ اسلامی سے استعفیٰ	سعید ملک	۱۸۵
۲۔ استعفےٰ کا جواب	میاں طفیل محمد	۱۸۹
۳۔ جماعتِ اسلامی میں قیادت کا مقام	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۲۰۰

پیش لفظ

جناب سعید ملک مرحوم کا شمار اس خطے میں مسلمانوں اور اسلام کے غلبے کی گوناں گوں تحریکوں کے ان بے شمار گم نام سپاہیوں میں کرنا ممکن ہے جو اس دنیا میں کسی ستائش کی تمنا اور کسی صلے کی پروا کیے بغیر، اپنا کارنامہ، حیات مکمل کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی ملک صاحب نمود و نمائش سے بہت دور تھے اور اصولی طور پر ہمہ گیر تبدیلی کی علم بردار کسی تحریک اور اُس کی قیادت کے لیے استقلال مزاج کے ساتھ علمی اور فکری سطح پر بنیادی نوعیت کی جدوجہد کے دوران میں غیر ضروری نمود و نمایش سے پرہیز اور اجتناب کو، کام کی نوعیت کے باعث، اس کے ایک ضروری تقاضے کی حیثیت دیتے تھے۔

جنوری ۱۹۵۷ء میں جماعتِ اسلامی سے الگ ہونے کے بعد موصوف نے تقریباً ساری زندگی گوشہ گمنامی میں بسر کی لیکن اپنے پیچھے دو ایسی وقیع علمی یادگاریں چھوڑ گئے کہ اب اُن کا کام اور نام دونوں احیائے ملت کی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ دارالتذکیر اس سے پہلے ان کی آخری علمی کاوش ''اسلام، مسلمان اور دورِ حاضر'' کی ضخیم جلد (۹۴۰ ص) قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ اب مصنف کی اولین تصیف '' پاکستان کا مستقبل'' بھی بعض اہم تاریخی دستاویزات اور حوالوں کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں اُس وقت لکھی گئی جب جناب سعید ملک جماعتِ اسلامی کے رکن تھے۔ چونکہ جماعت میں رہتے ہوئے اُنھیں اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی گئی، اس لیے مرحوم نے جماعت سے الگ ہونے کے بعد اسے شائع کیا۔ مصنف نے پہلی اشاعت میں نہ اپنے اُن ذاتی مشاہدات و تجربات کا کوئی ذکر کیا جو اس کی تصنیف کا محرک بنے تھے اور نہ ہی اُس تحریک کا براہ راست تذکرہ، جس کی پالیسی اور پروگرام میں تبدیلیوں پر تنقید کے لیے موصوف نے قلم اٹھایا تھا۔ مرتب نے ملک صاحب کے جماعت اسلامی سے استعفےٰ اور جماعت کے قیم میاں طفیل محمد صاحب کی طرف سے اُس کے جواب کو شامل کر کے ایک حد تک اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب میں شامل جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ''نایاب'' تحریر ''جماعتِ اسلامی میں قیادت کا مقام'' کے مطالعے سے بھی قارئین اس امر کا اندازہ لگا سکیں گے کہ جماعت کی

قیادت کے وہ کون سے فکری و تنظیمی رجحانات تھے جن کے باعث جناب سعید ملک اور اُن جیسے بہت سے دوسرے ذہین، باصلاحیت اور صاحبِ علم مخلصین کے لیے جماعت اسلامی کی جدوجہد میں شریک رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔

مرتب برادر مقبول الرحیم مفتی نے ''سعید ملک، جماعت اسلامی اور پاکستان کا مستقبل'' کے عنوان سے مصنف کے خاندانی اور فکری پس منظر اور جماعت اسلامی میں اُن کی خدمات اور اُن حالات کا اجمالی نقشہ پیش کر دیا ہے جو جماعت سے اُن کی علیحدگی کا باعث بنے۔

ہم جناب ارشاد احمد حقانی کے شکر گزار ہیں کہ اُنھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات سے وقت نکال کر اس کتاب کے حوالے سے ایک ایسی مختصر اور جامع تحریر عنایت فرمائی ہے جو نہ صرف اِس کتاب کے پس منظر اور پیش منظر دونوں کو واضح کر رہی ہے بلکہ '' پاکستان میں ایک سچا اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے خواہش مند داعیوں'' کے لیے رہنمائی کا سامان بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ جناب حقانی کی یہ تحریر دراصل اِس ساری داستان کے ایک چشم دید گواہ کی تحریر ہے۔ ''پاکستان کا مستقبل'' کی پہلی اشاعت پر اُن کا نام بطور طابع و ناشر درج تھا۔

کتاب میں ان اضافوں اور اِس کی پہلی اشاعت کے پس منظر کی وضاحت کے بعد ضروری محسوس ہوا کہ اب اِس کے نام کو بھی موضوع کے اعتبار سے واضح کر دیا جائے، لہٰذا اب اسے '' جماعتِ اسلامی کی انتخابی سیاست اور پاکستان کا مستقبل'' کے عنوان سے شایع کیا جا رہا ہے۔

محمد احسن تہامی
دارالتذکیر

حرف تمنا

ارشاد احمد حقانی

جماعت اسلامی پنجاب کے پہلے امیر، جماعت کے ترجمان روزنامے ''تسنیم'' کے ایڈیٹر اور ایک زمانے میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے سب سے کم عمر رکن جناب سعید ملک مرحوم جماعت اسلامی کے ذہین ترین راہنماؤں میں سے ایک تھے۔ وہ سرکاری ملازمت میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے لیکن اپنے آپ کو جماعتی کام کے لیے وقف کر دینے کی خواہش کے تحت ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور جماعت کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے انھیں براہ راست شوریٰ کا رکن نامزد کیا۔

۱۹۵۶ کے اوائل میں جب جماعت اسلامی میں اپنی آئندہ حکمت علمی کے حوالے سے اختلافات ابھرے تو ایک جائزہ کمیٹی قائم کی گئی جس کی رپورٹ جماعت میں متنازع بن گئی، جس بحران کو حل کرنے کے لیے اسے قائم کیا گیا تھا جب اس سے بھی بڑا بحران پیدا ہو گیا تو جناب سعید ملک نے اس وقت کی جماعتی قیادت جو جماعت کے مرکز واقع اچھرہ پر قابض تھی کے عزائم کو بھانپتے ہوئے جماعت سے استعفیٰ دے دیا اور جماعتی قیادت کو اس بات کا موقع نہ دیا کہ وہ جماعت سے ان کے اخراج کا فیصلہ اور اعلان کر سکے۔

اینٹی قادیانی ایجی ٹیشن کے نتیجے میں جماعت اسلامی پر ۱۹۵۳ میں جو وار کیا گیا تھا اس کی وجہ سے جماعت کی پوری قیادت کو زیر حراست لے لیا گیا۔ اس وقت جماعت کے امیر نے پارٹی امور چلانے کے لیے پہلی دفعہ پنجاب کا صوبائی نظم قائم کیا تھا اور جناب سعید ملک کو امیر صوبہ قرار دیا گیا تھا۔ اس وقت مجھے ان کے ساتھ صوبائی قیم یا جنرل سیکرٹری کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس پر آشوب دور میں ہم نے انتہائی مشکل حالات میں جماعت کے کام کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس دوران میں ہماری سب سے بڑی ذمہ داری اینٹی قادیانی ایجی ٹیشن کی تحقیقات کے لیے قائم کی جانے والی دو رکنی عدالت مشتمل بر چیف جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی کے رو برو جماعت کا مقدمہ پیش کرنا تھا۔ اس عدالت کی کارروائی آٹھ ماہ تک جاری رہی اور ہم دونوں قریب قریب روزانہ اس کے رو برو پیش ہوتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پنجاب میں

جماعت کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے لیے پورے صوبے کے دورے بھی ہوتے رہے، اور یہ طرفہ تماشا دیکھنے میں آیا کہ ہم جس بھی ضلع میں جلسہ کرنے کا اعلان کرتے وہاں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی جاتی۔ اس زمانے میں جناب سعید ملک نے بڑے مضبوط کردار اور بڑی قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔

۱۹۵۶ کے اوائل میں جب ملک صاحب نے دیکھ لیا کہ جماعت کی قیادت ان کے اعتراضات کو کوئی وزن نہیں دے رہی اور اس سے اپنا لائحہ عمل تبدیل کرنے کی کوئی امید نہ رہی تو جماعت سے علیحدگی کا فیصلہ کرنے کے ساتھ ہی انھوں نے پاکستان کی حیات اجتماعی کا ایک گہرا تجزیہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی کتاب ''پاکستان کا مستقبل''، لکھنی شروع کر دی۔ اس کتاب کی تصنیف میں میری ان سے مسلسل مشاورت ہوتی رہی۔ جب یہ کتاب ایک پبلشر کے پاس پہنچ گئی تو کسی طرح جماعت اسلامی کی قیادت کو اس کی بھنک پڑ گئی اور انھوں نے اس کا مسودہ پبلشر سے حاصل کر لیا۔ ملک صاحب کو جب اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے پبلشر کو دھمکی دی کہ اس نے مسودہ واپس نہ کیا تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی چنانچہ بصد مشکل مسودہ واپس حاصل کیا جا سکا اور میں نے اپنے اہتمام میں اپنے اعتماد کے ایک پبلشر سے اسے شائع کرایا۔

جناب سعید ملک نے اس کتاب میں جماعت اسلامی یا اس کے امیر کا نام لیے بغیر اس سوال پر بحث کی کہ پاکستان میں ایک اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومتی نظام کس طرح قائم کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے بعض معاصر تہذیبوں اور دوسرے ملکوں کے تجربات کا حوالہ دیتے ہوئے ثابت کیا کہ محض ہنگامی اور سیاسی کام سے ایک انتہائی بگڑی ہوئی اور پسماندہ قوم کو اسلام جیسے ارفع نظام زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تیار نہیں کیا جا سکتا اور محض انتخابی راستے سے کوئی بنیادی اور جوہری تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ جناب سعید ملک کے اس استدلال کی اصابت اور اس کا وزن وقت نے ثابت کر دیا ہے، ''پاکستان کا مستقبل'' ۱۹۵۷ میں شائع ہوئی جس کا مطلب ہے کہ اسے ۴۴ سال ہو چکے ہیں لیکن اس کا استدلال آج بھی اسی طرح محکم اور وزنی، حقیقت پسندانہ اور متعلق ہے جس طرح چار عشرے پہلے تھا بلکہ سیاسی حالات کے ہر اتار چڑھاؤ سے اس کا وزن مزید واضح ہوتا جا تا رہا ہے۔

مصدقہ روایت ہے کہ ۱۹۷۰ کے عام انتخابات میں بو وہ کامیابی کی بہت بڑی توقعات وابستہ اور استوار کرنے کے باوجود جب جماعت اسلامی کو پورے ملک سے صرف چار نشستیں ملیں تو مولانا مودودی نے انتخابی سیاست کا راستہ ترک کر کے اپنے اصل طریق کار کی طرف واپس جانے اور اپنی جماعت کی تمام تر توانائیاں

تعلیم، تبلیغ اور تربیت کے ذریعے ایک اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے فضا سازگار کرنے پر وقف کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جماعت کی دوسرے درجے کی قیادت اس تبدیلی پر آمادہ نہ ہوئی جس پر مولانا مودودی نے منصب امارت سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور جماعت اپنے سابقہ طریق کار پر ہی قائم رہی۔ جماعت کے نئے امیر میاں طفیل محمد پندرہ سال تک اس منصب پر فائز رہے لیکن ان کے دور میں جماعت اپنا دائرہ اثر کچھ ایسا وسیع نہ کر سکی۔ چونکہ اصلاً اس کی توجہ سیاسی اور انتخابی سر گرمیوں پر مرکوز تھی اس لیے وہ تعلیم، تبلیغ اور تربیت کے پہلوؤں پر بھی کوئی زیادہ توجہ نہ دے سکی، بلکہ جنرل ضیاءالحق کے مارشل کی مسلسل حمایت کرنے کی وجہ سے جماعت کا جمہوری امیج بھی گہنا گیا۔

۱۹۸۷ میں قاضی حسین احمد جماعت کے امیر منتخب ہوئے۔ انھوں نے اتحادوں کی سیاست بھی آزمائی، تنہا پرواز کا شوق بھی پورا کیا لیکن انتخابی سیاست تا حال انھیں بھی راس نہیں آئی۔ اجتماع قرطبہ منعقدہ اکتوبر ۲۰۰۰ کے بعد سے قاضی صاحب کو یہ احساس شدت سے ہو چکا ہے کہ بیلٹ پیپر کی طاقت کے بغیر ان کے لیے اقتدار میں آنا اور اپنے پروگرام پر عمل کرنا ممکن نہیں اس لیے اب وہ کروڑ ڈیڑھ کروڑ ووٹروں سے بوقت انتخابات جماعت کو ووٹ دینے کا حلف یا عہد نامہ پر کروانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ مہم کس حد تک کامیاب ہو گی اور آج دستخط کرنے والے ووٹ ڈالنے کے وقت کیا طرز عمل اختیار کریں گے اس کے بارے میں قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ ایک اور تجربے کے بعد جماعت اسلامی کو ایک دفعہ پھر وہی فیصلہ کرنا پڑ جائے جو ۱۹۷۰ میں مولانا مودودی نے کیا تھا۔

یہ تفصیل میں نے یہ واضح کرنے کے لیے لکھی ہے کہ جناب سعید ملک مرحوم نے پاکستان میں ایک اسلامی معاشرے اور ایک اسلامی نظام حکومت کے قیام کا جو طریق کار بیان کیا تھا وقت اس کی صداقت ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ثابت کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی سیاسی اور دینی جماعتوں کو جناب سعید ملک کے تجزیے اور استدلال پر گہرائی میں جا کر غور کرنا چاہیے۔ خاص طور سے ان لوگوں کو جو واقعی پاکستان میں ایک سچا اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے خواہش مند اور داعی ہیں۔ کوئی فرد یا قوم جب صراط مستقیم کی شاہراہ کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں سے منزل مراد تک پہنچنے کی کوشش اور خواہش کرتی ہے تو بسا اوقات وہ بھول بھلیوں کی نذر ہو جاتی ہے اور کئی سال گزرنے کے بعد بھی اسے محسوس نہیں ہوتا ہے کہ اس کا سفر کولہو کے بیل کا سفر تھا اور ایک دائرے میں چکر لگانے کے سوا اس نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ پاکستان میں ایک اسلامی

معاشرے کے خواہش مند حلقوں کو جتنی جلدی یہ حقیقت سمجھ آجائے اتنا ہی اچھا ہوگا۔

جناب سعید ملک کے صاحبزادے شاہد ملک تعریف کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے ذہین اور صاحب علم والد کی تصانیف کی اشاعت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین

ارشاد احمد حقانی

سعید ملک، جماعت اسلامی اور ''پاکستان کا مستقبل''

مقبول الرحیم مفتی

پس منظر

۱۹۱۹ برطانوی ہند کی تاریخ کا ایک ہنگامہ خیز سال تھا۔اس برس ۴اپریل کو گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ اور ایسے ہی دوسرے استبدادی قوانین کے خلاف پورے ہندوستان میں ہڑتال کی اپیل کی تھی۔ ۱۳اپریل کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں احتجاجی اجتماع پر بلا تنبیہہ فوج سے فائرنگ کرواکر جنرل ڈائر نے تقریباً چار سو(۴۰۰)غیر مسلح شہریوں کو زندگی سے محروم کر دیا اور ۱۲۰۰ کے لگ بھگ بے قصور شہری زخمی ہوئے۔ ۲۳دسمبر ۱۹۱۹ کو جارج پنجم کی تاجپوشی کے دن سرکار برطانیہ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ذریعے اپنی ہندوستانی رعایا کو امور مملکت میں شریک کرنے کے لیے صوبائی سطح پر کچھ اختیارات دیے۔اسی سال میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے سالانہ اجلاس بھی امرتسر میں منعقد ہوئے جن کا مرکزی نکتہ ہندو مسلم اتحاد تھا۔ایسے ہنگامہ خیز سیاسی ماحول کے حامل شہر،امرتسر میں،۲۵دسمبر ۱۹۱۹کو شہر کی ایک متمول اور تعلیم یافتہ مسلمان سیاسی شخصیت، محمد طفیل ملک کے گھر پہلے بچے کی ولادت ہوئی۔بچے کا نام محمد سعید احمد رکھا گیا۔یہی بچہ جوان ہو کر سعید ملک کے نام سے معروف ہوا۔

محمد طفیل ملک علی گڑھ کے گریجویٹ اور پنجاب یونیورسٹی کے لا گریجویٹ تھے۔ان کا شمار تحریک خلافت کے سرگرم کارکنوں اور مولانا محمد علی جوہر کے قریبی ساتھیوں میں ہوتا تھا۔موصوف نے ۲۶ سال کی عمر میں ''الخلافت'' کے نام سے کتاب لکھی جو ۱۹۲۰ میں شائع ہوئی۔ تحریک کے دنوں میں انھوں نے ''سیرت'' کے نام سے ایک اردو اخبار بھی جاری کیا جسے سرکار نے بند کر دیا۔

تحریک خلافت کی جدوجہد کے بعد طفیل ملک محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ کلر کہار کے نزدیک بوچھال کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔انھوں نے حضرات حسنین کی شہادت کے موضوع پر بھی ایک کتاب لکھی جو ''شہادتین'' کے نام سے شائع ہوئی۔ ان کا ضخیم کام جو ''مشاہیر العرب'' کے نام سے چار جلدوں پر مشتمل تھا، تقسیم ہند کے وقت امرتسر میں رہ گیا، لہذا اس کی

اشاعت کا مرحلہ نہ آسکا۔ ۱۹۴۳ میں جب جناب طفیل ملک کا انتقال ہوا تو ان کے بڑے صاحبزادے سعید ملک ڈیرہ دون میں فارسٹری کی تعلیم کے آخری مراحل طے کر چکے تھے اور ان کے سب سے چھوٹے (نویں) بچے کی عمر ایک سال تھی۔ گویا عملی زندگی میں پہلا قدم رکھتے ہی جناب سعید ملک کے کاندھوں پر ۹ بہن بھائیوں اور والدہ پر مشتمل خاندان کی ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا تھا۔

خاندان کے اس سیاسی اور علمی مزاج اور وقت کے سیاسی ماحول سے جناب سعید ملک کی ذہنی اور فکری اٹھان اور سیاسی رجحانات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ماہنامہ ترجمان القرآن کے ذریعے وہ ابتدائی عمر میں ہی سید مودودی کے افکار و نظریات اور دعوت سے متاثر ہو چکے تھے۔ جب دوران تعلیم مولانا ان کے کالج (ایم اے او کالج امرتسر) میں تشریف لائے تو نوجوان سعید ملک نے انھیں اپنے گھر مدعو کیا۔ مدعوئین میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیر و راساتذہ بھی تھے، جن میں فیض احمد فیض، پروفیسر محب الحسن اور ڈاکٹر کرامت حسین جعفری، جیسے منتخب روزگار، اہل فکر و نظر بھی شامل تھے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے۔

سید مودودی سے تعلق

جب سید مودودی نے ۱۹۳۸ میں علامہ اقبال کی دعوت، اور تعاون کے وعدے پر، حیدرآباد (دکن) سے ہجرت کر کے پنجاب کے دور افتادہ دیہی قصبے پٹھان کوٹ کے قریب ''دارالاسلام'' کی بنیاد رکھی تو وہاں ان سے استفادے کے لیے گاہے گاہے جانے والے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سعید ملک بھی شامل ہوتے تھے۔ زمانہ تعلیم میں ہی انھوں نے سید مودودی کے ساتھ ایک ذاتی نوعیت کا تعلق اور رابطہ استوار کر لیا تھا۔ اسی دیرینہ تعلق کے باعث ۲۰ اپریل ۱۹۵۲ کو لاہور میں جناب سعید ملک کا نکاح بھی سید مودودی نے پڑھایا اور جب شادی کے بعد یہ نیا خاندان لاہور منتقل ہوا تو ۵۔اے ذیلدار پارک میں سید مودودی کی رہائش گاہ کی بالائی منزل اس کا پہلا آشیانہ بنی۔ قیام پاکستان کے بعد جناب سعید ملک جب تک راولپنڈی میں رہے، وہاں سید مودودی کی آمد کے موقع پر عموماً ان کے قیام کا اہتمام بھی ملک صاحب کے مکان پر ہی کیا جاتا اور اس دوران میں جماعت کے اکابرین کے اہم اجلاس بھی وہیں منعقد ہوتے۔

گریجویشن کے بعد جناب سعید ملک نے فارسٹ کالج ڈیرہ دون سے فارسٹری کے دو سالہ

کورس [۱۹۴۱-۴۳] کی تکمیل کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کی یہ اہلیت خود ان کے لیے اور پاکستان کے لیے نہایت مفید اور منفعت بخش ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۸ تک ملک صاحب محکمہ جنگلات کے ساتھ وابستہ رہے کیونکہ پانچ سال کی لازمی ملازمت اس کورس کی شرائط میں شامل تھی۔ ملک صاحب نے ملازمت کا آغاز شملہ سے کیا اور جب ملک تقسیم ہوا تو وہ کہوٹہ میں تھے۔[۱]

جماعت اسلامی میں شمولیت

۱۹۴۸ میں سرکاری ملازمت سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ملک صاحب نے عمارتی لکڑی کا کاروبار شروع کیا اور آزادی کے ساتھ جماعتی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ ۲۳ فروری ۱۹۵۰ کو جماعت نے ان کی رکنیت کی درخواست منظور کی اور انھیں حلقہ راولپنڈی کا امیر بنادیا گیا۔ نومبر ۱۹۵۰[۲] میں انھیں مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا گیا۔ ۱۹۵۱ میں پنجاب کے صوبائی انتخاب میں موصوف نے راولپنڈی سے جماعت کے ''پنچایتی نمائندے''[۳] کی حیثیت سے حصہ لیا۔

۱۹۵۳ میں حکومت پنجاب کے اشارے پر احمدیوں کے خلاف احرار کی اٹھائی ہوئی تحریک اور ایجی ٹیشن کے دوران میں، سید مودودی کو ''قادیانی مسئلہ'' نامی کتابچہ لکھنے پر ایک فوجی عدالت نے ۱۱ مئی کو سزائے موت سنائی، جسے ۱۳ مئی کو ملکی اور غیر سطح پر غیر معمولی احتجاج اور اپیلوں کے باعث عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ بعدازاں وفاقی حکومت نے ''فسادات پنجاب'' کی عدالتی تحقیقات کے لیے جسٹس منیر اور جسٹس محمد رستم کیانی پر مشتمل تحقیقاتی عدالت قائم کی۔ اس عدالت نے جماعت اسلامی کو عدالتی کارروائی میں ایک فریق[۴] کی حیثیت سے شامل کیا۔ اس مرحلے پر چونکہ سید مودودی جیل میں ۱۴ سال قید کی سزا کاٹ رہے تھے اور جماعت کے دیگر قائدین بھی سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیے گئے تھے اس لیے جماعت نے جناب سعید ملک کو جماعت اسلامی پنجاب کا امیر اور جناب ارشاد احمد حقانی کو صوبے کا قیم (سیکرٹری جنرل) مقرر کیا۔ ان دونوں حضرات نے آٹھ ماہ تک عدالتی کارروائی میں جماعت کی نمائندگی کی۔ اس وقت تک چونکہ جماعت نے باقاعدہ صوبائی نظم قائم نہیں کیا تھا، اس لیے جناب سعید ملک کو جماعت اسلامی پنجاب کا پہلا امیر بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

درحقیقت قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی مرحوم نے جماعت اسلامی کی پالیسی اور طریق کار کو یکسر

تبدیل کرنے کے لیے جو "اجتہادی" [۵] فیصلہ کیا تھا، اس پر عمل درآمد کے لیے جماعت میں، صاحب حیثیت اور صاحب صلاحیت مردان کار کی ضرورت میں یک بیک اضافہ ہو گیا تھا، دوسرے ہنگامی اور انتخابی سیاست میں جماعت کی بھرپور شرکت اور اس کے نتیجے میں ہونے والی گرفتاریوں نے بھی ایک خلا پیدا کر دیا تھا، اس لیے ایک تیس (۳۰) سالہ نوجوان نے دو تین برس کی مدت میں وہ مراحل طے کر لیے جن کے لیے جماعتی زندگی کے دس پندرہ برس بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ مدت درکار ہوتی ہے۔

مولانا مودودی سے اختلاف اور کتاب کی تیاری

سعید ملک جون ۱۹۵۵ تک جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن رہے، ان کی اصابت رائے اور بالغ نظری کے باعث، اُس دور میں شوریٰ نے جتنی بھی کمیٹیاں تشکیل دیں تقریباً اُن سب میں انھیں شامل کیا گیا۔ حتیٰ کہ جماعت کی قیام پاکستان کے بعد کی پالیسی کے بارے میں ارکان جماعت میں پائی جانے والی بے چینی اور اختلاف رائے کا اندازہ لگانے کے لیے جو پہلی "جائزہ کمیٹی" [۶] بنائی گئی اس میں بھی انھیں شامل کیا گیا تھا۔ جماعتی زندگی کے دوران میں جناب سعید ملک کو جو اہم ترین ذمہ داری سونپی گئی وہ جماعت کے ترجمان روزنامہ "تسنیم" کی ادارت کی ذمہ داری تھی۔ یہ اگرچہ ایک ایسی ذمہ داری تھی جس کا تعلق براہ راست جماعت کی پالیسی اور پروگرام کے اظہار واعلان سے تھا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ امیر جماعت کی نئی پالیسی سے نہ صرف غیر مطمئن تھے بلکہ اسے جماعت کے نصب العین کے بالکل برعکس اور اس کے مقاصد کے لیے غیر مفید اور نقصان دہ سمجھتے تھے۔

زیر نظر کتاب "پاکستان کا مستقبل" ملک صاحب نے جماعتی زندگی کے آخری ایام میں لکھی۔ اس کتاب میں اگرچہ نہ جماعت کا ذکر موجود ہے نہ اس کے کسی پروگرام اور حکمت عملی کا براہ راست حوالہ، البتہ جماعت اسلامی، پاکستان میں جس انداز کی ہمہ گیر تبدیلی اور سیاسی انقلاب لانے کا عزم رکھتی تھی، عالمی سطح پر اس نوع کی تبدیلیوں کے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تجزیہ کر کے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگر فکری انقلاب اور معاشرے کی تعمیر نو کے بجائے ساری توانائیاں حصول اقتدار کی جدوجہد میں کھپا دی جائیں گی تو نہ جماعت کا وہ رنگ اور مزاج باقی رہے گا جو اس کے اصل مقاصد کے لیے، بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور نہ ان مقاصد کی طرف پیش قدمی ممکن ہو سکے گی۔

اس کتاب کے لیے تحریر کا جو اسلوبِ اختیار کیا گیا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کی نئی پالیسی

اور پروگرام سے اختلاف کے باوجود سعید ملک جماعت سے الگ ہونے کا ارادہ نہ رکھتے تھے، بلکہ جماعت کے اندر رہ کر جماعت کے خواص و عوام دونوں تک اپنا نقطہ نظر پہنچا کر اپنے تئیں اصلاح کی کوشش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ملک صاحب کی یہ خوش فہمی کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی دور کر دی گئی کہ جماعت کے اندر امیر کی پالیسی سے اختلاف رکھنے والوں کے لیے اپنی رائے کی عمومی تبلیغ کی آزادی موجود ہے۔

تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ جماعت کے ایک نوجوان کارکن محمد حیات نے جو بعد میں کوثر نیازی کے قلمی نام سے مشہور ہوئے اور جو اس وقت روزنامہ ''تسنیم'' میں ایک نو آموز کے طور پر اپنے صحافتی زندگی کا آغاز کر رہے تھے، پبلشر سے کتاب کا مسودہ حاصل کر کے مولانا مودودی تک پہنچا دیا۔ اسی اثنا میں جناب سعید ملک اور جناب مصطفی صادق سید مودودی سے ملنے گئے تو انھوں نے سعید صاحب سے کہا کہ آپ ایک ایسی کتاب لکھ رہے ہیں جو جماعت کی پالیسی پر تنقید کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک صاحب نے کہا کہ کتاب ابھی چھپی بھی نہیں، آپ کو اس کے وجود کا علم کیسے ہوا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ مسودہ جماعتکے اکابرین تک پہنچ چکا ہے تو ملک صاحب نے شدید غصے کے ساتھ دھمکی دی کہ وہ پولیس میں مسودے کی ''چوری'' کی رپٹ درج کروائیں گے۔ اس رسوا کن صورت حال کو رونما ہونے سے روکنے کے لیے انھیں کوثر نیازی صاحب کو ہی ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ مولانا امین احسن اصلاحی کو [اپنے سائیکل پر بٹھا کر] سعید ملک کے پاس لے جائیں تا کہ مولانا انھیں یہ یقین دہانی کروا سکیں کہ ان کی تصنیف کا مسودہ بتمام و کمال واپس پہنچا دیا گیا ہے اور دوسرے یہ کہ جماعت میں رہتے ہوئے جماعتک کی پالیسی اور پروگرام پر اس طرح کی بالواسطہ تنقید بھی نظم جماعت (ڈسلپن) کی شدید خلاف ورزی کے مترادف ہے جس کی انھیں اجازت نہیں دی جا سکتی۔[6] دیباچے میں جناب سعید ملک نے کتاب کی اشاعت میں ایک سال کی تاخیر کے حوالے سے جن ''گوناگوں اسباب'' کا ذکر کیا ہے، ان میں سے اہم ترین سبب یہی تھا۔ اس روایتک ے راوی جناب سعید ملک کے صاحبزادے جناب شاہد ملک ہیں۔

جماعت سے علیحدگی

جناب سعید ملک جماعت اسلامی میں مولانا مودودی کی اجتہادی پالیسی سے اختلاف رکھنے والے واحد شخص نہ تھے، البتہ اس پالیسی کے خلاف جماعت کی صفوں میں برملا اپنی رائے کا اظہار کرنے والے واحد شخص ضرور تھے۔ چونکہ مولانا مودودی اور دیگر قائدین جماعت کی گرفتاری کے دوران میں صوبائی امیر کی حیثیت

سے وہ اپنی غیر معمولی کارکردگی کے باعث جماعت کے اندر متعارف بھی ہو چکے تھے اور ان کی رائے کا وزن بھی محسوس کیا جاتا تھا، اس لیے مرکز نے ایسے موثر اور بے باک شخص سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے کارروائی کا آغاز کر دیا۔ امیر حلقہ راولپنڈی سید صدیق الحسن گیلانی نے ان کی رکنیت معطل کر کے انھیں چارج شیٹ دے دی۔ جناب سعید ملک کی شکایات کے بارے میں شوریٰ نے مولانا عبدالغفار حسن اور محمد باقر خان پر مشتمل جو کمیٹی تشکیل دی تھی، جواب دعویٰ کے طور پر یہ چارج شیٹ اسے بھی پیش کر دی گئی مگر ابھی اس کمیٹی نے اپنے کام کا آغاز بھی نہ کیا تھا کہ مولانا مودودی مرحوم نے ۲۳ دسمبر ۱۹۵۶ کے مراسلے میں کمیٹی کے صدر مولانا عبدالغفار حسن پر جائزہ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے کمیٹی کے دیگر ارکان کے ساتھ ایک ''نادانستہ سازش'' میں ملوث ہونے کا الزام لگا کر شوریٰ کی رکنیت سے استعفٰی طلب کر لیا۔

اس صورت حال میں ۵ جنوری ۱۹۵۷ کو جناب سعید ملک نے پریس کانفرنس میں جماعت کی رکنیت سے استعفا پیش کر دیا۔ (استعفٰی کا متن ضمیمے میں دیکھیے) میاں طفیل محمد نے قیم جماعت کی حیثیت سے پریس کانفرنس میں استعفا پیش کرنے کو جماعت کی روایت کے خلاف قرار دیا لیکن صرف ۵ دن بعد ۱۰ جنوری ۱۹۵۷ کو جب سید مودودی نے جماعت کی امارت سے استعفا دیا تو میاں طفیل محمد صاحب نے بھی جماعت کی روایت اور مولانا اصلاحی کے مشورے کے باوجود استعفٰی کو شوریٰ کے سامنے پیش کرنے سے پہلے، جناب سعید ملک کی قائم کردہ روایت کے مطابق فوری طور پر پریس کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھا، گویا:

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن گیلانی
وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں 'تھی'

مولانا مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی کے ساتھ سعید ملک مرحوم کے وصل اور فصل کی داستان تو ان کے استعفٰی کے ساتھ مکمل ہو گئی لیکن اس کے بعد جماعت اسلامی میں مولانا مودودی مرحوم نے اپنی ''اجتہادی پالیسی'' کو منوانے اور شوریٰ پر امیر کی بالادستی قائم کرنے کے لیے ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان سے لے کر کوٹ شیر سنگھ کی شوریٰ تک جو کچھ کیا، اس نے ملک صاحب کے تمام خدشات کو درست ثابت کر دیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی کتاب ''جماعت اسلامی کی تاریخ کا گمشدہ باب'' میں ان تمام واقعات کی تفصیل کے ساتھ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی خط و کتابت کی صورت میں ان کا دستاویزی ثبوت بھی پیش کر دیا ہے۔

دستور جماعت میں آمریت کی واپسی

''جماعت اسلامی میں قیادت کا مقام'' کے عنوان سے مولانا مودودی کی جو تحریر بطور ضمیمہ شامل کی گئی ہے، قارئین اس کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم کے ذہن میں، جماعت کے اندر شورائیت کا تصور کیا تھا اور وہ نظم جماعت کو سمع وطاعت کے سانچے میں کس طرح ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ جبکہ اس کے بالکل برعکس، جناب سعید ملک اور ان کے ہم خیال کچھ دیگر ارکان جماعت اپنی غلط فہمی کے باعث جماعت کو عصر حاضر کی ایک ترقی پسند اسلامی جمہوری تنظیم اور تحریک سمجھتے ہوئے، اس کی صفوں میں رہ کر اپنے اختلافات کا اظہار و اعلان کرنا، اپنا جمہوری حق سمجھتے تھے۔ اس طرح کی جملہ خوش فہمیوں یا غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لیے جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے ۲۶ مئی ۱۹۵۷ کو جماعت کا جو نیا دستور منظور کیا اس میں جماعت کے اندر اختلاف رائے کے اظہار کے تمام راستوں کو پوری احتیاط سے بند کر دیا گیا۔ (دیکھیے دستور جماعت اسلامی دفعہ۔ ۹۳، ۹۷)۔

جماعت اسلامی کے دستور میں ''امیر کی آمریت'' کے سموئے جانے کا صحیح اندازہ تو جماعت کے دوسرے منسوخ شدہ دستور اور موجودہ دستور کا تقابلی مطالعہ کرنے والے ہی لگا سکتے ہیں۔ ہم صرف دونوں دساتیر میں امیر اور شوریٰ کے تعلق اور جماعت میں امیر کی حیثیت کے بارے میں کیے جانے والے بنیادی تغیرات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔

۱۹۵۲ میں مجلس ترتیب دستور کے تیار کردہ دستور کی دفعہ ۲۲ (۱) میں اختیارات کے عنوان کے تحت امیر کو صرف ''جماعت کے جملہ انتظامی معاملات کی انجام دہی'' کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا اور فرائض کے عنوان کے تحت دفعہ ۲۱ (۳) میں ''ہمیشہ اپنی مجلس شوریٰ کے مشورے سے کام'' کرنے کا پابند کیا گیا تھا۔ شوریٰ کی اس بالا دستی کو مزید موکد کرنے کے لیے شوریٰ کے اختیارات کی دفعہ ۳۴ کی ذیلی شق (۱) کے الفاظ یہ تھے ''امیر جماعت کسی اہم جماعتی معاملے کا فیصلہ اس کے مشورے کے بغیر نہیں کر سکتا۔''

اس کے بالکل برعکس موجودہ دستور کی دفعہ۔ ۱۹ (۱) میں امیر کے فرائض اور اختیارات کے عنوان کے تحت یہ الفاظ درج کیے گئے ہیں ''نظم جماعت اور تحریک کو چلانے کی آخری ذمہ داری امیر جماعت پر ہوگی اور وہ مجلس شوریٰ اور ارکان جماعت کے سامنے جواب دہ ہوگا۔'' اس دستور کی دفعہ ۳۰ (۲) کی ذیلی شق (۱) کے تحت شوریٰ کو جماعت کا ''پالیسی ساز ادارہ'' قرار دیا گیا۔ جماعتی فیصلوں میں اس کے مشاورتی کردار کو مزید کمزور

کرنے کرنے کے لیے ایک نامزد مجلس عاملہ قائم کی گئی جسے بیک قلم شوریٰ کے تمام اختیارات عطا کر دیے گئے ہیں۔[ے] [دفعہ ۳۴(۲)]۔امیر کے اختیارات میں ''نظم جماعت'' کے ساتھ ''تحریک'' کو چلانے کی آخری ذمہ داری کا اضافہ کرکے اسے در حقیقت نظم جماعت سے آزاد ہو کر بہت سے کام کرنے کا اختیار بھی دے دیا گیا جس کے لیے وہ کسی کے سامنے جواب دہ بھی نہیں۔اس کی عملی مثال قریب کے زمانے میں اس وقت سامنے آئی جب اسلامک فرنٹ کے نام سے لڑے جانے والے انتخابات کے موقع پر جماعت کے سابقون الاولون میں شمار کیے جانے والے بعض بزرگوں نے روپے کے بے جا استعمال پر اعتراض کیا۔ قاضی حسین احمد نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا کہ اس الیکشن پر جماعت کے بیت المال سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا گیا، اس لیے جماعت کے لوگوں کو اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں۔

جناب سعید ملک کا جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ محض ایک جذباتی روپے کا اظہار نہ تھا۔ وہ جماعتی زندگی میں اپنے ذاتی تجربات اور سیاسی بصیرت کی روشنی میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان سے پہلے ہی مولانا مودودی کی منصوبہ بندی اور مستقبل کے جن عزائم کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہوئے تھے، مولانا امین احسن اصلاحی سمیت سانحہ ماچھی گوٹھ کے بعد الگ ہونے والے اکابرین جماعت اور مقامی سطح کے قائدین وارکان بھی ہر شے واضح ہونے کے بعد، انھیں نتائج تک پہنچے۔ ان سب لوگوں کا جماعت سے الگ ہونا بلاشبہ احیائے دین کی تحریک کا بہت بڑا نقصان تھا۔ لیکن جماعت میں ایک شخص کی آمرانہ پالیسی کو برداشت کرتے ہوئے ان فعال و متحرک اور فہیم و بصیر اور اپنے اپنے شعبے میں علمی صلاحیتوں کے حامل افراد کا عضو معطل بن کر جماعت سے جڑے رہنا بھی انسانی نفسیات کی روشنی میں ممکن نہ تھا۔

اس نقصان کا اندازہ محض جناب سعید ملک کی اس زندگی سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے جماعت سے الگ ہونے کے بعد بسر کی۔ اگرچہ انھوں نے زندگی بھر جماعت کے بارے میں کبھی اپنی ناقدانہ رائے کو پبلک میں ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ صرف ایک بار پریس کانفرنس کے ذریعے اپنے استعفے اور اس کی وجوہ کا اعلان کرنے کے بعد، جیسے مرحوم نے اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا۔ لیکن راقم کا مشاہدہ یہ ہے کہ آخری عمر تک اپنے اس رویے کے باعث وہ ایک شدید نفسیاتی گھٹن کا شکار رہے۔ جب کبھی مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے بارے میں نج کی محفلوں میں انھیں اظہار خیال کا موقع ملتا تو ان کا لہجہ شدید تلخی لیے ہوئے ہوتا تھا۔ ایک ایسی تلخی جسے صرف سننے والا ہی محسوس کر سکتا ہے، جہاں تک ان کے الفاظ کا تعلق ہے، انھوں نے کبھی

شائستگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

جماعت سے الگ ہونے کے بعد انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اپنے کاروبار کے لیے واقف کر دیں۔ اس دوران میں ۱۹۶۲ میں قومی اسمبلی کے انتخاب میں شرکت کو بس ایک مختصر وقفہ ہی سمجھنا چاہیے۔ اجتماعی زندگی کی جدوجہد میں اس پہلی مایوسی کے باعث قوم ان کی صلاحیتوں اور خدمات سے محروم ہو گئی۔ ایک کامیاب کاروباری زندگی گزارنے کے بعد ۱۹۸۶ میں انھوں نے اپنے زندگی بھر کے مطالعے کے نتائج کو ''اسلام مسلمان اور دورِ حاضر'' کے عنوان سے ایک ضخیم تصنیف کی شکل میں مرتب کرنے کا آغاز کیا۔ اپنی وفات سے دو ہفتے پہلے وہ اس کی پہلی جلد کا مسودہ ہی مکمل کر پائے تھے،[۸] اور دوسری جلد کے لیے تفصیلی نوٹس ترتیب دے چکے تھے کہ ۲۶ اپریل ۱۹۹۳ کو اپنا کارنامہ حیات مکمل کر کے اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

جماعت کی سعی بے حاصل

دوسری طرف ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان کے بعد اختلاف رکھنے والوں کی علیحدگی کے نتیجے میں جماعت اسلامی بھی مولانا مودودی کی قیادت میں ان کی طے کردہ پالیسی اور لائحہ عمل پر کسی اندرونی کشمکش اور تنقید کے بغیر، آزادی سے کام کرتی رہی۔ ۱۹۵۶ کے ملکی دستور کے تحت، فروری ۱۹۵۹ کے متوقع عام انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کے لیے سید مودودی نے اگرچہ ۱۴ برس کی محنت شاقہ سے تیار ہونے والی اپنی قیمتی متاع[۹] کو تو قربان کر دیا مگر اکتوبر ۱۹۵۸ میں مارشل لا کے باعث اس انتخابی معرکے میں شریک ہونے کا موقع انھیں نہ مل سکا۔ ۱۹۷۰ میں، جب کہیں زیادہ وسائل اور تیاری کے ساتھ جماعت نے ان کی قیادت میں ملک کے پہلے عام انتخابات میں حصہ لیا تو ۱۹۵۷-۵۸ میں جماعت چھوڑنے والوں کے خدشات حقیقت کا روپ دھار کر روزِ روشن کی طرح سامنے آ گئے۔ آج بلا خوف تردید یہ کہنا ممکن ہے کہ اگر اسلام کے اصول شورائیت اور اس کی روشنی میں بنائے گئے دستور جماعت پر عمل پیرا رہتے ہوئے مولانا مودودی اپنی مجلس شوریٰ کی اجتماعی رائے کے مقابلے میں اپنی پالیسی اور پروگرام پر اصرار نہ کرتے اور اپنی شخصیت کی تلوار سے شورائیت کو بے دردی سے قتل نہ کرتے تو جماعت اسلامی کی طویل جدوجہد کم از کم انتخابی نتائج کے حوالے سے سعی بے حاصل ثابت نہ ہوتی۔

اس سے زیادہ افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ ۱۹۷۰ کے انتخابی نتائج کی روشنی میں مولانا مودودی کو اپنے ''اجتہاد'' کی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، لیکن اب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے تھے کہ جماعت کی پالیسیوں

کارخ موڑنا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔ انھوں نے فہم و بصیرت اور علم و عرفان کے حامل رجال کار کو جماعت سے نکالنے کے بعد دینی اعتبار سے صرف اپنی دینی تصانیف کی سند فضیلت رکھنے والی جو نیم خواندہ قیادت اپنے گرد اکٹھی کی تھی، اس موقع پر وہ اسے بھی اپنی رائے کا قائل نہ کر سکے، البتہ جب تک زندہ رہے اجمالی اشارے کرتے رہے۔ غالباً اپنی رائے کا برملا اظہار کر کے وہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی تنظیم کو انتشار سے دوچار کرنے کا خطرہ مول نہ لینا چاہتے تھے۔ جماعت کی قیادت اب تک ۱۹۵۱ تک مولانا مرحوم کے اختیار کردہ چار نکاتی لائحہ عمل کو سینے سے لگائے ہوئے ہے، جس کا چوتھا نکتہ ''نظام حکومت کی اصلاح'' اسے انتخابات میں حصہ لینے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ جماعت کی مجلس شوریٰ اس لائحہ عمل پر نظر ثانی کا پورا اختیار رکھتی ہے، مگر انتخابی سیاست کی سعی بے حاصل کسی سرور انگیز نشے کی طرح قیادت کے عقل اور حواس دونوں پر ایسا غلبہ پا چکی ہے کہ وہ ہر عبرت ناک اور حوصلہ شکن انتخابی شکست کے بعد ناامیدی کے صحرا میں، امیدوں کے نئے سراب اور آرزوؤں کے نئے ہیولے فریب نظر کی تازہ تر رعنائیوں کے ساتھ نظروں کے سامنے موجود پاتی ہے، ورنہ بقول غالب دلوں کی اصل کیفیت تو یہ ہے کہ:

بس ہجوم ناامیدی، خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

صحیح راستہ کیا ہے؟

جماعت اسلامی کی مخلصانہ جدوجہد کے بے نتیجہ ہونے کی بنیاد اسی چار نکاتی لائحہ عمل نے فراہم کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ افکار و نظریات کی تطہیر سے لے کر اصلاح معاشرہ تک اور میدان سیاست میں انقلاب لا کر اسلامی ریاست کے قیام تک، سارے کام ایک عظیم قائد کی قیادت میں ہمہ گیر صفات کی حامل ایک اسلامی جماعت انجام دے گی۔ اس کے لیے سارا اولولہ محمد رسول اللہ کے کارنامہ رسالت اور آپ کے صحابہ کی عظیم المرتبت جماعت کی جدوجہد سے اخذ کیا گیا ہے۔ حالانکہ جزیرہ نمائے عرب میں ۲۳ برس کی مختصر مدت میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست، دراصل اللہ تعالیٰ کے اس منصوبے کا نکتہ عروج تھی جس کی حنابندی فطرت کے جملہ عناصر، اس وقت سے کر رہے تھے، جب ابراہیم علیہ السلام اور ان کے عالی مقام فرزند اسماعیل علیہ السلام نے، اللہ کے حکم سے، اس ''وادی غیر ذی زرع'' کو اپنا مقام و مستقر بنایا تھا جسے دنیا ام القریٰ۔۔۔۔۔۔ مکہ مکرمہ۔۔۔۔۔۔۔۔ کے نام سے جانتی ہے۔

ختم نبوت کے عقیدے کا ایک لازمی نتیجہ اور حاصل یہ بھی ہے کہ اب قیامت تک کوئی انسان نہ ایسی جدوجہد کرسکے گا اور نہ اس کے نتیجے میں چشم فلک دوبارہ اس نظارے کو دیکھ سکے گی جس کا مشاہدہ اس نے ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں کیا تھا۔ اب اس امت کے مصلحین و مجددین کے مقدر میں قیامت تک اس آئیڈیل اور اس نمونے کا اتباع کرتے ہوئے، اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق جزوی جدوجہد کرنا ہی لکھا جا چکا ہے۔ کتاب و سنت کی پیروی کا مطلب صرف پیروی، اتباع اور اطاعت ہے، مقام رسالت پر فائز ہونا اور شرف صحابیت سے مشرف ہونا نہیں ہے۔ یہ رتبہ بلند تاریخ انسانی میں ایک بار جن کو ملنا تھا مل چکا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانیت کے لیے اتمام نعمت کے بعد اب قیامت تک کے لیے کسی ''مجدد کامل'' کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ قرآن میں اس کے بن جانے کے لیے کوئی اشارہ تک موجود ہے۔ اب اس امت کی اصلاح اور اقامت دین کا طریقہ صرف یہی ہے کہ اس امت کے رجال دین، علمائے کرام، مصلحین، انذار و تبشیر کا فریضہ انجام[۱۲] دیں کیونکہ قرآن نے ان کے لیے یہی کردار طے کر دیا ہے۔ ان کی دعوت سے متاثر ہونے والے عامتہ المسلمین اور خواص، اپنے اپنے شعبہ زندگی میں، اپنے اپنے دائرہ کار میں، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو اپنے لیے رہبر اور رہنما تسلیم کرکے، اس کی پیروی کریں۔ اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کا اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں۔ انسانی عقل نے معاشرتی زندگی کو تقسیم کار کے جس اصول کی روشنی میں منظّم کیا، اس کا تقاضا بھی اسی ترتیب کو اختیار کرنے سے پورا ہوتا ہے۔ مغرب کی سیکولر تہذیب کے فکری و سیاسی غلبے کے اس زمانے میں جماعت اسلامی، اخوان المسلمین اور اسی قبیل کی دوسری چھوٹی بڑی جماعتوں اور تحریکوں نے دنیا بھر میں جمہوریت کے سراب سے دھوکا کھا کر اقتدار کے حصول کے لیے پچھلے پچاس برس میں جو جدوجہد کی ہے، اور جو قربانیاں دی ہیں، ان کے نتائج ایک روشن دن کے چمکتے ہوئے سورج کی طرح اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ:

کار خود کن، کار بیگانہ مکن
بر زمین دیگراں، خانہ مکن

ان تحریکوں نے ہر جگہ متوسط طبقے کے ایک قلیل حصے کو اپنا ہم نوا بنا کر اپنی اپنی قوم کے بالادست طبقات کے خلاف سیاسی جنگ کا آغاز کیا۔ اس حکمت عملی سے درحقیقت احیائے دین اور نفاذ دین کی منزل کی طرف سفر کی راہ کھوئی ہوئی ہے۔ اس غلط حکمت عملی کے باعث تبدیلی کو ممکن بنانے والے بالادست طبقات نے دین کی

دعوت کو اپنا حریف سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ سب سے زیادہ اس دعوت کے مخاطب بنائے جانے کے مستحق تھے، اور ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن خطاب اور عمر بن ہشام (ابو جہل) جیسے سرداران قریش کے قبول اسلام کے لیے اسی لیے خصوصی دعائیں کی تھیں کہ وہ اس معاشرے کی بالادست، بااثر اور قائدانہ حیثیت کی حامل شخصیات تھیں۔ ان میں سے جس شخصیت نے اسلام قبول کیا اس نے دوسرے خلیفہ راشد کی حیثیت سے اسلام کے نظام کی وہ صورت گری کی کہ قیامت تک کے لیے نمونہ اور مثال بن گئی۔ اپنی ساری عظمتوں اور فضیلتوں کے باوصف بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی یا کسی غلام یا کسی غیر قریشی قبیلے کے فرد کو سیادت و قیادت کے منصب کا اہل نہیں سمجھا گیا، کیوں کہ ان کا تعلق اس معاشرے کی اشرافیہ سے نہیں تھا، جسے سیاسی عصبیت حاصل ہوتی ہے۔

جمہوریت اور طبقاتی کشمکش جیسے جدید عصری نظریات سے متاثر ہونے والوں کو مکہ اور مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور طریق حکومت دونوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ جب نبی اکرم کی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں آپ کی سیاسی جانشینی کا سوال بار بار سامنے آنے لگا تو آپ نے دین کی نصرت کے لیے انصار مدینہ کی تمام تر قربانیوں اور خدمات کے باوجود نہایت واضح لفظوں میں متعدد مواقع پر اس بات کی وضاحت فرمادی کہ آپ کا سیاسی جانشین آپ کے قبیلے قریش میں سے ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کے قبائل صدیوں سے قریش کی قیادت و سیادت کو تسلیم کرتے چلے آرہے تھے جبکہ انصار مدینہ یا کسی اور غیر قریشی قبیلے کو اپنے تمام تر تقویٰ وتدین کے باوجود یہ مقام ومرتبہ حاصل نہیں تھا۔ آج بھی درست راستہ یہی ہے کہ رجال دین قوم کے بالا دست طبقات کو قوم کا حصہ سمجھتے ہوئے، ان کے علمی معیار کے مطابق اور ان کی تعلیمی زبان [انگریزی] میں، انھیں ان کے دینی فرائض یاد دلائیں۔ انتخابی سیاست کو ترک کرکے انھیں اس خوف سے نجات دلائیں کہ وہ ان کے سیاسی حریف ہیں اور ان سے اقتدار چھیننا چاہتے ہیں۔ پر امن تبدیلی، اصلاح اور انقلاب کا جو راستہ قرآن نے بتایا ہے اور جس پر امت کے مصلحین صدیوں تک عمل کرتے رہے ہیں، صرف اور صرف یہی ہے۔

حواشی

ا۔ جناب سعید ملک کی نجی زندگی اور خاندان کے بارے میں جملہ معلومات ان کے صاحبزادے جناب شاہد

ملک نے فراہم کی ہیں، جن کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت راولپنڈی میں ملک صاحب کی رہائش مکان نمبر ۵۵۵۔بی نیا محلہ میں تھی۔ جناب عبدالجبار غازی بھی ان کے پڑوس میں رہتے تھے۔ لاہور منتقل ہونے کے بعد وہ تقریباً ڈیڑھ برس تک ۵۔اے ذیلدار پارک کی بالائی منزل میں مقیم رہے، اس کے بعد شاہ عالمی میں تاج ہوٹل کی بالائی منزل پر منتقل ہوئے، جس کی نچلی منزل میں روزنامہ ''تسنیم'' کا دفتر تھا۔ [جناب شاہد ملک آج کل ڈیفنس لاہور میں مقیم ہیں۔]

۲۔ روداد جماعت اسلامی حصہ ششم ص۔۱۴۵ [اشاعت دوم ۱۹۷۱]

۳۔ میاں طفیل محمد [قیم جماعت اسلامی] کا جواب بعنوان '' ملک سعید احمد کے الزامات، اور انکشاف حقیقت '' ''ایشیا'' لاہور، ۱۷ جنوری ۱۹۵۷ ص۔۸ [یہ جواب ضمیمے میں دیکھیے۔]

۴۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب ۱۹۵۳ [ص۔۳، اردو ایڈیشن شائع کردہ حکومت پنجاب]

۵۔ مولانا مودودی نے خود اس تبدیلی کو اپنا ''اجتہاد'' قرار دیا ہے۔ فروری ۱۹۵۷ میں جماعت اسلامی کے اجتماع ارکان منعقدہ ماچھی گوٹھ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا ''چوتھی اور بڑی اہم تبدیلی، جسے دراصل تبدیلی کے بجائے اجتہاد کہنا زیادہ صحیح ہے، ہم نے اپنی پیش قدمی کے نقشے میں کی۔ اس کو تبدیلی کے بجائے اجتہاد کہنا اس لیے صحیح سمجھتا ہوں کہ ہمارے پاس ایسی کوئی سکیم پہلے سے بنی ہوئی نہ تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی کہ نظام باطل کے خلاف ہماری کشمکش کا نقطہ آغاز کیا ہوگا'' [تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۴۵۔ اشاعت سوم دسمبر ۱۹۶۶]

۶۔ میاں طفیل محمد [قیم جماعت اسلامی] کا مضمون ''ملک سعید احمد کے الزامات۔۔۔۔اور انکشاف حقیقت'' ''ایشیا'' لاہور ۱۷ جنوری ۱۹۵۷ ص۔۹ ذیلی عنوان: ملک سعید نے کتاب لکھی۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے مولانا مودودی کے نام اپنے خط میں جناب سعید ملک اور مرکز جماعت کے درمیان اس کشمکش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: میرے نزدیک آپ لوگوں نے ملک سعید کے ساتھ بھی سخت زیادتی کی ہے۔ ان کی غلطی اگر کوئی ہے، تو یہ کہ انھوں نے آپ کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کی''۔ [تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب از ڈاکٹر اسرار احمد ص: ۲۰۲]

۷۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے جماعت سے علیحدگی کی وجوہات پر مشتمل مراسلے میں جماعت کے نئے دستور اور مجلس عاملہ کے نئے ادارے کے بارے میں درج ذیل بلیغ تبصرہ کیا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں: ''اس نئے دستور کو کوئی سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو مگر میں سمجھتا ہوں۔ اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ [مجلس شوریٰ کے] سارے اختیارات مجلس عاملہ کو حاصل اور مجلس عاملہ امیر کی جیب میں ہے۔'' بطور امیر مولانا مودودی کی ذات، نظریے اور نئی پالیسی کے بارے میں مولانا اصلاحی نے لکھا: ''میں نہ تو انقلاب قیادت کے نعرے کو اسلامی

انقلاب کا ذریعہ سمجھتا ہوں اور نہ ووٹ حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ کو اصلاح معاشرہ کا واسطہ۔ جماعت کا موجودہ دستور میرے نزدیک نہ شورائی ہے نہ جمہوری۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے امیر جماعت کے نہ عدل پر بھروسہ ہے نہ ان کی تنہا بصیرت پر، نہ دستور جماعت کے ساتھ ان کی وفاداری پر"[ہفت روزہ "ندا" لاہور ۱۴ مارچ ۱۹۸۹ ص۔ ۳۱،۳۳]

۸۔ "اسلام مسلمان اور دور حاضر" کی پہلی جلد (۹۴۰ صفحات) جناب سعید ملک کی وفات کے بعد دارالتذکیر نے شائع کی۔ دوسری جلد کے مفصل نوٹس کسی فرہاد کے انتظار میں فائلوں میں بند پڑے ہیں۔

۹۔ مولانا مودودی کی دعوت سے متاثر ہو کر علمائے دین اور جدید تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے والے جو فعال اور فہیم افراد جماعت میں شامل ہوئے اور جو مرکز سے لے کر ضلعی سطح تک جماعت میں قائدانہ حیثیت رکھتے تھے، ان کی عظیم اکثریت مولانا مودودی کے پیش کردہ، اجتہادی لائحہ عمل کے معکوس نتائج سامنے آنے کے باوجود اس پر مولانا مرحوم کے حیران کن حد تک آمرانہ اصرار کے باعث جماعت سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئی۔ ان میں سے چند نمایاں افراد کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی	جنھیں سیاسی اور علمی دونوں اعتبار سے جماعت میں مولانا مودودی کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ جماعت سے الگ ہو کر آپ نے اپنے استاذ مولانا حمید الدین فراہی کے اصول تفسیر کی روشنی میں "تدبر قرآن" کے نام سے اردو میں اپنی شاہکار تفسیر مکمل کر کے اس زمانے کی ضرورتوں کے مطابق تدبر قرآن کی شاہراہ، اہل بصیرت کے سامنے کہکشاں کی طرح روشن اور نمایاں کر دی۔
۲۔ مولانا عبدالجبار غازی مرحوم	قائم مقام امیر رہے۔ سعید ملک کی طرح حالات کا رخ دیکھ کر ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان سے پہلے ہی مستعفی ہو گئے۔ آپ ماہر تعلیم تھے۔ راولپنڈی میں "مدرسہ ملیہ اسلامیہ" کے نام سے ایک سکول قائم کیا جو ۱۹۷۲ میں قومیائے جانے کے باعث برباد ہو گیا۔
۳۔ مولانا عبدالغفار حسن	مرکز جماعت میں ناظم تربیت تھے۔ قائم مقام امیر رہے، مرکزی شوریٰ اور جائزہ کمیٹی کے رکن بھی تھے۔
۴۔ شیخ سلطان احمد	قائم مقام امیر رہے۔ جائزہ کمیٹی کے رکن تھے۔ اب بھی کراچی میں خاموشی سے دعوت و اصلاح کے کام میں مصروف ہیں۔
۵۔ مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم	شوریٰ کے رکن اور جائزہ کمیٹی کے کنویز تھے۔ فیصل آباد میں آپ نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ اشرف لیبارٹریز بھی آپ کی یادگار ہے۔
۶۔ چوہدری عبدالحمید	مرکزی شوریٰ کے رکن تھے۔

۷۔ سردار محمد اجمل لغاری	مرکزی شوریٰ کے رکن تھے۔ ماچھی گوٹھ کا اجتماع ان کی فیکٹری میں منعقد ہوا تھا۔
۸۔ مولانا افتخار احمد بلخی مرحوم	صاحب قلم عالم دین تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔
۹۔ ڈاکٹر اسرار احمد	اسلامی جمعیت طلبہ کے سابق ناظم اعلیٰ اور جماعت اسلامی ساہیوال کے امیر تھے۔ بعد میں مولانا مودودی سے کہیں بڑھ کر امیر کی آمریت کے علم بردار بن گئے اور اس آمریت کو بیعت کا نام دے کر جماعت اسلامی کی طرز پر تنظیم اسلامی قائم کی۔ اس کے تاحیات امیر ہیں، حضرت معاویہ کی سنت ملوکیت پر عمل کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین نامزد کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کے پالیسی اختلافات کے بارے میں دو کتابیں لکھ کر تاریخ کا قرض چکا دیا ہے۔ ۱۔ تحریک جماعت اسلامی ـــــ ایک تحقیقی مطالعہ ۲۔ جماعت اسلامی کا تاریخ کا ایک گمشدہ باب
۱۰۔ ارشاد احمد حقانی	اردو صحافت میں منفرد تجزیہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج قصور کے پرنسپل رہے۔ صدر فاروق لغاری اور نگران وزیر اعظم ملک معراج خالد کی کابینہ میں وزیر اطلاعات بھی رہے۔ آج کل روزنامہ ''جنگ'' کے ساتھ وابستہ ہیں۔
۱۱۔ مصطفیٰ صادق	جماعت اسلامی لاہور کے ہمہ وقتی کارکن تھے، اسی حیثیت میں روزنامہ تسنیم، کے ادارتی عملے میں شامل کیے گئے۔ اب روزنامہ وفاق کے مالک و مدیر ہیں۔ اخبار کے مالک و مدیر کی حیثیت سے تو انھیں کامیابی اور شہرت نہ مل سکی، البتہ پس پردہ سیاسی جوڑ توڑ اور پیغام رسانی کے ماہر ہیں۔ مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم کے ساتھ ان کے نائب کے طور پر اور ان کی وفات کے بعد تنہا، باہم متحارب اور ناراض سیاسی عناصر کے درمیان قومی تاریخ کے متعدد اہم اور نازک مواقع پر مذاکرات کار اور ثالث بالخیر کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ فوجی آمر ضیاء الحق کے بہت قریب تھے۔ ضیاالحق مرحوم کی آخری کابینہ میں شامل کیے گئے، جو ۱۹۸۵ کی اسمبلی اور وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی حکومت کو برطرف کرنے کے بعد وجود میں آئی تھی۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی کتاب ''جماعت اسلامی کی تاریخ کا ایک گمشدہ باب'' (ص۔۱۵۷) میں اس موقعے پر جماعت سے الگ ہونے والوں کا اندازہ سو (۱۰۰) کے لگ بھگ لگایا ہے۔ اگر '' جائزہ کمیٹی کی

رپورٹ ''کی طرح جماعت نے اس دور کا تنظیمی ریکارڈ بھی دریا برد نہ کردیا، تو شاید کوئی مؤرخ اس کی مدد سے مولانا مودودی کی ''اجتہادی غلطی'' کے فوری نقصان کا صحیح اندازہ لگا سکے۔

۱۰۔ روداد جماعت اسلامی حصہ ششم۔ص ۴۰۳ ''ہمارا لائحہ عمل'' [اشاعت دوم۔ ۱۹۷۱]

۱۱۔ اپنی کتاب ''تجدید احیائے دین'' میں (ص۔۱۴۹ ایڈیشن ۱۹۷۰) سید مودودی ''مجدد کامل کا مقام'' کے عنوان کے تحت رقم طراز ہیں :

''تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر ابن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے، مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا ''لیڈر'' پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام امام مہدی ہو گا جس کے بارے میں پیش گوئیاں نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔''

اگر سید مودودی اپنے چار نکاتی لائحہ عمل پر ''توازن'' کے ساتھ عمل کرکے پاکستان کے نظام حکومت کی اصلاح کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو یہ امت بلاشبہ انھیں مجدد کامل مان لیتی۔ لیکن وائے افسوس کہ جب ان کی عمر کا پیالہ لبریز ہوا، اور ان کی جد وجہد کے نتائج واضح ہو کر سامنے آگئے تو معلوم ہوا کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

۱۲۔ ۹ ہجری میں جب عرب کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے قبائل نے جوق در جوق اسلام قبول کر لیا تو سورہ توبہ کی آیت ۱۲۲ کے ذریعے انھیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنے کچھ لوگوں کو دین سیکھنے اور دین میں فہم و بصیرت حاصل کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینے بھیجیں تاکہ وہ واپس آکر ان کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے رہنمائی اور تربیت فراہم کر سکیں۔ اس قرآنی ہدایت کی روشنی میں مسجد نبوی میں پہلا دارالعلوم وجود میں آیا اور امت میں اس برگزیدہ گروہ کی بنیاد رکھی گئی جنھیں ہم رجال دین، علمائے دین اور صلحائے امت جیسے القابات سے پکارتے ہیں۔ اسی آیت میں ان کا فرض منصبی اور اس کا طریق کار بھی طے کر دیا گیا ہے۔ وہ پکارنے، بلانے،

اللہ کا پیغا م سنانے، اور اس کی نا فر مانی کے بر ے انجام کی خبر دینے والے بنائے گئے ہیں ۔ لو گوں کو سید ھا کر نا ، ان پر دین نا فذ کر نا ، ان سے ووٹ مانگنا ، قطعاً ان کے منصبی فر ائض میں شا مل نہیں ۔ بلکہ یہ سب کچھ ان کے اصل فر ائض کے لیے نقصان دہ ہے۔ ارشا د ربانی ہے:

اور دین میں تفقہ (فہم و بصیرت) حاصل کریں، اور تا کہ واپس جاکر اپنی قوم کو ڈرائیں ، شا ید یہ لوگ بر ی با توں سے بچیں۔'' [تر جمہ شبلی نعمانی۔ سیر ت النبی جلد دوم۔ باب : مذہبی انتظامات]

پاکستان کا مستقبل

سعید ملک

دیباچہ طبع اول

یہ کتاب آج سے ٹھیک ایک سال قبل لکھی گئی تھی۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اس کو جلد از جلد شائع کر دیا جائے لیکن گوناگوں اسباب کی وجہ سے اس میں مسلسل تاخیر ہوتی چلی گئی، تاآنکہ پورے ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس زمانے میں اگرچہ اس ملک میں متعدد اہم واقعات رونما ہوئے ہیں اور ہمارے قومی مزاج کے بعض پہلو مزید اجاگر ہوئے ہیں لیکن کوئی بات ایسی سامنے نہیں آئی، جس کی وجہ سے ہمیں اپنی کسی رائے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ بلکہ ان واقعات نے ہمارے اخذ کردہ نتائج اور آئندہ کے بارے میں ہمارے اندازوں کی مزید توثیق کر دی ہے۔ بالخصوص دستور کے متعلق ہم نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا اور چند ماہ بعد ہی اس کے نفاذ کے نتائج ـــــ بلکہ صحیح تر الفاظ میں فقدان نتائج ـــــ کے متعلق جو کچھ عرض کیا تھا اس کی صداقت بالکل واضح ہو گئی ہے اور واقعات نے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا تجزیہ بالکل صحیح تھا۔ ہم سمجھتے ہیں یہ عملی شہادت ناظرین کے لیے ہمارے فکر اور نقطہ نظر کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے میں مددگار ثابت ہو گئی۔

اس کتاب کی تیاری اور طباعت کے کام میں مجھے اپنے رفیق کار اور دوست ارشاد احمد صاحب کا پورا تعاون حاصل رہا ہے۔ فی الحقیقت ان کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت ایسی ہے کہ میں ان کے تعاون کو رسمی شکریے کی سطح سے بالاتر سمجھتا ہوں۔

سعید ملک

ایبٹ آباد

یکم اگست ۱۹۵۷ء

پیش لفظ

جس طرح ہر انسان فطری طور پر اپنے نظریات اور اقدار کے مطابق انفرادی دائرے میں ترقی کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے، اسی طرح ہر قوم نشو و نما پانے اور عزت و شرف کا مقام حاصل کرنے کی متمنی ہوتی ہے۔ انسانی فطرت کے اسی تقاضے کے مطابق پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد اول روز سے ہی ہم اپنے دلوں میں ایک باوقار و باعظمت اور خوش حال و ترقی یافتہ قوم بننے کی آرزوئیں پال رہے ہیں۔ یہ آرزوئیں چاہے جس قدر بھی مقدس ار قابل قدر ہوں، ان کے پورا ہونے کا امکان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم اپنے اندر ابھرنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے تاریخ کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں، بلکہ موجود الوقت اقوام کے حالات کے ایک سرسری جائزے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض اقوام کو تو اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے کا موقع میسر آرہا ہے لیکن بہت سی دوسری اقوام حسرت و یاس کے جہنم میں ہی پڑی ہوئی ہیں۔ تاریخ کے اسٹیج پر قوموں نے عروج و زوال اور ترقی و تنزل کے اس ڈرامے کو اس کثرت سے دہرایا ہے کہ قوموں کے ابھرنے اور گرنے کے سلسلے میں بعض ایسے اصول مرتب ہو چکے ہیں، جن کی کارفرمائی ہر قوم کی زندگی میں یکساں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ آج کل فلسفہ تاریخ کے نام سے ان اصولوں کو مرتب کرنے کے لیے بہت زیادہ تحقیق و مطالعہ کیا جارہا ہے اس شعبہ علم پر مغربی ماہرین تاریخ و عمرانیات کی توجہات مغرب میں پائے جانے والے اس احساس کی وجہ سے بھی خاص طور پر مرکوز ہیں کہ یورپی تہذیب اپنے انتہائی نکتہ عروج کو پہنچ کر اپنے سفرِ انحطاط کا آغاز کر چکی ہے۔ اس اندیشے کے تحت بہت سے مفکرین قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کے اسباب کا کھوج لگانے میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسی طرح مشرقی اقوام بھی جن میں صدیوں کی خواب غفلت کے بعد اب بیداری کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں، اجتماعی ترقی کے اسباب و علل کی جستجو میں منہمک ہیں۔ اگرچہ مشرق میں اس جدت فکر کا ثبوت پیش نہیں کیا جارہا،

جو علمی ترقی اور ذہنی ارتقاء کی وجہ سے مغربی محققین کے حصے میں آئی ہے لیکن بہر حال مشرقی اقوام میں بھی اپنی فکری و علمی سطح کے مطابق ذہنی کاوش شروع ہو چکی ہے۔

اگرچہ علم النفسیات کی جدید ترین تحقیقات نے شعور، لاشعور اور تحت الشعور کے باہمی تعلق کی الجھنوں میں پڑ کر انسانی عقل و خرد اور ارادہ و اختیار کی اہمیت کو بہت گرا دیا ہے، لیکن اس کے باوجود علم تاریخ و عمرانیات میں قوموں کے اجتماعی شعور و ارادہ اور تصورات و نظریات کی اہمیت سے ابھی تک انکار نہیں کیا جا سکا اور آج بھی اس بات پر قریب قریب اتفاق پایا جاتا ہے اور جمہوری تصورات نے اس کو مزید تقویت دے دی ہے کہ ہر معاشرہ ان نظریات و تصورات سے رنگ پکڑتا ہے جنہیں اس کے اندر درجہ قبولیت حاصل ہو اور فلسفیانہ اور نفسیاتی موشگافیوں سے قطع نظر یہ بات مشاہدے کے تحت ایک ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت اختیار کر گئی ہے کہ قوموں کا فکر ان کے طرز عمل کو متعین کرنے میں اہم ترین عامل کا درجہ رکھتا ہے۔

ہم اس کتاب میں اسی اصول کی روشنی میں پاکستان کے حالات کا جائزہ لے کر اس ملک کی ترقی و تعمیر کے امکانات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں قوموں کی ترقی و تعمیر کے لیے کسی اجتماعی فلسفہ یا نظام کا تصور پہلے زمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ضروری ہو گیا ہے بعض دوسری قوموں اور نظاموں کی مثالیں دے کر ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ جب تک قوم شعوری اور عملی طور پر اجتماعی زندگی کے اصولوں کے کسی ضابطے کو اپنا نہ لے گی، اس وقت تک قومی تعمیر و ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ تعمیر و ترقی کے کسی منصوبے کو چاہے وہ زندگی کے سارے پہلوؤں کو محیط ہو یا اس کا دائرہ اثر محدود ہو، عمل کا جامہ پہننے کا ایک فطری طریق ہوتا ہے اور اس سے انحراف کرنے پر مطلوبہ نتائج بر آمد نہیں ہو سکتے۔ نیز قومی تعمیر و ترقی کے لیے اس وقت جن اقدامات پر تکیہ کیا جا رہا ہے ان کا بھی تجزیہ کر کے بتائیں گے کہ حصول مقصد کے لیے یہ اقدامات کس حد تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

قوم کی موجودہ حالت کا تعین کیے بغیر اس قسم کا کوئی جائزہ ممکن نہیں ہے۔ اس ضمن میں ہمیں دور غلامی کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ عرض کرنا ہو گا۔ ہمارے خیال میں ہمارا موجودہ سیاسی مزاج بہت بڑی حد تک ان حالات کی پیداوار ہے جو ہمیں دور غلامی میں پیش آئے۔ اور اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم گزشتہ ڈیڑھ دو سو سال کی تاریخ پر نظر ڈال کر آج کی حالت کا صحیح اندازہ لگائیں۔ اسی صورت میں اپنی کمزوریوں اور مطلوبہ تغیر کی وسعت کا کچھ تصور قائم کیا جا سکے گا۔

ہم نے اس کتاب میں نہ تو قوموں کے عروج و زوال کا کوئی جامع فلسفہ بیان کیا ہے اور نہ پاکستان کی تعمیر و ترقی کا کوئی تفصیلی خاکہ یا نقشہ پیش کیا ہے۔ در حقیقت اس میں ہم نے پاکستان کے حالات کا تجزیہ کر کے یہ تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ قوم میں تعمیر و ترقی کے کام کے لیے کس حد تک آمادگی اور صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس مقصد کی خاطر ہم نے وہ باتیں عرض کی ہیں جنہیں ہمیشہ سے بالخصوص دور حاضر میں، قومی تعمیر و ترقی کی شرائط و علامات کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس بات سے قطع نظر کہ ہم یہاں زندگی کا کون سا فلسفہ اختیار کرتے ہیں، ہم نے وہ کسوٹی پیش کر دی ہے جس پر پرکھ کر یہ تعین کیا جا سکتا ہے کہ بحالات موجودہ قوم کے کسی بھی نقشے پر ابھرنے کے کیا امکانات ہیں۔

ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ ہم نے قوم کی مجموعی حالت کو پیش نظر رکھا ہے اور کسی ایک جماعت، گروہ یا طبقے کو مخالفانہ تنقید کا ہدف نہیں بنایا۔ لیکن چونکہ ہم نے قوم کی اصلی حالت کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور محض خیالی و ہوائی باتیں نہیں کی ہیں اور نہ اجتماعی زندگی میں پائی جانے والی خرابیوں کی پردہ پوشی کی ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہماری بعض باتیں کسی خاص طبقے، گروہ یا جماعت کی حالت پر راست آ جائیں۔ اس لیے ہم ایسے عناصر سے پیشگی معذرت خواہ ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں محدود مصالح کو نظر انداز کر کے ہر معاملے میں وہی نقطہ نظر اختیار کیا ہے جو ہمارے نزدیک وسیع تر قومی مصالح کے لحاظ سے درست تھا اور جس کو سامنے لانا قوم کی موجودہ حالت کے پیش نظر اس وقت ہمارے نزدیک انتہائی ضروری تھا۔

حصہ اول

تاریخی پس منظر

اگرچہ معاشرتی اور سماجی حیثیت سے مسلمان ہمیشہ ہی کم و بیش اسلام کے زیر اثر رہے ہیں، لیکن خلافت راشدہ کے بعد حکومت واقتدار پر اسلام کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہوتی گئی۔ دور حاضر کی سائنسی ایجادات اور ریاست و حکومت کے ہمہ گیر تصور کے پیدا ہونے سے قبل چونکہ حکومت کا دائرہ کار بہت محدود ہوتا تھا اس لیے غیر اسلامی سیاست کے ساتھ زندگی کے معاشرتی پہلو میں اسلام کی کار فرمائی ایک حد تک ممکن تھی۔ لیکن عملاً مسلمانوں کی معاشرت اور سیاست میں یہ تضاد بھی چند صدیوں تک ہی چل سکا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا، سیاست زندگی کے سماجی پہلو کو بھی متاثر کرتی چلی گئی اور بالآخر مسلمانوں پر اسلام کی گرفت سماجی لحاظ سے بھی کمزور پڑ گئی۔

چونکہ اسلام کا یہ ہلکا سا رنگ بھی قرون وسطیٰ تک دوسری ہم عصر اقوام اور تہذیبوں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں بلندی فکر، ترقی و تعمیر اور طبعی عناصر کی تسخیر کی زیادہ بہتر صلاحتیں پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس لیے مغربی تہذیب کے نشوونما پانے تک مادی حیثیت سے مسلمان دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھائے رہے اور علم و فکر کے میدان میں بھی رہنمائی اور قیادت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں نے اسلام کو ہمیشہ جزوی طور پر ہی اپنایا ہے۔ اس کے جملہ اصولوں کو ایک نظام کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں کیا۔ اس کے برعکس یہ بھی واقعہ ہے کہ ذہنی سطح پر مسلمانوں نے اس تصور کو کبھی ترک نہیں کیا کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ زندگی ہے اور اسلام میں دین و سیاست کی علیحدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ فکر و عمل کے اس تضاد کے بہت سے پہلو ہیں اور ان کی وضاحت طویل مباحث کا تقاضا کرتی

ہے لیکن یہاں چونکہ اس پر تفصیل سے گفتگو نہیں کی جا سکتی، اس لیے ہم سرسری طور پر اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ فکری حیثیت سے اسلام کو ہمیشہ ایک مکمل نظام زندگی کا مقام دینے اور عملاً اس سے انحراف کرنے کے باعث مسلمانوں کے اندر کشمکش وتضاد کی جو کیفیت ہمیشہ رہی ہے۔ اس نے اس ملت کو دینی اور مادی دائروں میں بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

ہندوستان میں مغلوں کے دور تک پہنچتے پہنچتے مسلمانوں کی معاشرت پر اسلام کی گرفت بہت ڈھیلی ہو چکی تھی اور انہوں نے سماجی دائرے میں بھی غیر اسلام سے بہت سی مصالحتیں کیں۔ جن لوگوں نے اس ملک میں اسلام قبول کیا وہ ہندو تہذیب ——— جو اپنی قوت جذب کے لحاظ سے تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتی ہے ——— کے اثرات سے پوری طرح آزاد نہ ہو سکے اگرچہ اس دوران بعض نہایت ہی مضبوط اور اونچی شخصیتوں نے حکومت کی سرپرستی کے بغیر محض اپنی اولوالعزی اور بلند فکر و کردار کے ذریعے اسلام پھیلایا۔ اور انہی حضرات کی سعی وجہد سے مسلمانوں کی تعداد اس قدر بڑھی کہ وہ برصغیر میں ایک بڑی قوم کی حیثیت اختیار کر گئے۔ لیکن اقتدار کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام کی بنیاد پر اپنے الگ ملی تشخص کا کوئی ایسا واضح تصور یا شعور پیدا نہ ہو سکا جو ان میں ایک صحیح اسلامی معاشرے کی سی خصوصیات پیدا کر دیتا۔

انگریز اور اس کے اثرات

اسی اثناء میں مسلمانوں کی حکومت انتشار کی نذر ہو گئی اور ہندوستان کے سیاسی افق پر انگریز نمودار ہوا۔ اٹھارویں صدی کا یہ وہ دور تھا، جب کہ یورپ دنیا کی سیادت کے لیے اپنے اندر علمی ومادی خصوصیات پیدا کر رہا تھا اور فکر کے اعتبار سے وہ ایک ایسا ہمہ جہتی نظام مرتب کر رہا تھا، جسے وہ انسانیت کی فلاح کا ضامن اور انسانی عقل و خرد کی معراج تصور کرتا تھا انگریز نے ہندوستان پر صرف سیاسی تسلط ہی قائم نہ کیا بلکہ وہ ایک متعین نظام فکر اور تہذیبی قدروں کا ایک مکمل ضابطہ بھی اپنے ساتھ لایا۔ وہ اس قدر احمق تو نہ تھا کہ یہاں اس تہذیب کو اس کی ساری خصوصیات کے ساتھ برپا کرنے کی کوشش کرتا ——— اور نہ یہ ممکن تھا ——— البتہ اس نے یہ حکمت عملی ضرور اختیار کی کہ ہندوستان میں مغربی تہذیب کی ایک بگڑی ہوئی شکل کو اس طرح رائج کرے کہ اس سے ہندوستان میں بسنے والی دونوں بڑی قومیں اندرونی تضادات کا شکار ہو کر اپنی بقیہ صلاحیتیں اور قومی کردار کا رہا سہا رنگ بھی، جو کسی مرحلے پر انگریز کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتا تھا، کھو بیٹھیں۔ چنانچہ سیاسی حیثیت سے اپنے قدم جماتے ہی اس نے فکری وسماجی سطح پر پوری مستعدی کے ساتھ اس مہم کا آغاز کر دیا۔

برعظیم ہندو پاکستان پر انگریزی قبضے کے متعلق یہاں کی دو بڑی قوموں ـــــ ہندو اور مسلمان ـــــ کے رد عمل میں نمایاں تفاوت پایا جاتا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کے دور اقتدار میں ہندو کو مذہب کی مکمل آزادی تھی اور سماجی حیثیت سے مسلمان اور ہندو عوام ایک دوسرے سے بعد محسوس نہ کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ہندو سیاسی طور پر غلام تھے اور مسلمان حکمران۔ اس لیے ہندوستان پر انگریز تسلط کے قیام سے ہندو کے اندر اقتدار سے محرومی کے احساسات نہ پیدا ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں میں سیاسی شعور کی بھی بہت کمی تھی۔ مسلمانوں کی گزشتہ گیارہ صدیوں کی تاریخ، جس کا تذکرہ مسلمانوں کے لٹریچر کے علاوہ نماز جمعہ کے خطبات میں ناگزیر طور پر متواتر ہوتا رہتا تھا۔ مسلمان عوام کے اندر سیاسیات سے دلچسپی پیدا کر دینے کے لیے کافی تھی، لیکن ہندو گزشتہ ایک ہزار سال سے کوئی قومی تاریخ ہی نہ رکھتا تھا اور اس کے ہاں غلامی اور آزادی کی حالتوں کے فرق کا کوئی واضح تصور ہی موجود نہ تھا۔ اس نے اگر انگریزی قبضے کے خلاف کوئی جدوجہد کی تو وہ اس کے ذہن و قلب کی کسی ساخت یا شعور و احساس کی کسی خاص کیفیت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اس نے ایک بیرونی حملہ آور کی جارحیت کی اسی طرح مدافعت کی جس طرح ہر قوم، قبیلے یا علاقے کے عوام اپنے حکمرانوں کی اطاعت کرتے ہوئے ہر بیرونی حملہ آور کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔

لیکن مسلمانوں کی حیثیت اس سے بالکل مختلف تھی۔ وہ حکومت واقتدار سے محروم ہوئے تھے ان کے لیے انگریزی تسلط جہاں دنیوی نقطہ نظر سے ناقابل برداشت اور باعث ننگ و عار تھا وہیں وہ ایک غیر مسلم قوم کی غلامی کو اپنے دین کے لیے نہایت ہی خطرناک تصور کرتے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سے قبل مسلمانوں نے کبھی بھی کسی غیر مسلم قوم کی غلامی اختیار نہ کی تھی اور ہندوستان جیسی عظیم سلطنت کا تہ و بالا ہو جانا اور ایک عیسائی قوم کا مسلمانوں پر مسلط ہو جانا ان کی ملی غیرت اور دینی حمیت کے لیے ایک کھلا ہوا چیلنج تھا۔ چنانچہ مسلمان دین اور دنیا دونوں ہی کے نقطہ نظر سے انگریزی اقتدار سے سازگاری اختیار نہ کر سکے۔ انگریزی کی غلامی کے خلاف ان کی نفرت میں ان کے عقیدے اور دینی حس کو بہت بڑا دخل حاصل تھا۔ اور میدان جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد نئے حالات سے سازگاری اختیار کر لینا ان کے لیے اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک ان کا سیاسی حوصلہ بالکل پست اور دینی حمیت بالکل مردہ نہ ہو جائے۔

چونکہ انگریز نے ہندوستان کی تاریخ کو ایک خاص سیاسی زاویہ نگاہ سے مرتب کر کے یہاں رائج کیا تھا، اور ہماری قومی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو چھپانے کی بالارادہ کوشش کی تھی اس لیے اس بات سے عام لاعلمی

پائی جاتی ہے کہ اس برعظیم پر انگریزی قبضے کے وقت مسلمانوں میں ایک مضبوط تعلیم یافتہ طبقہ (INTELLIGENTSIA) پایا جاتا ہے تھا اور معاشرے پر اس کا بہت اثر تھا۔ ملک کے کونے کونے میں درس گاہوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ایک ایک صوبے اور ریاست میں ہزاروں علماء رات دن درس وتدریس کے کام میں منہمک رہتے تھے۔ اگرچہ بعض درسگاہوں کے اخراجات کا بار سرکاری خزانے بھی برداشت کرتے تھے لیکن عام طور پر تعلیم گاہ کے ساتھ بڑے بڑے اوقاف ہوتے تھے۔ مسلمان امراء اور عوام فراخ دلی کے ساتھ اپنی جائدادیں تعلیم گاہوں کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ اور مسلمان نوابوں نے جو معافیاں مسلمانوں کو تعلیم کے لیے دی تھیں بقول مسٹر جیمس گرانٹ ''ان کا تخمینہ صوبہ بنگال کے رقبہ کے چوتھائی سے کم نہ تھا''۔ مسلمانوں کے صاحب دماغ طبقہ نے جو ہر قوم کے ذہن و شعور کا معمار ہوا کرتا ہے، انگریزی حکومت کو بالاتفاق مسلمانوں کے دین اور دنیا کے لیے مہلک قرار دیا۔ غلامی کے خلاف مسلمانوں کے احساسات کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں کچلنے کے لیے غیر ملکی حکومت کو ڈیڑھ صدی تک ظلم و ستم اور عیاری و تفرقہ انگیزی کے تمام ہتھیار استعمال کرنے پڑے۔

انگریزی اقتدار کے متعلق مسلمانوں اور ہندوؤں کے احساسات و جذبات اور نفسیاتی کیفیات کا یہ تفاوت انگریز سے مخفی نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے دور اقتدار کے اول روز ہی سے دونوں قوموں کے معاملے میں الگ الگ پالیسی اختیار کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندو پہلے معیشت اور پھر سیاست کے میدان میں بہت جلد انگریز کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے پر آمادہ ہو گیا، اور اس نے اٹھارویں صدی کے اخیر سے ہی مغربی تعلیم کو اپنانے کا آغاز کر دیا۔ انیسویں صدی کے نصف اول کے اختتام سے قبل انگریزی علاقوں میں متعدد ہندو کالج قائم ہو چکے تھے جن میں ہندو ہی تعلیم پاتے تھے۔ ہندو عوام جنگوں میں تو انگریزوں کے خلاف نوابوں اور راجوں مہاراجوں کا ساتھ دیتے تھے مگر کسی علاقے پر انگریزی قبضے کے بعد جلد ہی حالات سے سازگاری اختیار کر لیتے تھے لیکن مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ اگرچہ اوپر کے سیاسی حلقوں میں تو غداری کی متعدد مثالیں ملتی ہیں لیکن مسلمان عوام اور ان کا تعلیم یافتہ طبقہ غیر ملکی اقتدار کی مخالفت پر کمربستہ اور انگریز کی غلامی کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار پھینکنے کے لیے بے چین تھا۔ چنانچہ غیر ملکی حکومت نے یہ طے کر لیا کہ مسلمانوں کو تعلیم و معاشرت، سیاست، معیشت اور تجارت و صنعت کے دائروں میں ایک پس ماندہ قوم کی سطح پر لا کھڑا کیا جائے۔ اس پالیسی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ مسلمانوں کی تعلیم گاہوں سے وابستہ اوقاف کو ضبط کر لیا

گیااور انہیں فوج، سول سروس اور تجارت کے میدان سے بتدریج بے دخل کیا جانے لگا۔ عربی اور فارسی کی بجائے ہندی اور سنسکرت اور انگریزی کو رواج دینے کا کام کم از کم شہروں میں کافی حد تک آگے بڑھ چکا تھا۔ مسلمانوں کا اس نئے نظام تعلیم سے الگ رہنا ایک قدرتی سا امر تھا۔ نیز مسلمانوں کو عدلیہ کی ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا اور قاضیوں کو جو قانون شریعت کے مطابق فیصلے کرتے تھے، ان کے مناصب سے علیحدہ کر دیا گیا اور ان کی جگہ بڑی آسامیوں پر انگریزوں کو اور ماتحت مناصب پر ہندو کو مقرر کیا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر اپنی مشہور کتاب ''مسلمانان ہند'' میں لکھتا ہے:

''اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی گئی کہ سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوں، ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے ——''

مسلمانوں کی حالت اب یہ ہے کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی انہیں سرکاری اعلانات کے ذریعے خاص احتیاطوں کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔

۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل ہی سے کوئی دفتر ایسا ہو گا، جس میں بجز چپڑاسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمانوں کو کوئی اور نوکری مل سکے''۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل، مصنف سید طفیل احمد۔ ص ۱۷۲۔۱۷۱)

تجارت و صنعت کے دائرے میں ایک طرف تو غیر ملکی حکمرانوں نے ملک کو بحیثیت مجموعی خوب لوٹا اور تاراج کیا، اور دوسری طرف انہوں نے اس پالیسی پر عمل کیا کہ جن دائروں میں ہندوستانیوں کے وجود کو برداشت کیا جائے، ان میں سے مسلمانوں کو خارج کر کے ہندوؤں کو اہمیت دی جائے۔ چنانچہ بنگال میں زراعت کے شعبے میں مسلمان زمینداروں کو بے دخل کر کے اس پر ہندو بنیوں کو مسلط کر دیا گیا، س اور مسلمان کاشتکاروں پر مظالم ڈھانے کے لیے ان بنیوں کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا، اسی طرح تجارت کے شعبے میں انگریز نے لوٹ کھسوٹ کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس میں بھی مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوہی کو آگے بڑھایا گیا۔ صنعت و حرفت کے دائرے میں بھی مسلمان کو ایسے ایسے مظالم کا نشانہ بنایا گیا جن کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ خصوصاً ڈھاکے اور دکن کی صنعتوں کو جس طرح تباہ کیا گیا، اس سے انگریز کی بہیمیت کی بدترین مثال فراہم ہوتی ہے۔

احیائے دین اور حصول آزادی کی منظّم کوشش

سیاست کے میدان میں ۱۸۶۷ء تک مسلمان قوم نے بحیثیت مجموعی انگریزی اقتدار کی پوری مخالفت کی اور غیر ملکی حکومت نے بھی مسلمانوں کے جذبہ آزادی کو کچلنے میں کوئی وقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ مسلمان عوام نے علما کی رائے کے مطابق انگریزی تعلیم حاصل کرنے، غیر ملکی اقتدار کی ملازمت اختیار کرنے، ان کے طرز تمدن اور انداز بود و ماند کو اپنانے سے کلیتاً احتراز کیا۔ یہی نہیں بلکہ تبلیغ و تعلیم کے ذریعے اس کافرانہ اقتدار کو ختم کرنے کی تلقین کھلے بندوں کی جاتی رہی۔ چنانچہ انگریز کو مسلمانوں کے اس مخالفانہ طرز عمل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک صدی تک متواتر چوکنا رہنا پڑا اور ظلم و ستم کی کوئی شکل نہ تھی جس کا اس دوران میں مسلمانوں کو تختۂ مشق نہ بنایا گیا ہو۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، مسلمانوں کے صاحب دماغ طبقہ نے اقتدار سے محرومی کو مسلمانوں کی دینی اور سیاسی زندگی کے لیے مہلک قرار دیتے ہوئے حصول آزادی کی جدوجہد کو نہایت ضروری ہی نہیں بلکہ دینی فریضہ قرار دیا تھا۔ یہ جدوجہد انفرادی اور غیر منظّم طور پر بھی کی جاتی رہی اور منظّم طریق پر بھی۔ انفرادی اور غیر منظّم جدوجہد کی یہ شکل تھی کہ مسلمانوں کے شہر شہر اور قریے قریے میں دینی رہنماؤں نے مسلمانوں کے اندر اس تصور کو زندہ رکھنے کی کوشش کی کہ غیروں کی غلامی مسلمانوں کے لیے باعث ننگ ہے اور دوسروں کی اقدار اور نظریات کو اپنانا ملت کے لیے نہایت ہی ضرر رساں ہے۔ منظّم جدوجہد کی سب سے اہم مثال سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک تھی۔ ان بزرگوں نے شمال مغربی ہندوستان میں سکھوں کے غلبے اور ملک کے جنوبی اور مشرقی خطوں میں انگریز کے بڑھتے ہوئے اثر و قوت کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کا عزم کیا۔ اگرچہ ترتیب کار کے لحاظ سے جدوجہد آزادی کا آغاز سکھوں کے ساتھ جنگ سے کیا گیا اور انگریز کے ساتھ براہ راست ٹکراؤ کی نوبت ہی نہ آئی۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس تحریک نے تھوڑے ہی عرصے میں اسلام کو برپا کرنے اور مسلمانوں کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرانے کے حق میں شمال مغربی سرحد سے لے کر بنگال تک کی مسلمان آبادی میں ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیا جو اس زمانے کے وسائل نقل و حمل اور ذرائع نشر و اشاعت کے نقطہ نظر سے واقعتہً حیرت انگیز ہے۔ اگرچہ حادثہ بالاکوٹ کے نتیجے میں فوجی سطح پر جدوجہد کا خاتمہ ہو گیا اور تنظیمی پہلو بھی کمزور پڑ گیا، لیکن اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس تحریک کے وابستگان اور متاثرین نے ہندوستان کے طول و عرض میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور غیروں کے تسلط سے

نجات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس سعی و جہد کی پاداش میں ان لوگوں نے پھانسیوں کی سزائیں بھی پائیں اور قید و بند کی نہایت ہی دردناک صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ انگریزی حکومت نے سب سے پہلے انہی حضرات کو عبور دریائے شور کی سزائیں دیں اور جزائر انڈیمن میں بھیجا۔ یہ ایک ناقابل تردید واقعہ ہے کہ انیسویں صدی میں تنہا انہی لوگوں نے ہندوستان میں جدوجہد آزادی کی شمع کو روشن رکھا اور ہندو قوم نے اس زمانے میں محض تماشائی کی حیثیت اختیار کئے رکھی۔

مسلمانوں میں انگریز پرست قیادت کا ظہور

اس دوران میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی (جسے انگریز مورخین نے غدر کا نام دیا) کی ناکامی اور اس سے پیدا شدہ مایوسی کے نتیجے میں مسلمانوں میں ایک اور نقطہ نظر کے حامیوں نے سر اٹھایا۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ چونکہ انگریز کے تسلط کو ختم کرنا اب ناممکن ہے، اس لیے اپنی قوتوں کو اس کام میں کھپانا بے سود ہے اور اس سے مسلمان قوم انگریز کے جبر و قہر کا نشانہ بنتے بنتے تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ اس مکتب فکر کے سربراہوں نے ——— جن کی قیادت سر سید احمد خاں کر رہے تھے ——— نہ صرف محکومی پر قناعت کرنے بلکہ "موجودہ حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے" کا فلسفہ پیش کر ڈالا۔ اس مقصد کے لیے یہ حضرات ایک طرف انگریز کی خوشنودی حاصل کرنے اور ایوان حکومت میں ترقی درجات کے لیے کوشش کرنے لگے اور دوسری طرف مسلمانوں کو مغربی تعلیم و تمدن کو اپنانے کی ترغیب دینے لگے۔

اس گروہ کے ذہن میں مسلمانوں کی ملی فلاح و بہبود اور استقلال کا سرے سے کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ ان کے پیش نظر سب عاجلہ اور وقتی مصالح تھے۔ سر سید احمد خان نے نہایت ہی محدود نقطہ نظر سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پیدا شدہ صورت حال کا جائزہ لیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو مغربی تعلیم و تمدن کو اپنانے میں پیش پیش ہونے اور ہندوستان کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرنے کی جدوجہد میں سرگرمی سے حصہ نہ لینے کی وجہ سے حکمرانوں کی نگاہوں میں مسلمانوں سے زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ تجارت و سیاست میں مسلمانوں سے آگے بڑھ چکا ہے۔ اس کے برعکس انگریز مسلمانوں سے نفرت کرتا ہے اور انہیں اپنی بے پناہ قوت و حکمت سے کام لے کر پیستا چلا جا رہا ہے۔ اس تجزیے کی بنیاد پر سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے لیے ترقی و تعمیر کا جو پروگرام وضع کیا وہ ذلت و مسکنت اور غلامی و رسوائی پر قناعت اختیار کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس میں کوئی ایسے نظریات نہ پائے جاتے تھے جن کی روشنی میں مخالفانہ قوتوں کا اندازہ اور اپنی کمزوریوں کا تخمینہ

لگایا جا سکتا اور جس سے اپنے اندر مقابلے اور مزاحمت کی زیادہ سے زیادہ استعداد پیدا کرنے اور کوئی مثبت قومی و ملی پالیسی اختیار کرنے کی راہ نکل آتی۔ سر سید نے واضح طور پر اس بات کی تبلیغ کی اور اس مقصد کی خاطر علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی کہ مسلمان ایک طرف انگریز کو اپنی وفاداری اور فرماں برداری کا پوری طرح یقین دلائیں اور دوسری طرف ان کے تمدن کو زیادہ سے زیادہ اپنانے کی کوشش کریں۔ موخر الذکر مقصد کی خاطر سر سید نے مسلمان نوجوانوں کو آداب مجلس، طرز نشست و برخاست اور کھانے پینے اور لباس تک میں انگریز کی نقالی کرنے کی ترغیب دی، اور اس بات کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا ذریعہ قرار دیا۔ مسلمانوں کو سلطنت انگلشیہ کے وفادار اور بہی خواہ ثابت کرنے کے لیے سر سید اور ان کے ساتھیوں نے نہایت ہی قدامت پرستانہ اور رجعت پسندانہ پالیسی اختیار کی اور غیر ملکی حکومت کی کاسہ لیسی کو اپنا شعار بنالیا۔

بعض آزاد خیال (Liberal) انگریزوں کی رہنمائی اور مشورے سے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی تاسیس ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس تنظیم میں بعض مسلمان افراد بھی شامل تھے، لیکن اس میں وہ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ بتدریج زیادہ سے زیادہ اثر و قوت حاصل کرتا جارہا تھا جو گزشتہ تین ربع صدی سے مغربی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے مغرب کے قوم پرستانہ اور جمہوری تصورات کو اپنا چکا تھا۔ اگرچہ ابھی تک کانگریس نے ہندوستان کی آزادی کا سوال نہ اٹھایا تھا لیکن مغربی پارلیمانی نظام میں حزب مخالف کا نقطہ نظر اختیار کرتے ہوئے اس نے فی الحال نیاز مندانہ طریق پر اپنے پلیٹ فارم سے ہندوستان کے لیے آئینی مراعات حاصل کرنے اور ہندوستانیوں کو حکومت کے انتظام میں شریک کرنے کے مطالبات شروع کر رکھے تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اخیر میں کانگریس نے لوکل باڈیز کے انتخابات، وائسرائے کی انتظامی کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی، امتحانات مقابلہ میں ہندوستانیوں کی شرکت اور شمال مغربی سرحد پر متعین فوج میں کمی کی قسم کے مسائل اٹھائے۔ لیکن سر سید گروپ نے مسلمانوں کے نام پر ان سب معاملات میں ہمیشہ غیر ملکی حکومت کا ساتھ دیا اور ان سب مطالبات کی براہ راست مخالفت کی۔

اگرچہ یہ لوگ کسی اصول کی رو سے بھی مسلمان عوام یا مسلمانوں کے صاحب دماغ طبقہ کے احساسات کی ترجمانی و نمائندگی کا دعویٰ نہ کر سکتے تھے لیکن اس کے باوجود بعض رجعت پسند انگریزوں (جن میں علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل خاص مقام رکھتے تھے) کے مشورے اور ہدایات کے تحت یہ حضرات مسلمانوں کے نام سے یہ عرضداشت بھی پیش کرتے تھے، اسے حکومت مسلمانوں کی آواز قرار دیتی تھی۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا

چاہئے کہ اس گروہ کی بات کو غیر ملکی حکمرانوں کے نزدیک وہی وزن حاصل تھا جو ایک قوم کے حقیقی نمائندوں کی بات کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس واقعات شاہد ہیں کہ جس ملکی مسئلے پر بھی مسلمانوں کے ان نام نہاد نمائندوں نے آواز اٹھائی بالاخر اس کا فیصلہ ان کے خلاف ہی ہوا۔ مثلاً کانگریس نے جب مطالبہ کیا کہ لوکل باڈیز کے انتخابات کروائے جایا کریں تو سرسید گروپ نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن بالاخر انتخابات کا طریقہ رائج ہو گیا۔ امتحانات مقابلہ میں ہندوستانیوں کی شرکت سے ان لوگوں نے اختلاف کیا، لیکن انگریز نے اس طریق کو اختیار کیا۔ وائسرائے کی انتظامی کونسل میں کسی ہندوستانی کی شمولیت کو یہ لوگ پسند نہ کرتے تھے لیکن انگریز نے بالاخر ہندوستانیوں کو یہ حق دے دیا۔ تقسیم بنگال کے متعلق انگریز نے پہلے تو یہ کہا کہ ہم مشرقی بنگال کی شکل میں ایک اسلامی صوبہ بنانا چاہتے ہیں اور لارڈ کرزن نے مسلمانان بنگال کو بنفس نفیس حاضر ہو کر یہ مژدہ جانفزا سنایا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ان انگریز پرست راہنماؤں نے بنگالی ہندوؤں کی مخالفت کے علی الرغم اس معاملے میں انگریزی حکومت کی حمایت کی۔ لیکن بالاخر سنہ ۱۹۱۱ء میں مسلمانوں یا ان کے ''رہنماؤں'' سے مشورہ کئے بغیر اس ''اسلامی صوبے'' کو ختم کر کے شاہی دربار (دہلی) کے موقع پر بنگال کو متحد کر دیا گیا اور مسلمان اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ مسلمانوں کی یہ سب ناکامیاں اتفاقات کی مرہون منت نہ تھیں بلکہ اس قسم کی پالیسی سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز اس گروہ کو مسلمان قوم کے حقوق کی نگہداشت اور ترقی کے نام پر استعمال تو کرتا تھا لیکن وہ ساتھ ہی یہ احتیاط بھی ملحوظ رکھتا تھا کہ مسلمانوں کا قومی حوصلہ جس قدر گر سکے، اسے اسی قدر گرادیا جائے۔ چنانچہ سیاسیات میں اس سرکار پرست گروہ نے جو موقف بھی اختیار کیا، بالاخر اس میں اسے ناکامی کا سامنا ہی کرنا پڑا۔ اس کا مسلمانوں کے قومی حوصلے، اجتماعی افکار اور سیاسی ولولوں پر بہت ہی نقصان دہ اثر مترتب ہوا۔

انیسویں صدی کے اخیر تک مسلمان قوم کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ انگریز ایک ڈیڑھ صدی کی متواتر سعی وجہد کے بعد اس کی قیادت کو منتشر کر چکا تھا۔ آزادی پسند اور حق پرست علماء کو چن چن کر یا تو تختہ دار پر لٹکایا جا چکا تھا یا حوالہ زندان کیا جا چکا تھا۔ بعض ایسے خاندانوں کو جو پشت ہا پشت سے جدوجہد آزادی میں رہنمائی و قیادت کے فرائض انجام دے رہے تھے تہس نہس کر دیا گیا اور عوام کی عبرت کے لیے ان کے رہائشی مکانات تک کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت تک اس براہ راست مزاحمت کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان عوام انگریز اور اس کے طور طریقوں سے بہت متنفر تھے۔ اگرچہ انگریز نے ان کے نظام

تعلیم کو تباہ کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کئے تھے لیکن اب بھی مسلمانوں میں ہندو کے مقابلے میں پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط کم نہ تھا۔ اگرچہ جدید مغربی تعلیم میں مسلمان بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اب بھی مدرسے اور دارالعلوم قائم ہو رہے تھے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند اور اس قسم کی دوسری درسگاہیں اسی دور کی پیداوار ہیں۔ مسجدوں میں مسلمانوں کو اب بھی کسی نہ کسی حد تک آزادی وحریت کا درس دیا جاتا تھا۔ علماء انفرادی طور پر اب بھی علی الاعلان انگریزی تہذیب و تمدن کے جراثیم سے مسلمانوں کو محفوظ کرنے کے لیے زور لگا رہے تھے اور اب بھی انگریزوں کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ مسلمان کسی وقت بھی بغاوت کر سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انگریز کی دوربین نگاہیں یہ بھی بھانپ رہی تھیں کہ مسلمان قوم اب صرف مدافعت پر بھروسہ رکھتی ہے اور اسے وہ زندگی کے ہر شعبے میں گرا کر اب اس حالت پر لے آیا ہے کہ اس کے اندر سے ہی ایک ایسی قیادت ابھرے جو قوم کو ذلت اختیار کرنے اور غلامی پر قناعت کرنے کا درس دے۔ چنانچہ وہ اس دوران میں سرسید احمد خاں اور ان کے ہم خیال افراد کی شکل میں اس قسم کی ''قیادت'' بروئے کار لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس طرح اس ''قیادت'' کی نیو رکھ دی گئی جس نے بالآخر قیام پاکستان کے موقع پر مسلمانوں کی رہنمائی وسربراہی کی مسند کو سنبھالا۔

اب مسلمانوں کی اجتماعی زندگی ان دو متضاد اندازہائے فکر کی کشمکش کی آماجگاہ بن گئی۔ انگریز نے پہلے نقطہ نظر کے حامیوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنانے کی پالیسی تو جاری رکھی البتہ دوسرے گروہ کی پوری طرح سرپرستی کرنا شروع کی۔ مسلمان عوام کے جذبات تو پہلے گروہ کے ساتھ تھے لیکن مسلمان معاشرے کے مترفین اور بااثر لوگ دوسرے گروہ کی طرف کھنچنے لگے۔ حکومت کی عام پالیسی تو یہی تھی کہ آزادی کے جذبے کو کچلنے کے لیے مسلمانوں کو اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے تو بحیثیت مجموعی نیچے گرایا جائے۔ البتہ ان میں سے چن چن کر ایسے لوگوں کو انفرادی طور پر ''ترقیاں'' دی جائیں جن کا مقصد زندگی جلب منفعت ہو اور جو اخلاقی قدروں اور ملی ہمدردی کے جذبات سے یکسر عاری ہوں۔ ایک ملک گیر منصوبے کے تحت جس کی رو سے دہلی کے ایوان حکومت سے لے ضلعی حکام تک کی پالیسیوں میں پوری یک رنگی پائی جاتی تھی معاشرتی دائرے میں مسلمان عوام کے معاملات کی زمام کار بتدریج اس انگریز دوست طبقے کے ہاتھ میں دے دی گئی۔

مسلمانوں کے معاملے میں انگریز کا یہ کارنامہ اس کی فراست اور حاکمانہ مہارت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ اس سے مسلمانوں کا سیاسی کردار اور ان کی ملی حیثیت بری طرح مجروح ہوئی اور اس قوم کا شیرازہ پوری

طرح منتشر ہو گیا۔ ہمارا مدعا یہ نہیں ہے کہ مسلمان قوم کی اس کیفیت کی ذمہ داری تنہا انگریز پر عائد ہوتی ہے۔ دراصل انگریز کی یہ حکمت علمی مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی کمزوریوں کی وجہ سے کامیاب ہوئی۔ ورنہ ایک منظّم اور بلند انفرادی و اجتماعی سیرت کی حامل قوم غیروں کے اس قسم کے ہتھکنڈوں کی پوری مدافعت کر کے انہیں ناکام بنا سکتی ہے۔ اگرچہ ہماری ہمسایہ قوم کی طرف قابل رشک اخلاقی و اجتماعی صفات منسوب نہیں کی جا سکتیں، لیکن اس میں اس قدر قومی حمیت پیدا ہو چکی تھی کہ انگریز اس نوعیت کے حربے استعمال میں لا کر ہندو عوام پر ہندو سرمایہ پرستوں کی سربراہی مسلط نہ کر سکا اور ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت منعقد ہونے والے پہلے عام انتخابات میں ہندو قوم نے کانگریس پر قریب قریب مکمل اعتماد کا اظہار کر دیا اور وہ اپنے تصورات کے مطابق ترقی کی شاہراہ پر چل کھڑی ہوئی۔ بہر حال انگریز کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو جانے کی وجوہ جو کچھ بھی ہوں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی گرانے، آزادی پسند عناصر پر ظلم ڈھانے اور طالع آزماؤں اور اصول ناشناس افراد کے ایک طبقے کو مسلمانوں کے معاشرے میں اثر و قوت کے مقام پر فائز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے قومی حوصلے مزید پست ہو گئے۔ آزادی کی جدوجہد کرنے والے دینی حلقے آہستہ آہستہ مقابلے اور مخالفت کی پالیسی ترک کر کے عدم تعاون کے منفی مسلک کی تبلیغ کرنے لگے اور کچھ عرصے کے بعد معطل ہو گئے اور سرکار پرست طبقہ بتدریج مسلمانوں کے سیاسی اور اقتصادی معاملات پر چھا گیا۔ اب صورت یہ پیدا ہو گئی کہ سیاسی شعور رکھنے والے مسلمان عوام کے جذبات و احساسات تو ہمیشہ انگریز کی غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کی دعوت دینے والوں کے ساتھ تھے، لیکن سماجی اور اقتصادی حیثیت سے ہر علاقے میں مسلمانوں کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی، جو دنیوی اثر و قوت کے حریص اور انگریز حکام کے شاروں پر رقص کرنے والے تھے۔ اس طبقے کے سماجی اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ملکی حکومت نے بڑی آسانی کے ساتھ مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کا حق بھی اس طبقے کو سونپ دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ملک میں سیاسی آزادی کے لیے باقاعدہ طور پر مطالبات کئے جانے لگے تو مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ ان میں آزادی اور اسلام کا نعرہ لگانے والوں کی تو کمی نہ تھی، لیکن کسی قومی مقصد اور مطمح نظر کا مکمل فقدان تھا۔ پبلک جلسوں اور پریس میں تو انہی لوگوں کو مسلمان عوام کی تائید حاصل تھی جو اپنے آپ کو اسلام اور آزادی کے شیدائی ظاہر کرتے تھے، لیکن معاشرتی اور اقتصادی دائرے میں مسلمانوں کی سربراہی کا مقام اس طبقے کو حاصل تھا جو انگریز کا منظور نظر اور ایوان حکومت میں اثر رکھتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ

جب عوام کو حق رائے دہی دیا گیا تو جلسوں، جلوسوں اور پریس میں چھائی ہوئی فضا کے برعکس مسلمانوں نے ان لوگوں کو مجالس قانون ساز کے لیے منتخب کیا جو غیر ملکی اقتدار کے کاسہ لیس تھے۔ گویا مسلمان قوم ایک عجیب و غریب قسم کے فکری و سیاسی انتشار میں مبتلا تھی اور اس کے قول و عمل میں شدید تضاد پایا جاتا تھا۔ اس کیفیت نے قدرتی طور پر انفرادی و اجتماعی سیرت کو بری طرح ماؤف کیا۔ یہ سب باتیں مسلمان قوم کے ذہنی انتشار اور کسی متعین قومی نصب العین کے فقدان کی نشان دہی کرتی ہیں کہ کبھی تو ترکی میں قیام خلافت [1] کے مسئلے کو اپنی تمام تر توجہات اور جدوجہد کا محور بنالیا اور کبھی سیاسی و اقتصادی لحاظ سے افغانستان جیسے پس ماندہ و نادار ملک میں ہجرت کرنے کی مہم شروع کردی۔ اس انتشار فکر و عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے تک ہندوستانی مسلمان قومی حیثیت سے پورے طور پر ایک بے مقصد اور غیر منظّم گروہ کی شکل اختیار کر گئے۔ تحریک خلافت نہایت ہی مضحکہ خیز لیکن افسوسناک شکل میں ناکامی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ اس سے وابستہ افراد کا ایک حصہ کانگریس میں مدغم ہو گیا اور دوسرا حصہ جو کانگرس کے آئندہ عزائم سے کسی حد تک واقف ہو چکا تھا، گوشہ تنہائی میں جا بیٹھا۔ مسلمانوں میں چھوٹی چھوٹی جماعتیں موجود تھیں۔ لیکن نہ ان کے سامنے کوئی مقصد تھا اور نہ ان میں قوم کو کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی صلاحیت پائی جاتی تھی۔ دینی سطح پر اختلافات کا دور دورہ تھا اور فرقہ بندی نہایت ہی پریشان کن صورت اختیار کر چکی تھی۔ تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے بھی قوم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ یہ وہ دور تھا جب کہ کوئی سوچنے والا ذہن یہ متعین نہ کر سکتا تھا کہ قومی حیثیت سے مسلمانوں کی امنگیں کیا ہیں۔ اس حالت میں ایک طرف کانگریس مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا دعویٰ کرتی تھی اور دوسری طرف نہایت ہی پست ذہن و فکر رکھنے والے نام نہاد رہنما اپنے رجحانات اور مفادات

۱۔ اس سے ہمیں انکار نہیں کہ تحریک خلافت مسلمانان ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک نے مسلمان عوام میں غیر ملکی آقاؤں کے خلاف نفرت پیدا کرنے اور سینوں میں آزادی کی امنگ کو تیز تر کرنے کے سلسلے میں بہت کام کیا۔ لیکن اس تحریک کا یہ پہلو نہایت ہی حیران کن ہے کہ اس کا مقصد اس ملک سے ہزاروں میل دور ایک دوسرے ملک میں ''خلافت'' کے قیام کی حمایت کرنا تھا۔ حالانکہ وہ ''خلافت'' اسلام اور مسلمانوں کے لیے باعث ننگ تھی۔ اور غیروں کے طعن و مضحکہ کا ہدف بن رہی تھی۔ اور پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے مسلمانان ہندوستان براہ راست کوئی جدوجہد نہ کر سکتے تھے۔ اور جب ترکوں نے خود ہی ''خلافت'' کو منہدم کر دیا تو ہندوستانی مسلمان منہ دیکھتے رہ گئے اور یہ ساری تحریک دھڑام سے زمین پر آ رہی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کا ردعمل خوفناک مایوسی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

کے مطابق مسلمانوں کو پبلک تقاریر کے ذریعے کبھی ایک جزوی مسئلے پر ابھارتے تھے اور کبھی کسی دوسرے ہنگامی معاملے میں الجھا دیتے تھے۔ انتشار اور بے راہروی کی اس کیفیت میں غیروں کے لیے مسلمانوں کے معاملات میں دخل اندازی کرنے اور ان کی معاشرت اور سیاست میں مزید بگاڑ پیدا کرنے کے لیے اور آسانی پیدا ہو گئی اور جہاں تک غیر ملکی حکومت کا تعلق تھا، اس نے زندگی کے سارے شعبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا حق سرکار پرست افراد کے حوالے کر دیا۔ یہی لوگ مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے اور انہی کو مسلمان سوسائٹی میں رہنمائی کا مقام حاصل تھا۔ اگرچہ جذباتی لحاظ سے مسلمان عوام اس طبقے کے افراد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور پبلک جلسوں میں ان سے برات کا اظہار کرتے تھے، لیکن اپنے روزمرہ کے معاملات کے سلسلے میں انہی سے رجوع کرتے تھے۔

یہ کیفیت چوتھے عشرے کے اخیر تک قائم رہی۔ اگرچہ مسلمانوں کی حالت ایک غیر منظّم گروہ ہی کے مشابہ تھی اور ان کے مقابلے میں ہندوؤں کی سب سے بڑی جماعت کانگریس بڑی تیزی کے ساتھ سیاسی اثر حاصل کر رہی تھی اور جدوجہد آزادی کی کامیابی کی صورت میں اپنے آپ کو انگریز کے اقتدار کی جائز وارث تصور کرتی تھی، لیکن مسلمانوں کو ایک بار پھر ان کے اسی تاریخی تصور نے ـــــــ اگرچہ اس کی بنیاد شعوری نہیں بلکہ جذباتی ہی تھی ـــــــ کہ وہ ساری دنیا سے الگ ایک ایسی ملت کی حیثیت رکھتے ہیں جس کا اپنا ایک مستقل وجود ہے، بعض دوسرے اسباب کے ساتھ مل کر کانگریس میں مدغم ہونے سے بچا لیا۔ عین اس وقت انگریز نے ۱۹۳۵ء کے دستور کے صوبائی حصے کو نافذ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے تحت متحدہ ہندوستان کے ہر صوبے میں اکثریت رکھنے والی قوم کی حکومت کے قیام کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر مسلمانوں کی کیفیت تو وہ تھی جو سطور بالا میں بیان کی جا چکی ہے۔ ان حالات میں یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں کوئی مضبوط حزب مخالف اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں مضبوط بنیادوں پر ایسی حکومتیں قائم کر سکیں گے، جن سے مسلمانوں کو قومی حیثیت سے کوئی فائدہ پہنچنے کا امکان ہو اور مجموعی طور پر ملک میں مسلمان قوم کے حقوق کو محفوظ کرنے کے اسباب فراہم ہو سکیں۔ اس کے مقابلے میں ہندو قوم اس وقت تک کانگریس کی زیر سرکردگی متحد و منظّم ہو چکی تھی۔ اور یہ بات یقینی تھی کہ گیارہ صوبوں میں سے کم از کم ہندو اکثریت کے چھ صوبوں میں کانگریس ایسی وزارتیں قائم کرے گی جو اپنا ایک مشترک پروگرام رکھتی ہوں گی اور آئندہ چل کر مرکز میں بھی کانگریس (یعنی ہندو) کا تسلط پوری طرح قائم ہو جائے گا۔ اس صورت حال کو برطانیہ میں

بیٹھے ہوئے ایک ذہین مسلمان سیاستدان اور مدبر مسٹر محمد علی جناح نے پوری طرح بھانپ لیا اور وہ مسلمانوں کی قومی سیاست میں پائے جانے والے خلا کو پر کرنے کے لیے واپس ہندوستان پہنچ گئے۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت جو صوبائی انتخابات ہوئے، انہوں نے جہاں یہ ثابت کر دیا کہ ہندو قوم ایک متعین قومی مقصد کے تحت کانگریس کے زیر سیادت متحد و منظّم ہو چکی ہے، وہیں ان انتخابات نے مسلمانوں کی اس کیفیت کو بھی اجاگر کر دیا جس کا تذکرہ ہم نے سطور بالا میں کیا ہے۔ ہندو اکثریت کے تمام صوبوں کی مجالس قانون ساز میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ لیکن مسلمان اکثریت کے صوبوں میں الگ الگ نوعیت کی حکومتیں وجود میں آئیں۔ اور کوئی دو صوبے بھی ایسے نہ تھے، جن کی حکومتوں کے درمیان جزوی طور پر بھی کوئی قدر مشترک موجود ہوتی۔ صوبہ سرحد میں تو عظیم مسلم اکثریت کے باوجود بالآخر کانگریس حکومت بن گئی اور بقیہ چار صوبوں میں مسلمانوں نے ایسے افراد کو منتخب کیا جو سرکار پرست تھے اور اپنے ذاتی مفادات کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ رکھتے تھے۔ ان وزارتوں میں سے کوئی ایک وزارت بھی ایسی نہ تھی جو اجتماعی تعمیر کے کسی پروگرام یا مسلم قوم کی فلاح کے کسی نظریے کو عوام کے سامنے پیش کر کے بر سر اقتدار آئی ہو۔ سرکار پرست طبقے کے افراد اس سماجی اور اقتصادی اثر کے بل پر جو انہیں اپنے اپنے علاقے میں انگریز کی اس پالیسی کے تحت حاصل ہو گیا تھا، جس کا تذکرہ ہم اس سے قبل کر چکے ہیں منتخب ہو کر آئے اور آپس میں ساز باز کر کے انہوں نے وزارتیں بنالیں۔ ناظرین کو یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ اُس وقت بھی ان سرکار پرست افراد کو کسی سیاسی پلیٹ فارم پر آکر مسلمانوں سے خطاب کرنے کی جرات نہ تھی، اور مسلمانوں کے باشعور طبقے انہیں مسلمانوں کی ترجمانی کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ ان دنوں عوامی جلسوں اور اجتماعات میں وہی لوگ مسلمان عوام کا سامنا کرتے تھے جو انگریز سے آزادی حاصل کرنے کی تمناؤں کا اظہار کرتے اور اپنے آپ کو جذباتی رنگ میں اسلام کے شیدائی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے اور یہی لوگ تھے، جن کی تقاریر کے دوران نعرہ ہائے تکبیر و تحسین بلند ہوتے تھے [۲] لیکن انتخابات میں ان لوگوں کو تو کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ البتہ وہ لوگ مسلمان

---

[۲] جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے ہم یہاں متحدہ ہندوستان کے سیاسی حالات کا ہمہ جہتی جائزہ نہیں لینا چاہتے۔ ہمارا مدعا در حقیقت یہ ہے کہ ناظرین کے سامنے تقسیم ملک کے موقع پر مسلمانوں کی سیاسی حالت کا ایک مجمل ساخاکہ پیش کر دیں اور یہ بتادیں کہ فکر و عمل کے دائروں میں یہ قوم اس وقت کس قسم کے انتشار میں مبتلا تھی۔ اس میں قول و عمل کا کس قدر حیرت انگیز تضاد پایا جاتا تھا۔ اور معاشرتی و سیاسی حیثیت سے کس سیرت و کردار اور عقیدہ و مسلک کے لوگ اس کی سربراہی کر

عوام کی آراء سے منتخب ہو گئے جو سیاسی حیثیت سے ہمیشہ اس قوم میں مبغوض رہے اور اس وقت بھی ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اس تضاد کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ سماجی اور معاشرتی حیثیت سے موخر الذکر گروہ ہی اثر و قوت رکھتا تھا اور اگرچہ ہمارے عوام نہ صرف اسلام کے شیدائی بلکہ اس کے نام پر اپنی جانیں تک حاضر کرنے کے لیے تیار تھے لیکن اس کے باوجود انگریز نواز گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد نے قوم کی انفرادی و اجتماعی سیرت کے بودا پن اور کسی اجتماعی مقصد کے فقدان سے فائدہ اٹھایا اور اپنے اثرات کو استعمال میں لانے کے علاوہ دولت خرچ کر کے رائے دہندوں کے ضمیر کا سودا کر لیا۔[۳]

نظریہ پاکستان کی ابتداء

بہر حال یہ وہ حالات تھے جن کے تحت قائد اعظم نے مطالبہ پاکستان کے لیے نفسیاتی فضا ہموار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس وقت مسلمانوں میں کام کرنے کے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کے قومی تشخص کو محفوظ رکھنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس قوم کو اسلام یا کسی دوسرے نظریۂ زندگی کی عطا کردہ اقدار کی کسوٹی پر رکھ کر اس کی خامیوں کو متعین کیا جاتا اور ان خامیوں کو دور کر کے مثبت طور پر اس قوم میں وہ فکری و عملی صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی جو مطلوبہ نظام زندگی کو برپا کرنے کے لیے ضروری تھیں۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ ملک میں جو سیاسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی، صرف اس کو پیش نظر رکھا جاتا اور مستقبل میں تعمیر و ترقی کے امکانات کو نظر انداز کر کے مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے ہندو اکثریت کے غلبے کے خطرے سے محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی۔ قائد اعظم نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ جماعتی

رہے تھے۔ ان مباحث کے دوران قارئین کو اپنی توجہ اسی پہلو پر مرکوز رکھنی چاہئے، کیونکہ آئندہ کی گزارشات کو سمجھنے کے لیے اس کا اچھی طرح پیش نظر رہنا نہایت ضروری ہے۔

[۳] ہمیں احساس ہے کہ یہ حقیقتیں نہایت ہی تکلیف دہ ہیں، لیکن کسی مرض کے علاج کے لیے اس کی صحیح تشخیص ک ضروری ہے اور اگر محض مرض کی شدت کے بھیانک تصور سے بچنے کے لیے تشخیص کے مرحلے پر اپنے آپ کو دھوکا دیا جائے تو صحیح علاج ناممکن ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں ہمارے عوام و خواص اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق اپنی نجی مجالس میں درست تسلیم کرتے اور ان پر اظہار افسوس بھی کرتے ہیں لیکن قومی رہنما عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان باتوں کو کھلے بندوں بیان کرنے سے احتراز کرتے ہیں اور پبلک پلیٹ فارموں پر ہمیشہ یہی کہا جاتا ہے کہ یہ قوم صرف باہمت و باعظمت ہی نہیں بلکہ اسلامی نظام تک کو اپنانے کے لیے آمادہ و تیار ہے لیکن ہمارے رائے میں دیانتداری کا تقاضا بھی یہی ہے اور یہی بات مفید بھی ہے کہ اصل صورت حال کھل کر سامنے آجائے۔

ڈھانچہ اور کارکنوں کا گروہ کس طرح فراہم کیا جائے جو اس کام کو انجام دینے کے لیے ضروری تھا۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں سیاسی لحاظ سے مسلمان ایک بن سرے اور غیر منظّم گروہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے معاشرے میں ایک ایسا مفاد پرست اور اصول ناشناس طبقہ سربراہی کے مقام پر فائز تھا، جس کے افراد کی ساری عمریں غیر ملکی حکومت کی خدمت کرنے میں بسر ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو اقدار اور سربراہی کے مقام سے ہٹانے کے لیے مسلمانوں میں اسی طرح معاشرتی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنے کی ضرورت تھی جس طرح انگریز نے اپنے مقصد کی خاطر مسلمانوں کی ذہنیت اور ان کی سیاسی و معاشرتی اقدار میں تغیر پیدا کیا تھا لیکن یہ کام نہایت ہی محنت طلب تھا۔ قائد اعظم ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم اکثریت کے صوبوں میں مکمل ہزیمت اٹھا کر یہ دیکھ چکے تھے کہ مسلمانوں کی سیاست و معاشرت پر کس قسم کے لوگ مسلط ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلم لیگ ـــــ جس سے وہ وابستہ تھے ـــــ کی تنظیم نو کے سلسلے میں ایسے لوگوں کو "جمع" کرنا شروع کیا جو صوبائی انتخابات میں کامیاب ہو گئے تھے۔[٤] اگرچہ ذاتی حیثیت سے قائد اعظم ایک مضبوط اور باہمت انسان تھے اور جو نصب العین انہوں نے اپنے سامنے رکھا تھا، اس کے سلسلے میں انہوں نے پورے خلوص کا ثبوت پیش کیا۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر "جمع" کرنے کے سلسلے میں بااصول تنظیموں اور جماعتوں کے معروف انداز تنظیم اور طریق کار کو ملحوظ نہ رکھا گیا بلکہ قریب قریب ہر صاحب اقتدار یا صاحب اثر شخص یا گروہ سے الگ الگ معاملہ کیا گیا اور اس کے تحت موخر الذکر کو مسلم لیگ کے اندر رہتے ہوئے حکومت و سیاست کے معاملات میں اپنے ذاتی مصالح کو پیش نظر رکھنے کا پورا پورا موقع دیا گیا۔ اس کی نمایاں ترین مثال سکندر جناح پیکٹ ہے۔ منظّم و بااصول جماعتوں کی تاریخ میں ہمیں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی شخصیت کسی جماعت میں کسی معاہدے کے تحت داخل ہوئی ہو۔ داخلے کی شرط ہمیشہ جماعت کے اصولوں اور طریق کار سے اتفاق ہی ہوتی ہے اور افراد اپنے آپ کو ہمیشہ بالکلیہ جماعت کے حوالے کر دیا کرتے ہیں۔ مسلم لیگ کے تنظیمی کھوکھلا پن کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جبکہ

---

[٤] ہم اس پہلو سے گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس طریق کار میں اس کے علاوہ اور کون کون سے مصالح مضمر تھے، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ قائد اعظم نے مسلم لیگ میں ایسے لوگوں کو ہی "جمع" کیا۔ ان واقعات کے تذکرے سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ناظرین کے سامنے واضح طور پر معاملے کے وہ پہلو رکھ دیئے جائیں جن کا فہم قوم کی اس سیاسی حالت کو اور اس کی قیادت کے اس معیار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے جو ہم نے پاکستان کے عالم وجود میں آنے پر ورثے میں حاصل کیا۔

متحدہ پنجاب کے ایک وزیر اعلیٰ نے جو مسلم لیگ سے وابستہ تھا، پاکستان کی تحریک کو شدید ترین نقصان پہنچانا تو گوارا کر لیا، لیکن صوبائی سیاست میں اپنے رویے کو اپنے ذاتی مصالح کے تحت ہی متعین کرنے پر اصرار کیا اور قائد اعظم کے لیے یہ بات بہت زیادہ پریشانی کا باعث ہوئی۔

قوم کے شعور کی اس کیفیت، جماعت کی اس تنظیمی حالت اور کارکنوں کے اس معیار فکر و کردار کے ساتھ پہلے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور بعد میں ان کے لیے ایک الگ مملکت قائم کر دینے کا مطالبہ کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ کوئی ایسا مسلمان جو اپنی قوم کے مستقل وجود کا قائل ہو اس وقت کے سیاسی حالات کے تحت اس مطالبے سے اختلاف نہ کر سکتا تھا اور مسلمان عوام کے لیے اس میں عظیم جاذبیت موجود تھی۔

اب کیفیت یہ تھی کہ ایک طرف مسلمان قوم کے سامنے ایک ایسا مقصد رکھ دیا گیا جو ان کی تائید حاصل کرنے کا موثر ترین ذریعہ بن سکتا تھا اور دوسری طرف اس مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرنے والی جماعت میں آہستہ آہستہ ایسے لوگوں کو "جمع" کر لیا گیا جو مسلمانوں کے معاشرے میں اثر و قوت رکھتے تھے اور غیر ملکی حکومت کے ایوان میں بھی انہیں دسترس حاصل تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک پاکستان عوام میں بہت جلد متعارف ہو گئی۔ عملاً یہ صورت رونما ہوئی کہ پہلے تو مسلمانوں کے سیاسی و معاشرتی رہنمائی کرنے والے طبقے کے بعض افراد کو قائد اعظم نے مسلم لیگ میں شامل کیا۔ اس سے تحریک پاکستان کے تعارف میں مدد ملی اور عوام تک یہ آواز پہنچانے کے وسائل میسر آ گئے۔ جب عوام اس تحریک سے کسی حد تک روشناس ہو گئے اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے نے بھی اسے مسلمانوں کے قومی استقلال کا ذریعہ تصور کر کے اس کی تائید کی تو سرکار پرست طبقے کے مزید افراد اپنے "مستقبل" کے نقطہ نظر سے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ان لوگوں کی شمولیت نے مسلم لیگ کو مزید تقویت دی، تاآنکہ پانچویں عشرے کے وسط میں متحدہ ہندوستان کے مسلمان عوام کی عظیم اکثریت پاکستان کے مطالبے کی حمایت پر کمربستہ ہو گئی اور یہ صحیح معنوں میں مسلمانوں کا ایک قومی مطالبہ بن گیا۔ یہ وہ دور تھا جب کہ کٹر سے کٹر سرکار پرست بھی اپنے "مستقبل" کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلم لیگ کے ساتھ آ ملے۔ یہ لوگ اچھی جانتے تھے کہ ملک کے اندرونی حالات اور بین الاقوامی سیاسی رجحانات کے تحت اب انگریز کے لیے ہندوستان سے رخصت ہونا ناگزیر ہے اور ہمارا مستقبل اب غیر ملکی آقاؤں کے ساتھ نہیں، قوم کے ساتھ وابستہ ہے۔

گویا حصول پاکستان کے وقت مسلمان قوم کی سربراہی کی باگ ڈور ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھی جس کی زندگی کے متعلق کوئی نظریات تھے اور نہ وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں سے کوئی واسطہ رکھتا تھا۔ زندگی میں اس طبقے کا واحد مطمح نظر مفاد پرستی تھا۔ یہی لوگ مسلمانوں کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے اور یہی ان کی معاشرت پر حاوی تھے۔ اسی طبقے کے ہاتھ میں پاکستان کی زمام کار منتقل ہوئی۔ خود مسلمان عوام کا یہ حال تھا کہ ان میں حصول آزادی کے وقت قومی تعمیر و ترقی کے کسی منصوبے یا نظریے کا کوئی ابتدائی تصور بھی نہ پایا جاتا تھا۔

مباحث کا خلاصہ

ہم نے دورِ غلامی میں مسلمانوں کی سیاست و معاشرت کے ارتقاء کے سلسلے میں جن حقائق کی نشان دہی کی ہے ان سے تقسیم کے وقت مسلمانوں کی قومی زندگی کی مندرجہ ذیل خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔

۱۔ انگریز کی سوچی سمجھی ہوئی پالیسی کی وجہ سے تعلیم کی شدید کمی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ قومی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے نہ اسلام کی بنیاد پر کسی ریاست کی تعمیر کا کوئی نقشہ تھا اور نہ وہ صلاحیتیں ہی پائی جاتی تھیں جو مغرب کے قوم پرستانہ تصور کے مطابق اجتماعی تعمیر و ترقی کے لیے ضروری ہیں۔

۲۔ قوم کے سامنے قومی ترقی و تعمیر کا نہ کوئی واضح نقشہ تھا اور نہ اس کا شعور ہی پایا جاتا تھا۔ اگرچہ تحریک پاکستان کے لیے عوام کی تائید حاصل کرنے کی غرض سے مسلم لیگی قیادت نے یہی دعویٰ کیا تھا کہ اس ملک میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا لیکن یہ قیادت نہ خود اسلام یا کسی دوسرے نظریہ زندگی کا کوئی واضح تصور رکھتی تھی اور نہ اس نے قوم میں اس کا کوئی شعور پیدا کیا۔ اسلام کے ساتھ عوام کی جذباتی وابستگی نظریۂ پاکستان کی حمایت کا باعث بنی۔

۳۔ قیام پاکستان کے موقع پر معاشرت و سیاست پر ایک ایسی قیادت پوری طرح مسلط ہو چکی تھی جو فکری صلاحیتوں اور سیرت و کردار کی خوبیوں سے یکسر عاری تھی۔ اور اس سے وابستہ افراد کی زندگیاں اس بات کی کھلی شہادت دیتی تھیں کہ ان کا مطمح نظر محض حصول اقتدار اور مفاد پرستی ہے۔

ایسی خصوصیات رکھنے والے معاشرے کے کندھوں پر ایک انحطاط پذیر قوم کی نشاۃ ثانیہ اور ایک پس ماندہ ملک کو ترقی دینے کی ذمہ داری آن پڑی۔

قیام پاکستان کے بعد

جب ایک آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت سے ہمیں قومی مسائل اور حکومت و سلطنت کے معاملات سے عہدہ براہونا پڑا تو ہمارے ایک ایک عمل کو ہمارے اجتماعی ضمیر اور قومی کردار نے متاثر کیا۔ ہم نے دیکھا کہ عین اس وقت جب کہ قوم خون اور آنسوؤں کے دریا سے گزر کر پاکستان کی منزل پر پہنچی اور اس ملک کے بقاو استحکام کے لیے ساری قوم کے دل میں زبردست تڑپ بھی موجود تھی، ہم سے ایسی ایسی حرکات سرزد ہوئیں جو اصول ناشناسی، ضمیر فروشی اور ملک دشمنی کی بدترین مثالیں ہیں۔ اگرچہ ہم ملک وملت کے لیے نہایت ہی مخلصانہ جذبات ظاہر کرتے تھے لیکن قدم قدم پر ہمارا انفرادی واجتماعی کردار ہمارے ایک ایک فعل اور ہماری ایک ایک حرکت کو متاثر کر رہا تھا۔ اگرچہ قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے عوام اور قیادت کے اعمال اور ذمہ داریوں کا الگ الگ تذکرہ کرنا ہی پڑتا ہے اور عام طور پر قیادت ہی اجتماعی خرابیوں کی ذمہ دار دکھائی دیتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا طرز عمل اس کے تمام طبقات کے مجموعی کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس کی زندگی کے سارے شعبوں کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے اور اسی لحاظ سے عوام وخواص میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ اگر جذبات سے ہٹ کر غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے عوام وخواص کے اعمال و کردار اور طرز عمل میں کامل یک رنگی پائی جاتی ہے۔ ذیل میں ہم نہایت اختصار کے ساتھ اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کی کیفیت بیان کریں گے تاکہ ناظرین کے سامنے قومی حیثیت سے ہماری موجودہ حالت کا ایک نقشہ سا آجائے۔

سیاست

ہماری سیاست میں قیادت اور عوام نے ایک ہی طرح کی اصول ناشناسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ قیادت کے حلقوں میں گذشتہ دس سال سے کشمکش اقتدار کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ جاری ہے جس نے اس ملک میں انتشار کی ایک نہایت ہی افسوسناک کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ایوان حکومت تعمیری کاموں کے منصوبے تیار کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں رہنمائی کے فرائض انجام دینے کے بجائے جنگ اقتدار کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ جو گروہ حالات کے الٹ پھیر سے برسر اقتدار آجاتا ہے وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ من مانیاں کرتا اور اقتدار کی مہلت کو

ذاتی فوائد کے حصول اور کنبہ پروریوں اور اقربانوازیوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مسند اقتدار کے حصول اور پھر اس پر زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قابض رہنے کے لیے دستور کو موم کی ناک بنادیا جاتا اور دستوری اخلاقیات اور روایات کو رات دن کھلم کھلا پامال کیا جاتا ہے۔ شہری آزادیوں کو پوری طرح کچلا جاتا اور جمہوری قدروں کو بے دریغی کے ساتھ روندا جاتا ہے اول تو انتخابات کرانے سے گریز کے سبھی حربے استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جب بامر مجبوری انتخابات کرائے بھی جاتے ہیں تو ان میں بد دیانتی کا کھلے بندوں مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی مجلس قانون ساز وجود میں آتی جاتی ہے تو اسے وہ مقام دینے سے احتراز کیا جاتا ہے جو جمہوری ممالک میں ان مجالس کو حاصل ہوتا ہے۔ اگر دستوری شرط کو پورا کرنے کے لیے کسی وقت ان مجالس قانون ساز کا اجلاس بلایا بھی جاتا ہے تو مرکزی اور صوبائی مجالس کی کارروائیوں کے دوران ایسی ایسی نازیبا حرکات کی جاتی ہیں اور پارلیمانی ہی نہیں، عام مجلسی آداب تک کو اس طرح پس پشت ڈال دیا جاتا ہے کہ پریس کو ان مذموم حرکات کو بیان کرنے کے لیے غنڈہ گردی تک کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ حالت ہے ان مجالس کے ارکان کی جن کے ہاتھ میں اس ملک کی قسمت کی باگ ڈور ہے۔ اگرچہ ایک آدھ استثنی کے ساتھ آج سے کچھ عرصہ قبل تک مرکز اور صوبوں میں ایک ہی جماعت حکمران رہی ہے، لیکن پارلیمانی طرز حکومت کی تاریخ کا یہ ایک نادر ترین واقعہ ہے کہ اس ملک میں نااہلی اور بد دیانتی کی بنا پر آئے دن وزارتیں برطرف کی جاتی ہیں اور اس طرح ملک اس وزارتی استحکام سے محروم رہا ہے جو تعمیر و ترقی کے کسی ہمہ گیر پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے۔

حکمران طبقے نے ایوان حکومت کے اندر جس کردار کا مظاہرہ کیا ہے عوام سے بھی ملکی زندگی کے سبھی شعبوں میں اسی طرز عمل کا صدور ہو رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے عوام اس ملک کی بہتری کی تمنائیں رکھتے ہیں، لیکن اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے ان پر جو فرائض عائد ہوتے تھے ان کی ادائیگی میں انہوں نے بھی حکمرانوں کے سے سیرت و کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگرچہ انتخابات میں بد دیانتوں کی ذمہ داری زیادہ تر حکمران طبقے پر ہی عائد ہوتی ہے لیکن عوام کا ایک بہت بڑا حصہ بھی ان لوگوں کی من مانیوں میں ان کے ساتھ تعاون ہی نہیں کرتا بلکہ ان کا آلہ کار بھی بنتا ہے۔ آخر ایک مضبوط رائے عامہ کی مخالفت کے علی الرغم وہ انتخابی ہتھکنڈے کس طرح استعمال کئے جا سکتے ہیں جنہیں ہمارا حکمران طبقہ بے تکلفی سے استعمال کرتا ہے۔ اگر اس ملک کے کسی خطے یا شہر میں ہونے والے انتخابات کے موقعہ

پر چھائی ہوئی فضا کا بغور مطالعہ کیا جائے تو سب نازیبا حرکات اس انداز سے کی جا رہی ہوتی ہیں کہ ان حرکات اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کے مزاج کی مطابقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور کوئی چشم بینا رکھنے والا انسان یہ تاثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس طرح ایک مشین اپنے پرزوں کی مناسب حرکات سے پوری روانی کے ساتھ اپنا کام کرتی ہے اس طرح ایسی حرکات ہمارے معاشرے کے موجودہ مزاج سے فطری طور پر سرزد ہو رہی ہیں۔ یہ رنگ فضا پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ جو لوگ یہاں کی سیاسی زندگی اور خصوصیت کے ساتھ انتخابات میں اخلاقی قدروں اور سیاسی دیانت کے معروف اصولوں کو ملحوظ رکھیں وہ ہمارے ہاں اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ اور دیکھنے والے اگر انہیں دیوانہ قرار نہیں دیتے تو کم از کم تمسخر آمیز لہجے میں ان کے متعلق حیرت واستعجاب کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں کس قسم کا سیاسی اخلاق پروان چڑھ رہا ہے۔

ان حالات میں اس وقت ملک میں وہی سیاسی جماعتیں پھل پھول رہی ہیں اور اجتماعی زندگی کے مختلف دائروں میں انہی عناصر کو اثر و قوت حاصل ہے جو اجتماعی تعمیر کا کوئی پروگرام تو نہیں رکھتے البتہ ان کا مزاج اور انداز کار اس سیاسی فضا کے عین مطابق ہے۔ وہ سیاست اور اجتماعی زندگی کے دوسرے کاموں کو ایسی تجارت اور کاروبار کے ہم معنی خیال کرتے ہیں جسے چلانے میں دیانت وامانت کے کسی اصول کو پیش نظر رکھنے کی کوئی ضرورت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت بعض سیاسی شخصیتیں اور گروہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں تو اس میں نظریات کو کوئی دخل حاصل نہیں ہوتا اور اگر وہ کسی موقع پر تحالف و اتحاد سے کام لیتے ہیں تو کسی اصولی قدر مشترک کی وجہ سے نہیں بلکہ ایسے مواقع پر بھی محض ذاتی اور گروہی مفادات ہی پیش نظر ہوتے ہیں۔

معیشت

جس ملک کی سیاست پر تخریب پسند عناصر مسلط ہوں، اس کی معیشت کو کبھی بھی اچھی بنیادوں پر استوار نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی فضا کو بہتر بنانے اور ملک کی دستوری زندگی کو صحت مند خطوط پر استوار کرنے کے لیے تو صرف اچھا طرز عمل اختیار کرنے اور معروف سیاسی آداب کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اقتصادی بہتری ٹھوس اور ان تھک محنت ومشقت کا تقاضا کرتی ہے اور اس وقت چونکہ دنیا میں قومی معیشت کے سلسلے میں متعدد لیکن متضاد مکاتب فکر پائے جاتے ہیں اس لیے عمل کے علاوہ فکری سطح پر

بھی کاوش اور جدت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں بحالات موجودہ کوئی نئی راہ تلاش کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ جو اقتصادی نقشہ پہلے رائج تھا اس میں بھی مزید بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اگرچہ اس ملک کی فی کس آمدنی میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق اس میں کمی ہو رہی ہے، لیکن ملکی دولت ایک محدود طبقے کے ہاتھوں میں سمٹتی جا رہی ہے اور ارتکاز دولت کے اس عمل سے قدرتی طور پر ملک کی عام آبادی کا معیار زندگی تو پست سے پست تر ہوتا چلا جا رہا ہے لیکن ملک کے قلیل حصہ آبادی پر مشتمل ایک طبقہ نہایت ہی عیاشانہ اور مصرفانہ طریق پر زندگی بسر کر رہا ہے۔

زراعت اس ملک کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے لیکن بظاہر زرعی ترقی کی مختلف نام نہاد سکیموں کے اجراء و نفاذ کے باوجود اصل صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ تقسیم کے وقت پاکستان خوراک کے معاملے میں بحیثیت مجموعی خود مکتفی تھا اور مشرقی بنگال میں جو کمی تھی وہ مغربی خطہ پوری کر سکتا تھا لیکن اب ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اپنی غذائی ضروریات کو اپنے وسائل سے پورا کر سکیں۔ یہ بات نہایت ہی اذیت دہ، افسوس ناک اور ہماری نااہلی کی واضح علامت ہے کہ اگرچہ گزشتہ نو دس سال میں حکومت کے اعلانات کے مطابق کئی لاکھ ایکڑ پر مشتمل نئے رقبہ جات زیر کاشت لائے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود ملک کی مجموعی غذائی پیداوار میں کمی آ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فی ایکڑ پیداوار کی اوسط گر گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات آج کے دور میں جب کہ زراعت کو ترقی دینے کا تکنیک بہتر بنیادوں پر استوار ہو چکا ہے اور دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے بہت سے مواقع موجود ہیں کسی قوم کے لیے نہایت ہی شرمناک ہے۔ اس کیفیت کا اندازہ درج ذیل اعداد و شمار[۵] سے ہو سکتا ہے۔ وہ رقبہ جس میں غذائی فصلیں کاشت کی گئیں۔

۱۹۴۸۔۴۹ میں ۳۷۳ لاکھ ایکڑ

۱۹۵۴۔۵۵ میں ۳۹۳ لاکھ ایکڑ

مجموعی غذائی پیداوار

۵۔ ہم نے یہ اعداد و شمار پانچ سالہ منصوبے کے اس مسودے سے لیے ہیں جو حال ہی میں حکومت پاکستان کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

۱۹۴۸ء۔۴۹ میں ۱۳۶ لاکھ ٹن

۱۹۵۴ء۔۵۵ میں ۱۲۷ لاکھ ٹن

یعنی زیر کاشت رقبہ تو بڑھ گیا ہے لیکن مجموعی غذائی پیداوار کم ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ فی ایکٹر پیداوار میں کمی ہے۔

فی ایکٹر پیداوار	۱۹۴۸ء۔۴۹ میں		۱۹۵۴ء۔۵۵ میں	
	سیر	من	سیر	من
چاول	۲۴	۱۰	۲۸	۹
گیہوں	۸	۱۰	۴	۸
جو	۳۶	۷	۳۲	۶
مکی	۳۲	۱۰	۸	۱۱
باجرہ	۲۴	۴	۱۲	۴
جوار	۲۴	۵	۱۲	۵
اوسط	۳۶	۹	۳۲	۸

اگر دوسرے ممالک کے اس زمانے کے اعداد و شمار پر نظر ڈالی جائے تو کوئی بد قسمت ملک ہی ہوگا جس میں پاکستان کی طرح فی ایکٹر پیداوار کم ہوئی ہو، ورنہ دنیا کے سبھی قابل ذکر ممالک نے اس زمانے میں فی ایکٹر پیداوار کی اوسط کو بڑھایا ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک نے جو ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا تھا اس دوران میں اپنی مجموعی غذائی پیداوار زیر کاشت رقبے اور فی ایکٹر پیداوار میں نمایاں اضافہ کیا ہے اور اگرچہ تقسیم کے وقت بھارت کی غذائی حالت تشویش ناک حد تک خراب تھی لیکن نو سالوں میں اس ملک نے یہ مسئلہ حل کر لیا ہے۔

صنعت کے دائرے میں کچھ کام ہوا ہے اور چند نئے کارخانے قائم کیے گئے ہیں لیکن چونکہ ان کارخانوں کے قیام میں محض چند سرمایہ داروں کے ذاتی مفادات کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس لیے عوام کو ان کے قیام سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور دوسرے چونکہ مشینی طریقہ پیداوار نے گھریلو صنعتوں کو تباہ کر دیا ہے اس لیے کارخانوں کے قیام سے مجموعی قومی پیداوار میں نہایت ہی معمولی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن چونکہ اس دوران میں ملک کی آبادی میں اضافہ ہو گیا ہے اس لیے صنعتی پیداوار میں اس معمولی سے اضافے سے فی کس آمدنی نہیں بڑھ سکی اور دور

حاضر میں کسی قوم کی خوش حالی اور اقتصادی ترقی کا اندازہ کرنے کے لیے فی کس آمدنی کو ہی مناسب ترین پیمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کارخانوں کے قیام سے تقسیم دولت میں ناہمواری اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی کہ گھریلو صنعتوں سے جو آمدی عوام کے حصے میں آتی تھی وہ مشینی صنعتوں کے وجود میں آنے سے چند کارخانہ داروں کی جیبوں میں منتقل ہو گئی ہے۔[۶] حالانکہ یہ چیز قومی معیشت کے جدید ترین تصورات میں مسلمہ حیثیت رکھتی ہے کہ گھریلو صنعتیں زرعی معیشت کا لازمی جزو ہیں۔ اگر گھریلو صنعتیں تباہ ہو جائیں تو جزوی بے کاری (Under-employement) کی وجہ سے زرعی آبادی کی افرادی قوت کا ایک معقول حصہ معطل ہو جانے سے قومی پیداوار میں کمی آجاتی ہے اور زرعی آبادی کا معیار زندگی گر جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ پاکستان جیسے ملک میں تو جہاں مغربی حصے میں دیہاتی آبادی کے پاس فی کس اوسطاً ۴۰ء۱ ایکڑ زمین ہو اور مشرقی حصے میں ۷ ایکڑ اور جہاں کاشت کا طریقہ نہایت ہی فرسودہ اور زمین کی تقسیم کا انداز نہایت ہی غیر تسلی بخش ہو۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں کی زرعی آبادی گھریلو صنعتوں کے بغیر ایک کم سے کم تر معیار کی بھی متمدن زندگی بسر کر سکتی ہے۔ لیکن ملک کی ۸۰ فی صدی آبادی کے اس مسئلے کی طرف آج تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس صورت حال پر جب فی ایکڑ غذائی پیداوار میں کمی کے واقعہ کو پیش نظر رکھ کر غور کیا جاتا ہے تو اس حقیقت سے انکار کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ ملک کی عام آبادی کے معیار زندگی کا گر جانا ناگریز ہے۔

قومی معیشت کے ان رجحانات میں جو خطرات مضمر ہیں، ان کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں ان نتائج کا علم ہو جو معاشی بد حالی اور عدم توازن کی وجہ سے متعدد ممالک میں برآمد ہو چکے ہیں۔

معاشرت

ہمارے تمدن و معاشرت میں تضاد اور بگاڑ پیدا کرنے کی جو پالیسی انگریز نے شروع کی تھی اس پر غیر ملکی آقاؤں کے رخصت ہو جانے کے بعد یہاں کے ارباب اختیار نے پہلے سے بھی زیادہ مستعدی کے ساتھ عمل کیا ہے اور اس میں مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ملک کا تعلیم یافتہ اور صاحب اثر طبقہ خاص طور پر اور عوام عام طور پر مغربی طرز معاشرت اختیار کر لیں تو اس کے بعد اس ملک میں کوئی ایسا نظام قائم نہ کیا جا سکے گا جو موجودہ برسر اقتدار گروہ کی معزولی پر منتج ہو سکے۔ بہر حال حکمران طبقے کے مقاصد سے قطع نظر اس پالیسی سے ہمارے معاشرے میں ایسے تضادات ابھر رہے ہیں، جن کی وجہ سے یہاں تعمیری کام کے امکانات ہی ختم ہوئے جا رہے ہیں۔ اجتماعی فلاح کے پروگرام اور طریق کار میں اختلاف کی نوعیت مختلف ہوتی ہے لیکن جس

معاشرے میں مختلف و متضاد تہذیبی قدریں رواج پا جائیں اور جس ملک کے مختلف طبقات الگ االگ ذہنی وعمرانی فضا میں سانس لینے لگیں اس میں پیدا شدہ معاشرتی کھنچاؤ قوم میں مزاج کی وہ یکسانی اور عمل کی وہ یک رنگی پیدا ہی نہیں ہونے دیتا جو قومی تعمیر و ترقی کے کاموں کے لیے ضروری ہے۔ایسے معاشرے کی تمام قوتیں اور توانائیاں اندرونی کشمکش کی نذر ہو جایا کرتی ہیں۔اور تمدنی انتشار اس کے قوائے فکر و عمل کو شل کر کے رکھ دیتا ہے۔

قوم کی فکری و علمی سطح میں گراوٹ کا اندازہ اس تلخ حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مدرسوں اور کالجوں کا شکل میں غیر ملکی آقاؤں نے کلرک سازی کے جو کارخانے جاری کئے تھے ،وہ اسی طرح قائم ہیں اور یہاں کے نظام تعلیم میں کوئی قابل ذکر اصلاح نہیں کی گئی۔ ہاں یہ بات بالکل نمایاں طور پر دیکھنے میں آ رہی ہے کہ انتظامی حیثیت سے ہمارے تعلیمی اداروں کی حالت پہلے سے خراب تر ہو گئی ہے اور معیار تعلیم غلامی کے دور سے بھی پست ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ فنون لطیفہ کے نام سے حکومت اور حکمران طبقہ کی سرپرستی میں ایسے اداروں کا جال بچھایا جا رہا ہے اور موسیقی اور گانے بجانے کا رواج اس طرح عام کیا جا رہا ہے کہ یہ قوم اب کھلنڈرے افراد کا ایک ایسا گروہ دکھائی دینے لگی ہے جس کا مقصد زندگی محض رنگ رلیاں منانا ہو۔ جو قوم ''طاؤس و رباب'' سے اپنی آزاد زندگی کا آغاز کرے گی اس کے مستقبل کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔اس سلسلے میں قوم کی اس نفسیاتی کیفیت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اگرچہ ہمارے اندر یہ باتیں رواج پا رہی ہیں لیکن چونکہ یہ ہمارے قومی مزاج اور معاشرتی اقدار کے خلاف ہیں اس لیے ہمارے جمہور کے اندر پریشانی کی ایک کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔

عالمی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اگرچہ باحمیت قومیں دوسری قوموں سے علمی استفادہ کر لیتی ہیں اور بعض اوقات نظریات تک بھی مستعار لے لیتی ہیں، لیکن ہر قوم کو اپنی تہذیبی و معاشرتی قدریں صرف عزیز ہی نہیں ہوتیں بلکہ عام طور پر ان کے حق میں ایک قسم کا تعصب تک پایا جاتا ہے۔ قوم میں پائے جانے والے مختلف سیاسی عناصر اور مکاتب فکر آپس میں چاہے جس قدر اختلافات بھی رکھتے ہوں قوم تمدن کے دائرے میں ہمیشہ متحد الخیال رہتی ہے۔ لیکن قد قسمتی سے یہاں اس حصار کو بھی اپنے ہاتھوں سے گرایا جا رہا ہے اور اگر خدانخواستہ یہ حصار پوری طرح منہدم ہو گیا تو اس کے بعد ہمارے قومی تشخص کا بقا ہی جسے مطالبہ پاکستان کا اصل محرک بتایا جاتا تھا، خطرے میں پڑ جائے گا۔

صحیح تشخص کی ضرورت

ہم نے اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بلاشبہ نہایت ہی پریشان کن ہے۔اور عین ممکن ہے بعض حضرات جو اصل حالات کا سامنا کرنے کے بجائے خوش فہمی کی خیالی جنت ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں اسے مایوسی اور قنوطیت (Pessimism) سے تعبیر کریں۔ لیکن ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اصل صورت حال کے کسی ایماندارانہ جائزے کو مایوسی پر نہیں بلکہ حقیقت پسندی پر محمول کرنا چاہئے۔

حالات کا صحیح تجزیہ لازماً مایوسی پر منتج نہیں ہوتا۔اس میں شک نہیں کہ اگر قوم میں اپنی خامیاں دور کرنے، نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے اور اجتماعی تعمیر کے کسی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ خرابیوں کی نشان دہی کے باوجود ان کی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوتی اور نتیجے کے لحاظ سے دونوں حالتیں برابر ہیں۔ چاہے قوم اپنی کمزوریوں کے شعور کے بغیر بے عملی کے مسلک پر قائم رہے اور چاہے اپنے ناگفتہ بہ حالات کا علم حاصل کر کے قنوطیت کا شکار ہو جائے۔ لیکن اگر قوم میں ابھی زندگی کے کچھ آثار موجود ہوں اور اس کے سینے میں تعمیر و ترقی کی تمناؤں کی کچھ چنگاریاں ابھی سلگ رہی ہوں تو ایسی قوم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی خامیوں سے آگاہ ہو کر اصلاح و تعمیر کے لیے کمر ہمت باندھ لے گی۔ ہم ان حضرات کے زاویہ نگاہ اور انداز فکر کو بالکل غلط سمجھتے ہیں جو قوم کو خوش نما خواب دکھا کر اور بے حقیقت امیدیں دلا کر زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ قومیں کبھی خام خیالیوں اور ہوائی قلعوں کی تعمیر کے ذریعے ترقی نہیں کر سکیں۔ اگرچہ ہم محض احساس خطر کو ترقی و تعمیر کا واحد محرک تسلیم نہیں کرتے، لیکن تاریخ عالم میں ایسی ان گنت مثالیں ملتی ہیں کہ اجتماعی سالمیت اور قومی وجود کو کوئی اندرونی یا بیرونی خطرہ لاحق ہونے پر بعض قوموں کے اندر ایسا بے پناہ جذبہ عمل پیدا ہو گیا جو صرف خطرے کے سد باب کا ہی باعث نہ ہوا بلکہ مثبت طور پر نہایت ہی اعلیٰ سطح کے معاشرے یا تہذیب کو وجود میں لانے کا ذریعہ ثابت ہوا۔ ہم اگر اپنی ماضی قریب کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ وقتی طور پر جو بات حصول پاکستان کی جدوجہد کا محرک بنی، وہ برصغیر ہندو پاکستان میں مسلمانوں کی موجودہ بدحالی اور مستقبل میں ہندو کے غلبے کا خطرہ ہی تھا۔ مسلم لیگ کی قیادت نے اپنے پروپیگنڈے کا سارا زور اس پہلو پر صرف کیا اور مسلمان عوام کو باور کرا دیا کہ ایک آزاد مسلمان مملکت قائم نہ ہونے کی صورت میں ان کا دین اور دنیا دونوں

خطرے میں ہیں۔ اگر مسلمانوں کے قبل از تقسیم کے حالات کے اس تاریک پہلو کو واضح کرنے سے اس وقت مسلمانوں میں مایوسی پیدا نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو اس خطرے سے محفوظ کرنے کے لیے کمر ہمت بندھ لی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج اگر قوم کو متنبہ کیا جائے کہ اگر اس نے ہمت و محنت سے کام نہ لیا تو فلاں فلاں خرابیاں اس کو لے ڈوبیں گی تو وہ عمل پر آمادہ ہونے کے بجائے مایوسی کا شکار ہو جائے۔ ہم ان باتوں کو یہ سمجھ کر پیش نہیں کر رہے کہ ان کا شعور حاصل ہونے سے قوم پر مایوسی چھا جائے گی، بلکہ اس توقع کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ اس سے ذہن و قلب سوچنے اور عمل کرنے کی طرف مائل ہوں گے۔ ہماری رائے میں خرابیوں سے اغماض کا تو اس کے سوا قطعاً کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا کہ قوم لاعلمی کی حالت میں ہی ان کے بوجھ کے نیچے دب جائے۔

جب آپ حالات کا تجزیہ کرنے لگیں تو محض مایوسانہ زاویہ نگاہ رکھنے کے الزام یا طعنے سے بچنے کی خاطر آپ کو اصل حالات سے صرف نظر نہ کرنا چاہئے۔ یہ بات صرف اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے ہی نہیں، خلق خدا کو بھی ایک عظیم غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے مترادف ہے اور ظاہر ہے کہ جو قوم اپنے اصل مسائل اور خامیوں سے واقف ہو گی وہ اصلاح و تعمیر کا کوئی کام نہ کر سکے گی۔ اس کا نتیجہ وہی ہو گا جو کسی مریض کے مرض کی صحیح تشخیص نہ کرنے سے برآمد ہوتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ مرض ایک متعدی وبا کی طرح پھیل رہا ہے کہ ہر معاشرتی اور ذہنی سطح کے لوگ اپنی نجی مجالس میں تو قوم کے اندر پائی جانے والی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو گنواتے ہیں لیکن پبلک تقاریر اور بیانات میں ہمارے رہنما قوم کی حالت کا ایسا دل خوش کن نقشہ کھینچتے ہیں جسے اصل کیفیت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ اس طرز عمل کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے سیاست دان اور سیاسی جماعتیں اپنی توجہات کو ہنگامی کاموں اور حصول اقتدار کی جدوجہد پر مرکوز رکھتی ہیں اور قومی مسائل پر غور و فکر کرنے اور رائے قائم کرنے کا انہیں موقع ہی نہیں ملتا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر وہ ان خامیوں کا تھوڑا بہت شعور بھی رکھتے ہوں تو انہیں بیان کرنے کی صورت میں منطقی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے کوئی پروگرام دیا جائے اور اس پر عمل بھی کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مرحلے پر پہنچ کر تعمیر فکر و سیرت اور اصلاح معاشرہ کے ٹھوس لیکن بے مزا کاموں میں الجھنا پڑتا ہے اس لیے ہمارے رہنما اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ قوم کی طرف تو ساری خوبیاں منسوب کر دی جائیں اور یہاں تک بھی کہہ دیا جائے کہ یہ قوم تو اسلام کو اپنانے کے لیے تیار ہے اور اپنے سیاسی حریفوں یا برسر اقتدار گروہ کو شکست

دینے کے لیے ساری خرابیوں کا اصل ذمہ دار انہیں قرار دے دیا جائے اور اس طرح خرابی کے ان اصل اسباب اور ان کو دور کرنے کے طریق سے اعراض اور گریز کیا جائے کیوں کہ ان باتوں کا سامنا کرنے سے تعمیر کا انتہائی کٹھن کام کرنا پڑتا ہے۔

عقل سلیم اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ جس ملک کی سیاسی زندگی پر ایسے لوگ چھائے ہوئے ہوں جن کا مقصد محض حصول اقتدار ہو اور جو اس مقصد کی خاطر ہر قسم کی بے اصولیوں، بداخلاقیوں اور بددیانتیوں کا مظاہرہ کرتے ہوں، اقتدار سے محروم افراد، طائفوں اور جماعتوں کی تو رات دن یہ کوشش ہو کہ کسی نہ کسی طرح ایوان حکومت میں سندیں حاصل کی جائیں اور برسر اقتدار افراد اور طائفوں کی توجہ اور سعی و جہد کا محور اپنی کرسیوں کی حفاظت ہو۔ جس ملک کی معاشی زندگی میں لوٹ کھسوٹ، چور بازاری، ناجائز انتفاع، کنبہ پروری اور اقربانوازی کا دور دورہ ہو اور جس کی معاشرت میں متضاد و متناقض رجحانات کے پرورش پانے کی وجہ سے کش مکش و نزاع کی کیفیت طاری ہو اور پھر ان ساری خرابیوں پر مستزاد یہ کہ ان کی اصلاح کے لیے کوئی باقاعدہ کوشش بھی نہ ہو رہی ہو، اس کے مستقبل کو کس طرح امید افزا اور روشن قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم اس بات کے تو قائل ہیں کہ قدرت نے ہر قوم میں ترقی کرنے کی صلاحیتیں رکھ دی ہیں اور یہ صلاحیتیں ہم میں بھی موجود ہوں گی۔ اور ہم کسی ایسے نظریے پر ایمان نہیں رکھتے جس کی رو سے ترقی کرنے کی صلاحیت و استعداد کا ظہور کسی خاص نسل یا جغرافیائی حالات کی کسی خاص کیفیت سے مشروط ہو، لیکن یہ بات ہماری سمجھ سے بالا ہے کہ ایک قوم اس حالت میں بھی ترقی کرے گی جب کہ وہ ان قوانین کو نظرانداز کر دے جو قدرت کی طرف سے اجتماعی فلاح و بہبود کی شرائط کی حیثیت سے مقرر کر دیے گئے ہیں۔ اور جو ساری انسانی تاریخ پر پورے تسلسل کے ساتھ کارفرما نظر آتے ہیں اور ان طریقوں کو اختیار کرے جو تباہی اور بدحالی کے جہنم میں لے جانے والے ہیں۔

یہ انداز فکر و عمل ہمیں ورثے میں ملا ہے

قومی زندگی کی گزشتہ نو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو ہماری جو کمزوری سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے وہ کسی ایسے متعین قومی مقصد کا فقدان ہے جس کا قوم کو پوری طرح شعور ہو اور جس پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس میں پوری آمادگی بھی پائی جاتی ہو۔ یہ بات ایک بنیادی خرابی کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور سیاسی، معاشرتی اور معاشی دائروں میں ہم نے جو خرابیاں گنوائی ہیں، ان کی علت بھی یہی ہے لیکن ہمارے لیے بے مقصدیت کی یہ کیفیت نہ غیر متوقع ہے اور نہ باعث حیرانی۔ ہم نے اس حصے کے باب اول میں قومی مزاج اور سیاست کے ارتقاء کے جن خطوط کی نشان دہی کی ہے ان سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ فی الحقیقت اس ملک کے عوام یا قیادت نے آج تک کسی ایسے قومی مقصد کو اپنایا ہی نہیں جو قومی تعمیر و ترقی کا کام انجام دینے کے لیے مفید ہوتا۔ غلامی کے دور میں جو قیادت ابھری وہ قومی مقصد سے ہی خالی الذہن نہ تھی بلکہ مزاج اور سیرت و کردار کے اعتبار سے وہ کسی مقصد کو اپنانے کی سرے سے کوئی اہلیت ہی نہ رکھتی تھی۔ اس قیادت نے قوم کے سامنے پاکستان کی شکل میں ایک خطہ زمین کے حصول کو ایک مقصود بالذات شے کی حیثیت سے رکھا اور قوم نے اس کا ساتھ دیا۔ جب یہ خطہ زمین حاصل ہو گیا تو اس میں زندگی کی عمارت تعمیر کرنے کا چونکہ کوئی نقشہ ہی عوام یا قیادت کے سامنے موجود نہ تھا اس لیے ہمارا معاشرہ بدستور انحطاط کے راستے پر پیش قدمی کرتا چلا گیا اور تعمیر کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ اجتماعی زندگی کی یہ ایک نہایت ہی اہم خصوصیت ہے کہ اگر اس میں تعمیر نہ ہو رہی ہو تو ''خانہ خالی را دیو می گیرد'' کے مصداق اس خلا کو تخریبی قوتیں پر کیا کرتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی تحریک کے دوران رہنماؤں نے بھی یہی دعوی کیا تھا اور قوم نے بھی اسی توقع کے تحت اس تحریک کا ساتھ دیا تھا کہ پاکستان میں اسلام کو برپا کیا جائے گا اور ہماری اس رائے کو کہ پاکستان کی تحریک میں کوئی نظری و فکری مقصدیت موجود نہ تھی، بعض حضرات خلاف واقعہ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ مقصد کے تعین کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بغیر سمجھے بوجھے محض ایک نعرے کی حیثیت

سے کسی نظریے کو سامنے رکھ لیا جائے۔ کسی مقصد یا اجتماعی زندگی کے سلسلے میں کسی آئیڈیالوجی کو اپنانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کا فکر اور قدریں آپ کے ذہن و کردار پر غالب آجائیں اور آپ اسے زیر عمل لانے کی جدوجہد کے تمام مراحل کا شعور حاصل کر کے اس کی تنفیذ پر کمربستہ ہو جائیں۔ چاہے حالات کی پیچیدگیوں اور کٹھن مشکلات کی وجہ سے آپ فوراً اپنی زندگی کو اس نظریے کے رنگ میں پوری طرح نہ رنگ سکیں لیکن دیکھنے والے یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ آپ قومی تعمیر کے فلاں نظریے اور ضابطے کے حامی اور اسے اپنانے کے لیے رات دن کوشاں ہیں۔ چاہے آپ ابھی اپنے سفر کے ابتدائی مراحل ہی طے کر رہے ہوں، لیکن کسی کو آپ کی منزل کے متعلق کوئی شبہ نہ ہو۔ جہاں تک پاکستان کی تحریک کا تعلق ہے، اس کے رہنماؤں کی زندگیاں آپ کے سامنے ہیں اور اگر تقسیم سے قبل ان کے ذہن و فکر اور سیرت و کردار کے کسی گوشے پر کوئی پردہ پڑا ہوا تھا تو قیام پاکستان کے بعد یہ سب پردے چاک ہو چکے ہیں۔ اور اب کوئی صاحب ہوش انسان اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ یہ قیادت کسی نظریے یا مقصد سے پہلے کوئی معمولی سے معمولی لگاؤ رکھتی تھی یا اب رکھتی ہے۔ اسی طرح ہمارے قومی مزاج اور اجتماعی سیرت کے متعلق بھی اب کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اجتماعی حیثیت سے تحریک پاکستان کے دوران ہم نے اسلام کو کبھی بھی نہ اپنایا تھا۔ فی الحقیقت اس تحریک کا مقصد محض ایک خطہ زمین کا حصول تھا۔ جس مقصد کے لیے قوم نے جدوجہد کی وہ اسے حاصل ہو گیا، لیکن جب قومی تعمیر کا کوئی مقصد پیش نظر ہی نہ تھا تو آخر اجتماعی فلاح و بہبود کا کام ازخود کس طرح انجام پا جاتا۔ دراصل تقسیم سے قبل یہ توقع ظاہر کی گئی تھی اور قوم کو بھی یہی باور کرایا گیا تھا کہ ہمارے اجتماعی دکھوں کا علاج ایک خطہ زمین کا حصول ہے۔ یہ ہماری سطحیت فکر کی ایک بہت ہی نمایاں علامت ہے اور قوم کے اندر سوچنے کا یہ انداز اس قدر پختہ ہو گیا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہم نے اس کا متواتر مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالع آزما سیاست دانوں، مذہبی رہنماؤں اور حکمرانوں کا ہر گروہ جب بھی چاہتا ہے اپنے اپنے مفاد کے پیش نظر کسی نہ کسی جزوی مسئلے کو قوم و ملک کی تمام مشکلات کے حل کی حیثیت سے پیش کر دیتا ہے۔ اس قسم کے جو مسائل اٹھائے جاتے ہیں چاہے اپنی اپنی جگہ وہ کتنے ہی اہم ہوں لیکن کوئی ایک مسئلہ ساری زندگی کے ہم معنی نہیں ہوتا اور اگر اجتماعی تعمیر کا کام مطلوب ہو تو کسی ایسی سکیم کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے جو زندگی کے سارے گوشوں کو محیط ہو۔

ہمارے ہاں فکری عدم توازن اور ایک رخے پن کا یہ مرض وبائی شکل اختیار کر گیا ہے، اور قومی زندگی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کی اہمیت و نوعیت کو متعین کرنے میں ہم نے ہمیشہ شدید قسم کی بے اعتدالی اور خود فریبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر کہ و مہ کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کسی چوراہے پر کھڑا ہو کر کوئی ایک نعرہ بلند کر دے اور قوم کو یہ باور کرا دے کہ ہمارے جملہ امراض کا علاج یہی ہے۔ حالانکہ آج تک ساری تاریخ انسانی میں ہمیں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم نے کوئی ہلکا سا نسخہ استعمال کر کے اپنے اندر پائی جانے ولی خرابیوں سے نجات حاصل کر لی ہو اور ترقی و تعمیر کے راستے پر چل پڑی ہو، لیکن یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہماری قوم میں پائے جانے والے مختلف سیاسی و دینی عناصر نے ہمیشہ یہی کھیل کھیلا ہے کہ جب وہ کسی مسئلے کو اٹھاتے ہیں تو قوم کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے بگٹٹ اسی راستے پر چل دو اور پھر دیکھو کہ تمہاری تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔ سادہ لوح عوام —— جو عام طور پر قوم و ملک کی فلاح کے معاملے میں مخلص ہوا کرتے ہیں —— ہر راہ رو کے ساتھ تھوڑی دور چلتے ہیں۔ وہ راہ رو جب شہرت و ناموری یا اقتدار و قوت کے سفلی اور مادی مقاصد حاصل کر لیتا ہے تو قوم کے درد کا نقاب اتار پھینکتا ہے اور قوم بے چاری ایک بار پھر چوراہے پر کھڑی کسی اور راہبر کا انتظار کرنے لگتی ہے۔ ہماری قومی زندگی کا موجودہ دور اسی نوعیت کے واقعات پر مشتمل ہے۔

ہم ایک بار پھر تحریک پاکستان کی مثال کی طرف ہی پلٹتے ہیں کیوں کہ اس کو چلانے کے طریق کار کے نتائج سے ہم اس وقت دو چار بھی ہیں اور اس سے سبق حاصل کرنا بھی ہمارے لیے بہت آسان ہے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے عددی تناسب اور ان دونوں قوموں کے تعلقات کے تاریخی و سیاسی پس منظر میں ہر مسلمان کی یہی آرزو ہو سکتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہندو کے غلبے کے امکانات کو ختم کیا جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی خطہ زمین کا حصول تعمیری و اصلاحی پروگرام کا قائم مقام تو نہیں ہو سکتا۔ کسی قوم کے لیے جہاں آزادی کی فضا میں رہنے کے لیے ایک خطہ زمین کی ضرورت ہوتی ہے وہیں اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کے لیے اس کے پاس کچھ اصول و نظریات بھی ہوں اور وہ ان اصول و نظریات پر عمل پیرا ہونے کے لیے سیرت و اخلاق کی کچھ قدریں بھی رکھتی ہو جو اس کے رگ و ریشے میں اتر چکی ہوں۔ مجبوری یہ ہے کہ قدرت نے یہی قانون بنا رکھا ہے کہ اگر باعزت و باوقار زندگی مقصود ہو تو ہر غلام یا پس ماندہ قوم بیک وقت ان دونوں مقاصد کے لیے کوشش کرے۔ یعنی جہاں وہ آزادی و استقلال کے لیے سعی

وجہد کرے وہیں حصول آزادی کے بعد کا نقشہ کار بھی مرتب کرے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے اپنے اندر کم سے کم ضروری صلاحیت کار لازماً پیدا کرے۔ اگرچہ اس نقطہ نظر میں بعض حضرات ناراضی کا اظہار کرنے لگتے ہیں لیکن اس سے قبل انہیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ طرز استدلال پاکستان کے نظریے کی مخالفت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس سے مقصد صرف یہ ہے کہ تحریک پاکستان کو چلانے کے سلسلے میں ایک ایسی کوتاہی کی نشان دہی کی جائے جس کے نتائج اب سب کے سامنے ہیں۔ ہم یہاں یہ گفتگو محض اپنے کسی شوق کو پورا کرنے کے لیے نہیں کر رہے بلکہ دقت یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات کا کوئی تجزیہ اس ملک کے وجود میں آنے کے حالات کو نظر انداز کر کے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ تقسیم ملک کے حالات ہمیں ابھی تک پوری شدت کے ساتھ متاثر کر رہے ہیں۔ دوسرے ان حضرات کو یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ قومی تعمیر کے لیے زندگی کے کسی ضابطے پر باقاعدہ ایمان ایک ایسے قاعدے اور قانون کی حیثیت رکھتا ہے جو قدرت نے مقرر کر رکھا ہے اور جس کے سلسلے میں قدرت نے کسی قوم سے کبھی رعایت نہیں برتی نہ ایسے قوانین وضع کرتے وقت اس نے کسی سے مشورہ کیا تھا۔ اور نہ آج کوئی قوم ان غیر متبدل قوانین سے روگردانی کر کے اپنی خواہش و تمنا کے باوجود اس کے منطقی نتائج سے بچ سکتی ہے۔

پاکستان کے عالم وجود میں آجانے کے بعد بھی ہم نے یک رخے پن اور خام خیالیوں کی اس عادت کو ترک نہیں کیا اور آج بھی ہماری یہی روش ہے کہ مختلف قومی مسائل کو ان کے صحیح مقاصد پر رکھنے اور انہیں ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنے کے بجائے ان کے معاملے میں ہم انتہائی غلو سے کام لیتے ہیں۔

وحدت مغربی پاکستان

اگرچہ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ابھی حال ہی میں مغربی پاکستان کے صوبوں کو مدغم کر کے ایک صوبے کی شکل دینے کا جو کارنامہ انجام دیا گیا ہے اس میں ہمارے اس مزاج کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ انتظامی نوعیت کے اس فعل کو پاکستان کے تمام دکھوں کا مداوا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا اور یہ دعویٰ کر ڈالا گیا کہ اخراجات کو کم کرنے، صوبائی تعصّبات اور کشمکش اقتدار کو ختم کرنے، معاشی اور معاشرتی بہبود کی سکیموں کو جامہ عمل پہنانے اور اس خطے کو سیاسی و انتظامی استحکام بخشنے کے لیے یہ تجویز اکسیر کا حکم رکھتی ہے لیکن بد قسمتی سے ان میں سے ایک توقع بھی پوری نہیں ہوئی اور جو خرابیاں الگ الگ صوبوں میں موجود تھیں وہ ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے فطری خطوط پر پروان چڑھ رہی ہیں۔ ہم یہ

نہیں کہنا چاہتے کہ صوبوں کے ادغام کی سکیم میں بذات خود کوئی خرابی تھی بلکہ اس کے برعکس ہمارا رجحان یہ ہے کہ بذات خود یہ ایک اچھا اقدام تھا۔ لیکن چونکہ یہاں ہر اچھا کام بھی ذاتی اور گروہی مفادات کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے اس لیے ملک اس کے ممکنہ نتائج حسنہ سے محروم رہتا ہے۔ اس سلسلے میں جس بات کی طرف ہم ناظرین کو خاص طور پر متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور جسے ثابت کرنے کے لیے ہم نے یہ مثال پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسے اقدام کو جو محض انتظامی نوعیت کا تھا اور جس میں اس نقطہ نظر سے جو خوبیاں بھی ہوں لیکن وہ کوئی نظری اور فکری اہمیت نہ رکھتا تھا اس انداز سے پیش کیا گیا کہ جیسے پاکستان کے بقاو استحکام کا انحصار بھی اسی پر ہے اور آئندہ کے تعمیری کام کی بنیاد بھی اسی سے فراہم ہو گی۔ حالانکہ کون نہیں جانتا کہ دنیا کے متعدد ممالک میں وحدانی نظام رائج ہے اور کرہ ارض پر بہت سے ایسے ممالک بھی موجود ہیں جو درجنوں صوبوں میں تقسیم ہیں لیکن آج تک کسی نے یہ عجیب وغریب نقطہ نگاہ پیش نہیں کیا کہ اس قسم کے کسی انتظامی معاملے پر قوم کی بقاو تعمیر کا انحصار ہے۔ ایسے معاملات میں مختلف مصالح کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور ہر ملک میں وحدانی نظام قائم کرنے یا اسے مختلف اکائیوں میں تقسیم کر دینے کی بعض تاریخی، لسانی، نسلی یا معاشرتی وجوہ ہوتی ہیں لیکن کسی ایک مصلحت کو سامنے رکھ کر جو اقدام کیا جائے گا اسے ساری زندگی کی اساس قرار نہیں دیا جاتا۔ لیکن یہاں اجتماعی زندگی کے تمام دوسرے کاموں کو نظر انداز کر کے کئی ماہ تک اس ایک مسئلے کو مرکز توجہ بنائے رکھا گیا۔

نت نئی وزارتیں

خام فکری اور یک رخے پن کی ایک اور مثال یہ ہے کہ وزارتی حلقوں میں چند ہاتھوں کی تبدیلی کے ساتھ بار بار بہت سی توقعات وابستہ کی گئی ہیں۔ پارلیمانی زندگی میں عدم استحکام کی وجہ یہاں وزارتیں تو آئے دن بدلتی رہتی ہیں، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی نیا گروہ برسر اقتدار آتا ہے ملک کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر دی جاتی ہے۔ حکومت کے نشر و اشاعت کے تمام وسائل قوم کو یہ باور کرانے پر لگا دیے جاتے ہیں کہ اب ہماری تمام مشکلات کا علاج ہو جائے گا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ گروہ ناکامیوں سے ہمکنار ہوتا ہے اور اونچے حلقوں میں حالات کے الٹ پھیر سے کوئی دوسرا دھڑا مسند حکومت پر بیٹھ جاتا ہے۔ اب یہ دھڑا پروپیگنڈے کے سارے ذرائع کو اس بات کی اشاعت پر لگا دیتا ہے کہ سابق حکمران ناکارہ قسم کے لوگ تھے۔ اب جو نئے لوگ آئے ہیں ان سے بجا طور پر اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان تمام ہنگاموں میں یہ سوال کبھی بھی نہیں اٹھایا جاتا کہ یہ مختلف گروہ معجزات کے ذریعے اصلاح و تعمیر کا کام کریں گے یا ان کے پاس اسے انجام دینے کا کوئی

پروگرام بھی ہے۔ نہایت ہی مضحکہ خیز اور بودے استدلالات کے ذریعے ہر نئے گروہ کے متعلق رجائیت پسندانہ خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس طرح بے بنیاد امیدوں اور تباہ کن مایوسیوں کے وقفے پے در پے آتے رہتے ہیں اور یہ بے مقصد قافلہ منزل اور راستے کے تعین کے بغیر آوارگی میں مصروف اور غیروں کے طعن اور مضحکہ کا ہدف بنا ہوا ہے۔

اصل صورت یہ ہے کہ آج تک اس ملک میں کوئی گروہ یا جماعت ملک کے سامنے اپنا پروگرام پیش کرکے برسراقتدار نہیں آئی۔ انتخابات میں عام طور پر افراد کو اپنے ذاتی اثر ورسوخ کے ذریعے کامیابی ہوتی ہے اور مرکز یا صوبوں میں جو وزارتیں بنتی ہیں وہ محض جوڑ توڑ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جماعتوں کے علاوہ ان وزارتوں کے درجنوں ارکان میں سے کسی ایک ایسے فرد کی مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ اجتماعی زندگی کے متعلق کوئی فکر رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جسارت کا یہ عالم ہے کہ بدترین ذرائع اختیار کرکے برسراقتدار آنے والی وزارت کے متعلق بھی یہ اعلان کر ڈالا جاتا ہے کہ یہ قوم کو ترقی کے نصف النہار پر لے جائے گی۔

یہ طرز عمل ہماری خام فکری اور سطحیت کی کیفیت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

حصہ دوم

تمہید

متحدہ ہندوستان میں پاکستان کے مطالبے کی بنیاد اس تصور نے فراہم کی تھی کہ مسلمان قوم چونکہ اسلام کی شکل میں اپنی مخصوص کائناتی، تمدنی، اخلاقی اور سیاسی اقدار رکھتی ہے لہٰذا اس کے لیے ہندو اکثریت کے ساتھ مل کر ایک نظام کے تحت رہنا مشکل ہوگا اور اس قوم کے لیے ایک ایسا خطہ زمین حاصل کرنا ناگزیر ہے جہاں وہ اپنی ان اقدار کو آزادی کے ساتھ اپنا سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ حصول آزادی کے بعد اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے نافذ کرنے کے لیے شروع ہی سے فکر اور تعمیر سیرت کے دائروں میں جس تیاری کی ضرورت تھی اس کو ملحوظ نہ رکھا گیا لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تحریک پاکستان کے دوران اسلام کو اسی حیثیت سے برپا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ نیز پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی قائداعظم سے لے کر حکمران جماعت کے مقامی کارکنوں تک نے پے در پے اعلانات کئے کہ اس ملک میں اسلام ہی نافذ کیا جائے گا اور ہم اپنی اجتماعی زندگی اسی کے اصولوں کے مطابق استوار کریں گے۔ ہماری اجتماعی زندگی کے رجحانات اور حکمرانوں کے اعلانات میں پائے جانے والے تضاد سے انسان یہ تاثر تو لیتا ہے کہ اس ملک کی قیادت نے بہت بڑی جسارت اور قوم نے انتہائی سادہ لوحی کا ثبوت پیش کیا ہے لیکن ہم نے حصہ اول میں قوم اور قیادت کی جس ذہنی و شعوری حالت کی نشان دہی کی ہے اس کے تحت یہ بات حیرانی کا باعث نہیں ہو سکتی کہ قیادت اتنے طویل عرصے تک کے لیے قوم کو ایک اتنا بڑا چکمہ دینے میں کامیاب ہو گئی۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز پوزیشن اور کون سی ہو سکتی ہے کہ ایک جماعت اصولوں کے ایک متعین ضابطے پر عمل کرنے کے وعدے کے ساتھ برسر اقتدار آتی ہے لیکن اختیارات سنبھالنے کے بعد اس ضابطے کے کسی ایک اصول کو بھی نہیں اپناتی اور اس کے باوجود شور مچاتی چلی جاتی ہے کہ ہم اس پورے کے پورے ضابطے کو اپنائیں گے۔ آپ تصور کیجیے کہ اگر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روسی کمیونسٹ پارٹی اشتراکیت کے اصولوں کو نہ اپناتی تو کیا تاثر قائم ہوتا۔ فی الحقیقت یہاں بار

بار اعلانات کرنے کی ضرورت بھی اسی تضاد کے شعور کی وجہ سے محسوس ہوئی ورنہ اگر حصول آزادی کے اول روز ہی سے اسلام کے اصول کو ایک مناسب تدریج کے ساتھ زیر عمل لانا شروع کر دیا جاتا تو دنیا خود ہی دیکھ لیتی کہ ہم کس راستے پر جا رہے ہیں، لیکن یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ایک عرصے سے مسلمان ملت کے معاملات اسی طرح چل رہے ہیں۔ قول اور فعل کے تضاد کو اس ملت میں صدیوں سے برداشت کیا جا رہا ہے۔ اس ملت نے عقیدہ اسلام کو ہمیشہ ایک مکمل ضابطہ زندگی تسلیم کیا ہے، لیکن اس کے باوجود زندگی کو مختلف حصوں میں بھی تقسیم کیا ہے اور عمل کے لحاظ سے جب بھی کوئی اہم اور فیصلہ کن موقع آیا ہے مفاد پرست رہنما ـــــ جن میں دینی بزرگ اور سیاست دان دونوں شامل ہیں ـــــ ہمیشہ اسلام کے اصولوں اور اس کو برپا کرنے کے طریق کار کی ایسی ایسی تشریحات و توضیحات کرتے رہے ہیں جس سے ملت بد راہ ہوتی رہی ہے[6]۔ چنانچہ پاکستان کی تحریک کے دوران یہ عجیب و غریب فلسفہ پیش کیا گیا کہ قائداعظم اور مسلم لیگ تو مسلمانانِ ہند کے وکیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہے کہ وکیل اپنے موکل کے جملہ تصورات کو اپنائے۔ اسے تو صرف اپنے موکل کے مقدمے کی بنیادوں سے اتفاق کرنا چاہئے۔ لٰہذا اگر قائداعظم اور مسلم لیگ پاکستان کی تحریک کو چلانے کے لیے اسلامی اصولوں کو ملحوظ رکھیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ کوتاہ بینی اور سطحیت فکر کی اس سے بڑی مثال ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتی۔ دنیا کی تاریخ میں آج تک یہ فلسفہ پیش کرنے کی کسی نے جسارت نہیں کی کہ کسی ضابطہ زندگی کی تنفیذ کا عزم کرنے کے باوجود اگر تحریک کے علمبردار اس کے اصولوں کو ملحوظ رکھیں تو یہ بات قابل اعتراض نہیں ہے۔ ہماری رائے میں اس نظریے کے کھوکھلا پن کے متعلق اب گفتگو کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ پاکستان کی گزشتہ نو سال کی تاریخ وہ نتائج سامنے لے آئی ہے جو اس قسم کے انداز فکر سے برآمد ہو سکتے ہیں۔

---

[6] اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے ہم ماضی کی تاریخ سے بھی بہت سی مثالیں دے سکے ہیں، لیکن یہاں اس مسئلے پر تفصل سے گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ اس کتاب کا موضوع خالصتاً اسلام یا اس کے کسی ایک پہلو سے متعلق نہیں ہے۔ ہم صرف پاکستان میں تعمیر و ترقی کا امکانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ چونکہ پاکستان کے مسلمانوں نے قیام مملکت سے قبل اسلام کو اپنانے کا اعلان کیا تھا اور اب دستوری زبان سے بھی اعلان کی توثیق ہو گئی ہے۔ اس سے پاکستان کی تعمیر و ترقی سے متعلق کسی گفتگو میں اسلام کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن اس ضمن میں ہم اتنی ہی گفتگو کریں گے، جو وضاحت مدعا کے لیے ناگزیر ہو۔

لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ کے اس اہم ترین واقعہ سے بھی سبق حاصل نہیں کیا بلکہ ہمارے فکر و مزاج کی بنیادی خرابی ہمیں ہر مرحلے پر بدراہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ جب پاکستان وجود میں آگیا تو زندگی کے سارے شعبوں میں غیر اسلامی حرکات کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کو ہمیشہ یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ اسلامی دستور بن رہا ہے، جب اسے مکمل کر لیا جائے گا تو ہمارے تمام معاملات اسلام کے زیر اثر آ جائیں گے۔ گویا ان حضرات کا فلسفہ یہ تھا کہ اس وقت تو ہمیں غیر اسلامی حرکات کرنے دیجئے۔ جب دستور بنے گا تو ہم فوراً قبلہ رو ہو جائیں گے۔ یہ تو تھا حکمرانوں کا انداز استدلال۔ دینی حلقوں نے یہ نرالا فلسفہ ایجاد کیا کہ اگر کتاب آئین میں قرآن و سنت کو ماخذ قوانین مان لیا جائے تو گویا اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ وہی سابقہ مصنوعی طریقہ۔ فی الحقیقت یہ تصور کہ ''چاہے قوم جس روش پر چلے اور اس میں فکر و کردار کے اعتبار سے جس قسم کی قدریں بھی رواج پا جائیں اسلامی دستور مرتب ہو جانے پر اسلامی نظام برپا ہو جائے گا'' اس انداز فکر سے کہ ''تحریک پاکستان کو غیر اسلامی خطوط پر چلانے کے باوجود پاکستان میں اسلامی نظام برپا ہو سکتا ہے'' کسی طرح بھی مختلف نہیں ہے۔

اگرچہ ان دونوں باتوں کو کسی مکتب فکر کے حامیوں نے بھی بعینہ ان الفاظ میں پیش نہیں کیا لیکن جس قسم کے دلائل سے کام لیا جاتا رہا ہے اور جو روش اختیار کی جاتی رہی ہے اس سے عمل انہی دو نظریات پر ہوا ہے۔ جب آپ کسی نظام کو جامہ عمل پہنانے کا دعویٰ تو کریں لیکن اس کے لیے نہ موزوں طریق کار اپنائیں اور نہ اس نظام کے ان حصوں پر عمل کریں جو جدوجہد کے دوران ہی زیر عمل لائے جا سکتے ہوں تو لا محالہ یہی کہا جائے گا کہ آپ کسی نظام کے اصولوں کو پامال کرنے کے باوجود اسے برپا کرنے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس طرح جب قوم مخالف سمت میں جا رہی ہو اور حکمران بھی اسے اسی راستے پر لئے جا رہے ہوں تو محض تدوین دستور پر اپنی تمام تر توجہات صرف کر کے یہ کہنا کہ کسی نہ کسی طرح دستور ان اصولوں کے مطابق بنوالو۔ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ یہ اصول یہاں ایک ضابطے کی حیثیت سے رائج بھی ہو جائیں گے۔ اسی تصور کے مترادف ہے کہ معاشرہ چاہے جس راستے پر بھی جا رہا ہو، نرا دستور ہی کسی نظام کی تنفیذ کا ضامن ہو سکتا ہے۔

اس انداز فکر کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ تکمیل دستور کے موقع پر مختلف سیاسی اور دینی حلقوں نے نہایت ہی خوش آئندہ توقعات کا اظہار کیا ہے اور اگرچہ بعض حلقوں نے بعض خامیاں بھی گنوائی ہیں لیکن توقع سب نے ظاہر کی ہے کہ اس سے اسلامی نظام برپا ہو سکے گا۔ اس کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ دینی حلقوں نے متواتر یہ

انداز گفتگو اختیار کر رکھا ہے کہ اگر حکمران چاہیں تو اسی دستور کے تحت اسلام کے اصول اس ملک میں نافذ کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرز استدلال سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی متعین نظام کو نافذ کرنے کے سلسلے میں یہاں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ موجودہ حالات کو سامنے رکھ کر آئندہ کے امکانات کا جائزہ لیں اور یہ واضح کرنے کی کوشش کریں کہ موجودہ فکر و کردار کے ساتھ معاشرے کو کسی صحت مند سانچے میں ڈھالنا اور اجتماعی حیثیت سے ترقی کرنا قوم کے لیے کس حد تک ممکن ہے۔

اس کے لیے ہمیں کسی ملک کے اجتماعی نظام اور اس میں دستور کے مقام و اہمیت کی توضیح کسی قدر تفصیل کے ساتھ کرنا ہوگی اور یہ بیان کرنا ہوگا کہ ملکی نظام میں دستور کیا کردار (Role) ادا کرتا ہے۔ کسی ملک کی اجتماعی زندگی میں تعمیر کے کسی متعین پروگرام (اس بات سے قطع نظر کہ اس کی اساس اسلام نے فراہم کی ہو یا کسی اور آئیڈیالوجی نے) کو اپنانے کی کیا شرائط ہوتی ہیں ہم اس گفتگو کے دوران ایسے اصول بیان کریں گے، جن کی کارفرمائی قومی تعمیر کے ہر پروگرام میں یکساں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اس میں کسی ایک نظام کی کوئی تخصیص نہیں۔ اور قدرت کے ہر ابدی اور مستقل قانون کی طرح ہمیں پاکستان میں بھی ان اصولوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اگر ان اصولوں کو نظر انداز کیا جائے گا تو صرف یہی نہیں کہ اسلام یہاں برپا نہ کیا جا سکے گا بلکہ قومی تعمیر کے کسی منصوبے اور نظریے پر بھی عمل نہ ہو سکے گا۔

قیام نظام[۷] کی شرائط

دور حاضر کے کلیت پسندانہ رجحانات

انسان کی اجتماعی زندگی کے ارتقاء کے موجودہ مرحلے سے قبل کسی حد تک یہ ممکن تھا کہ زندگی کے مختلف شعبوں کو الگ الگ خطوط پر ترقی دی جائے۔ اقتدار وقت اپنی سرگرمیوں کو عام طور پر نظم وضبط کے قیام اور ملک کو کسی اندرونی سازش اور بیرونی حملے سے محفوظ کرنے تک محدود رکھتا تھا۔ قوم کی فکری قیادت اور معاشرے کو کسی خاص سانچے میں ڈھالنے کا کام کچھ دوسرے ہی لوگ کرتے تھے اور ضروری نہ تھا کہ انہیں حکومت کی سرپرستی حاصل ہو۔ لیکن جب سے یورپ میں صنعتی انقلاب آیا ہے سائنس کی ایجادات نے ''فاصلے'' کی رکاوٹ کو دور کرکے کرہ ارض کے دور افتادہ خطوط کو باہم مربوط کر دیا ہے اور طباعت واشاعت کی وسیع سہولتوں نے مختلف معاشروں کے درمیان افکار وخیالات کے تبادلے کے بے پناہ ذرائع مہیا کر دیے ہیں۔ نتیجتاً جہاں ساری دنیا کے باشندوں میں رابطہ بڑھ گیا ہے اور حالات اقوام عالم کو سیاسی حیثیت سے ایک لڑی میں پرونے کا تقاضا کر رہے ہیں وہیں قومی ریاستوں میں کچھ اس قسم کے کلیت پسندانہ (Totalitarian) رجحانات پیدا ہو رہے ہیں کہ زندگی کے سبھی شعبوں کا انتظام وانصرام کسی نہ کسی جامع نظریے کے تحت ایک مرکز سے ہونے لگا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ حکومت واقتدار کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ مختلف نظاموں کے درمیان مرکزیت کی نوعیت وشدت میں درجے کا فرق تو پایا جاتا ہے لیکن کلیت پسندانہ میلانات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ ایک طرف دنیا کے بہت سے ممالک میں ایسے نظام قائم ہو چکے ہیں جن کے نزدیک معاشرے کی فلاح کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کے تمام گوشوں پر ایک قاہرانہ اقتدار

---

[۷] ہم یہ بات آغاز گفتگو میں ہی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ''نظام'' سے ہماری مراد قوم کی ہمہ جہتی تعمیر وترقی کا ایسا نقشہ ہے جو انسانی زندگی سے متعلق متعین اصولوں کی روشنی میں مرتب کرکے نافذ کی جائے۔ یہ لفظ ہر جگہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حاوی ہو اور فرد کی شخصیت جماعت یا قوم میں پوری طرح فنا ہو جائے اور دوسری طرف معاشرے کے مقابلے میں فرد کو اصولی حیثیت سے آزادی دینے کی متمنی قومیں، جو اول الذکر گروہ اقوام کی کلیت پسندی کو ختم کرنے کے لیے مضطرب اور سرگرم عمل ہیں اور اپنی بیشتر توجہات اور صلاحیتیں اس میں کھپا رہی ہیں۔ بتدریج خود اس سمت میں پیش قدمی کر رہی ہیں اور ان میں روز بروز حکومت کے اختیارات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً جب کسی بڑی آفت کا، چاہے وہ جنگی حالت ہو یا کوئی اندرونی بحران، سامنا کرنا پڑتا ہے تو جمہوریت پسند اقوام بھی معاشرے کے سارے وسائل سے انتفاع کے لیے ایک ایسا نظم برپا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں جس کے تحت اجتماعی زندگی کو مشین کی طرح ایک مرکزی نکتے سے اپنی مرضی کے مطابق چلایا جا سکے۔ اگرچہ اس قسم کے اختیارات عام طور پر جمہوری ممالک میں ہنگامی حالات کے تحت حاصل کئے جاتے ہیں لیکن حالت امن و اعتدال قائم ہو جانے کے بعد ہنگامی حالات کے اثرات اس طرح باقی رہ جاتے ہیں کہ پہلی حالت کا بعینہ عود کر آنا ممکن نہیں رہتا اور اقتدار کے لیے ہنگامی حالات کے نام پر حاصل کردہ اختیارات کے ایک حصے کو مجبوراً اپنے ہاتھ میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس طرح ہر عالمی یا قومی حادثہ جمہوری ممالک کو بھی کلیت پسندی کی طرف پیش قدمی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

چونکہ ہمارے لیے یہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ اس رجحان کے اسباب پر بحث کر سکیں اور ان تمام عوامل کا تجزیہ کر سکیں جو اس کے پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں اس لیے اس کی حمایت یا مخالفت میں کوئی رائے دیئے بغیر ہم اس کلیت پسندانہ رجحان کو صرف ایک واقعہ کی حیثیت سے ہی بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ نیز اس موقع پر جب کہ ایٹمی توانائی کے انکشاف نے اس کرے پر سرے سے انسان کے مستقبل کو ہی مخدوش بنا دیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ایٹم کی بے پناہ قوت نظم حکومت کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سنبھالنے پر مجبور کر دے گی یا فرد کو معاشرے کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ آزادی دلوا کر معاشرے کے نظم کو برقرار رکھنے کے وسائل مہیا کر دے گی، ان کلیت پسندانہ رجحانات کے مستقبل کے امکانات پر مضبوط فکری بنیادوں پر پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ اس قسم کی ہر کوشش لا محالہ انتہائی طور پر ظنی نوعیت کی ہو گی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج تک سائنس کی ترقی نے کلیت پسندانہ رجحانات کو ہی تقویت دی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تسخیر عناصر کی بظاہر بے پایاں قوت حاصل کرنے والا انسان خود اپنے ہی معاشرے کے ہاتھوں مسخر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

دو خصوصیات

بہر حال اس حقیقت کے بیان کرنے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں کہ آج کے حالات میں قومی تعمیر کے کسی پروگرام میں دو خصوصیات کا پایا جانا اشد ضروری ہے۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ قوم کے پاس کوئی ایسا نظام فکر (Ideology) موجود ہو جو دور حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قومی زندگی کے تمام شعبوں کو ایک جامع سکیم کے تحت منظّم کر سکے۔

اور دوسری خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ قوم کے اندر اس نظام کو نافذ کرنے کی آمادگی اور صلاحیت موجود ہو۔

ہم یہ بات واضح کر دیں کہ یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ آپ کوئی نیا نظام اپناتے ہیں، یا دنیا کے کسی چلتے ہوئے نظام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ ان میں سے ہر صورت کے تقاضوں میں کچھ نہ کچھ فرق لازماً ہو گا لیکن ہمارا دعوی صرف یہ ہے کہ اصولی حیثیت سے آپ کے اندر ہر حالت میں ان دو خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ ان دونوں خصوصیات کی کچھ وضاحت کر دیں۔

پہلی خصوصیت

آج تک دنیا میں جتنے قابل ذکر معاشرے اور تہذیبیں ابھری ہیں، ان میں سے ہر ایک نے اس کائنات، اس کی تخلیق، اس میں انسان کی حیثیت اور انسانی زندگی کے مستہائے مقصود اور انجام کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور قائم کیا ہے۔ فی الحقیقت انہی تصورات نے ہر معاشرے اور تہذیب کی بنیادیں فراہم کی ہیں اور ہر نظام فکر کا نکتہ آغاز یہی تصورات ہوتے ہیں۔ انہی کی اساس پر تمام علوم مرتب ہوتے ہیں اور تحقیق و مطالعہ اور علوم طبعی کی ترقی وار تقاء میں اس مابعد الطبیعاتی فلسفے کی روح جاری و ساری ہوتی ہے۔ ماضی کے ادوار میں عام طور پر اس فلسفے کی کارفرمائی تہذیبی و اخلاقی قدروں اور تعمیر معاشرہ تک محدود ہوتی تھی لیکن آج کل سیاست و معیشت بھی اس کے زیر اثر آ گئے ہیں۔ موجودہ دور ہر قوم کے لیے ایک ہمہ جہتی نظام فکر کا تقاضا قرون سابق کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ شدت کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر دور حاضر کی مختلف اقوام کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس وقت وہی قومیں دنیا کی رہبری کر رہی ہیں جو زندگی کے متعلق کچھ نظریات رکھتی ہیں اور انہیں نے اپنے ذہن و فکر اور عمل و کردار کو انہی نظریات کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ مادی لحاظ سے بھی وہی قومیں ترقی کر سکی ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی متعین فلسفہ زندگی کو اپنا کر حیات اجتماعی کے سارے گوشوں

کو یکساں طور پر اس فلسفے کے رنگ میں رنگنے کی کوشش ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس تو ایک عرصے سے مادہ پرستانہ جمہوریت کے نظریے پر عمل پیرا ہیں اور ان کی مادی ترقی و استیلاء براہ راست اس بات کا نتیجہ ہیں کہ انہوں نے زندگی کے سب گوشوں کو ایک ہمہ گیر ضابطہ فکر کے تحت استوار کیا ہے۔ ماضی قریب میں روس نے ایک خاص نظریہ زندگی کو اپنا لیا تو اس نے چالیس سال کے عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اسی طرح ہٹلر اور مسولینی کے زیر قیادت جرمنی اور اٹلی چند سالوں میں دنیا کی عظیم ترین طاقتوں میں شمار ہونے لگے۔ ہمیں ان تمام نظریات میں سے کسی سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان تمام ممالک کی مادی ترقی زیادہ تر اس بات کی مرہون منت ہے کہ انہوں نے اپنی قومی تعمیر و ترقی کے لیے کسی نہ کسی نظام کو یکسوئی کے ساتھ اپنا لیا۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ قوموں کے درمیان صرف زمین کے ٹکڑے ہی نزاعات کا باعث نہیں بنتے بلکہ ان میں نظریاتی اختلافات کا عامل سب سے اہم ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی علامت آج کل کی بین الاقوامی دھڑے بندیاں ہیں۔ اب قومیں ایک دوسرے سے حلیفانہ تعلقات قائم کرتے وقت اپنی اپنی جغرافیائی پوزیشن اور جنگی سہولت کو نہیں بلکہ نظریاتی یکسانی و اتفاق کو مد نظر رکھتی ہیں۔ ابھی کل تک چین جمہوری بلاک میں تھا لیکن کمیونسٹ انقلاب کے بعد اس نے اپنے آپ کو کمیونسٹ بلاک سے وابستہ کر لیا۔ ہمیں یہاں وجوہ سے بحث نہیں ہے، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اگر آپ نے دور رواں کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر کوئی مضبوط معاشرہ تعمیر کرنا ہو تو اس کے لیے کسی نہ کسی نظام فکر و عمل کو اپنانا ناگریز ہے۔ ورنہ صورت یہ ہو گی کہ کشمکش حیات کی موجودہ شکل میں زندہ رہنے اور سیاسی و معاشی استقلال برقرار رکھنے کے لیے جن پالیسیوں کی ضرورت ہو گی وہ تو زندگی کے سب گوشوں میں ایک متعین و مربوط فکری روح کا تقاضا کریں گی، لیکن آپ اپنے سب معاملات کو الل ٹپ چلا رہے ہوں گے۔ اس طرح آپ میں وہ مضبوطی پیدا نہ ہو گی جو باعزت زندگی بسر کرنے کی اولین شرط ہے۔ ایسا معاشرہ انتشار میں مبتلا ہو جائے گا اور اس میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت کبھی پیدا نہ ہو سکے گی۔ اس کی سب سے بڑی مثال دور حاضر کی وہ قومیں ہیں جنہوں نے قومی تعمیر و ترقی کے لیے کسی نظریے کو نہیں اپنایا۔ چونکہ ان قوموں کے ذہن زندگی کے کسی فلسفے سے یکسر خالی ہیں ـــــ اگرچہ ان میں سے بعض زبانی اور جذباتی طور پر کسی نہ کسی نظام فکر سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتی ہیں ـــــ اس لیے ایک دنیا دیکھ رہی ہے کہ وہ درماندگی اور پس ماندگی کے تحت الثری میں گری ہوئی ہیں اور اگر وہ زندہ بھی ہیں تو عالمی بساط سیاست پر دوسروں کے مہروں کی حیثیت سے زندہ ہیں۔ ان کا اپنا کوئی مستقل وجود

نہیں ہے۔ ماضی و حال کے تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی اقوام ترقی و تعمیر کے بے حقیقت خواب تو دیکھتی رہتی ہیں لیکن ان خوابوں کی تعبیر کبھی سامنے نہیں آئی۔

ہم نے اس سے قبل دور حاضر کی قومی زندگی میں جن کلیت پسندانہ رجحانات کا تذکرہ کیا ہے، اگر ان کی ماہیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج کوئی قوم اسی صورت میں باوقار حیثیت سے زندہ رہ سکتی ہے جب کہ اس میں اپنی تمام فکری و عملی صلاحیتوں کو مجتمع کر کے کام میں لانے کی استعداد پائی جاتی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جو محض جسمانی قوت کے بل پر انجام پاسکے یا بے جان مشینوں کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت دینے سے کیا جاسکے۔ اس کے برعکس یہ ساری قوم کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار لانے کا سوال ہوتا ہے اور جب تک انسانوں کی کسی جماعت میں فکری ہم آہنگی پیدا نہ ہو تب تک اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مشترک مقصد کی خاطر اپنے ذہن و فکر اور عمل و کردار کی ساری صلاحیتوں کو جھونک سکے۔ دور حاضر کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں اس کام کے لیے جس یکسوئی اور مستعدی کی ضرورت ہوتی ہے اس کا بروئے کار آنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک قومی مقاصد کا شعور عام نہ ہو جائے اور معاشرے کا ایک ایک فرد اپنی اپنی جگہ پر انہی مقاصد کے لیے ایک جانے بوجھے طریق کار کے مطابق محنت نہ کرے اور کوئی مقصد متعین نہیں ہو سکتا اور نہ کسی قوم کو اسے اپنانے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے جب تک اس کی پشت پر کوئی اجتماعی فلسفہ اور فکر موجود نہ ہو۔ دور حاضر میں قومی مقاصد کے حصول کے لیے جس یکسوئی اور جس طرح انفرادی و اجتماعی قوتوں کو سمیٹ کر صرف کرنے کی ضرورت ہے اس کا امکان اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب کہ افراد میں یہ شعور موجود ہو کہ وہ اعلیٰ تر قدروں اور مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

دوسری خصوصیت

کسی قوم کے لیے ابھرنے، ترقی کرنے اور اپنے ایک باوقار قومی تشخص کو وجود میں لانے کے لیے صرف یہی ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی نظام فکر رکھتی ہو، بلکہ اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس نظام کو فکر و عمل کے دائروں میں پوری طرح اپنائے اور اپنے اندر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ انسان کو قدرت کی طرف سے غور و فکر اور شعور و احساس کی جو قوتیں عطا ہوئی ہیں انہیں وہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی طرح استعمال میں لاتا رہا ہے اور ہر قوم کے اندر اس کے تمدن و تہذیب کے ارتقاء کے مطابق کسی نہ کسی فلسفہ زندگی کا شعور پایا جاتا رہا ہے۔ نیز ہر قوم یہ دعویٰ بھی کرتی رہی ہے کہ اس کے پاس اپنا ایک فلسفہ موجود ہے لیکن

تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صفحہ ارض پر ظاہر ہونے والی بیشتر اقوام کی روش یہی رہی ہے کہ انہوں نے اس دعویٰ کے باوجود اس فلسفے کو نہ تو اس قدر ترقی دی کہ وہ اس زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور نہ انہوں نے جذباتی وابستگی سے آگے بڑھ کر اسے عمل کی دنیا میں اپنانے کی مناسب کوشش کی۔ اس صورت حال کی سب سے نمایاں مثال مسلمانوں ہی نے فراہم کی ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد گزشتہ تیرہ سو سالوں میں کوئی ایک دور بھی ایسا نہیں آیا جب کہ مسلمان اسلام کے ایک ضابطہ زندگی ہونے کے عقیدے اور مسلک سے دست بردار ہوئے ہوں۔ لیکن اس سارے عرصے میں انہوں نے اس اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے اپنایا بھی نہیں اور اگرچہ اسلام کو فکر و عمل کی دنیا میں بحال کرنے کے لیے آج تک متعدد عظیم الشان کوششیں ہوئی ہیں لیکن مسلمانوں کے اندر سے ہی ایسے عناصر اٹھتے رہے جو اس قسم کی ہر کوشش کو ناکام بناتے رہے۔ گویا ملت کا اجتماعی ضمیر ہی اسلام کو اپنانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک ایک مجلس اور ایک ایک مسجد میں صدیوں سے یہ بات بالالتزام دہرائی جا رہی ہے اور پورے خلوص کے ساتھ یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ مسلمان دنیا کی امامت کے لیے ظاہر ہوئے تھے اور زندگی کو صحیح و صالح بنیادوں پر استوار کرنے کا نسخہ صرف انہی کے پاس ہے لیکن عمل کا یہ حال ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد دنیا کے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے خطے کے مسلمانوں نے بھی باقاعدہ طور پر اسلامی نظام برپا نہیں کیا۔ یہاں اس تضاد کے اسباب و علل پر بحث مقصود نہیں ہے البتہ ہم ایک واقعہ کی حیثیت سے یہ بات بیان کر دینا چاہتے ہیں تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ دعویٰ اور عمل کا یہ تضاد خلاف عقل ہے۔ آج بھی کوئی مسلمان قوم یہ ڈرامہ دہرا سکتی ہے کہ اسلام کو اپنانے کا اعلان کرے لیکن اس پر عمل پیرا نہ ہو۔ فی الحقیقت دیکھنے کی چیز کسی قوم کا زبانی دعویٰ نہیں ہے بلکہ فکر و عمل کے دائروں میں اس کی اصل روش سے ہی یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ کس قسم کے نظام کو اختیار کرنے پر آمادہ ہے۔ لہٰذا یہ بات کافی نہیں ہے کہ کسی قوم کے پاس زندگی کا کوئی فلسفہ موجود ہو، بلکہ اس سے استفادہ کرنے اور اسے قومی استحکام و ترقی کا ذریعہ بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر اسے اپنانے کی آمادگی پائی جاتی ہو۔

اور پھر اس آمادگی کے علاوہ یہ بات بھی ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے کہ قوم میں اس فلسفہ زندگی کو اپنانے کی صلاحیت موجود ہو۔ دنیا میں بہت سے کام ایسے ہیں جو نرے خلوص کے بل پر نہیں کئے جا سکتے بلکہ انہیں انجام دینے کے لیے ان کے مناسب حال فکری و عملی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک شخص چاہے

ایک عالی شان عمارت بنانے کا جس قدر پختہ ارادہ بھی رکھتا ہو، لیکن جب تک وہ اس کے لیے مناسب وسائل مہیا نہ کرے گا اور اپنے اندر ایک انجنیئر کی سی صلاحیتیں پیدا نہ کرے گا اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ایک قوم اگر کسی نظام کو اپنانے کی استعداد ہی نہ رکھتی ہو تو اس نظام کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی چنداں مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔

عمل پیرا ہونے کی صورت

فکری انقلاب کی ضرورت

بحث کے اس مرحلے پر پہنچ کر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی ضابطہ زندگی کو صحیح معنوں میں اپنانے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک نہایت ہی اہم سوال ہے اور اگر اس کا ٹھیک ٹھیک جواب سامنے ہو تو کسی جماعت یا قوم کے اس دعوے کی صداقت کو کہ وہ فلاں نظریہ زندگی کو اپنانا چاہتی ہے، بڑی آسانی کے ساتھ پرکھا جا سکتا ہے اور یہ رائے بھی قائم کی جا سکتی ہے کہ اس دعوے کے پورا ہونے کے امکانات کیا ہیں۔

یوں تو ہر فلسفہ زندگی اپنی تنفیذ کے انداز اور طریق کار کو خود متعین کرتا ہے اور اس میں اس کے اپنے مزاج، مقاصد اور اخلاقی اقدار کو بہت بڑا دخل حاصل ہوتا ہے لیکن تاریخ انسانی میں مختلف تحریکوں، نظاموں اور تہذیبوں کے عروج وارتقاء، زوال وانحطاط اور آغاز کار کے ابتدائی مراحل میں مرجھا جانے کی جو داستانیں محفوظ ہیں ان سے انسان کی مخصوص فطرت اور انداز فکر و عمل کے متعلق کچھ مشترک بنیادی اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیر اور حالات و واقعات کے اختلافات کے باوجود چونکہ انسان کی فطرت ہمیشہ سے ایک ہی ہے لہذا وہ مختلف نظریات کو اپنانے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے معاملات میں بعض پہلوؤں سے اساسی طور پر ایک ہی قسم کے طرز عمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں جو خیالات پیش کریں گے وہ محض نظریاتی نہ ہوں گے بلکہ ان کی بنیاد تاریخ انسانی میں مختلف اقوام و ملل کے طرز عمل کے مشاہدے سے فراہم کی جائے گی، اور ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ جب تک فطرت انسانی میں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہ ہو جائے یہ قوانین ابدی سچائی کے حامل ثابت ہوں گے۔

اس نئے نظام کے اصول سب سے پہلے ہمیشہ فکر کی دنیا میں پیش کیے گئے ہیں اور اس دائرے میں غلبہ حاصل کرنے پر عمل کے میدان میں اس نظام کے برپا ہونے کا انحصار ہوتا ہے اس کی عملی شکل یہ ہوتی ہے کہ

قائم شدہ نظام کی خرابیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ مثبت طور پر وہ متبادل نظریات پیش کئے جاتے ہیں جو ان خرابیوں کی اصلاح کے علاوہ ایک نئے اور صالح تر نظام کے قیام کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ یہ کام بڑے جان جوکھوں کا ہوتا ہے اور اس کے لیے بعض اوقات قرن ہا قرن تک پتہ ماری سے کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر معاشرے میں بعض اساسی باتیں مسلمات (Postulates) کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ اور اس معاشرے میں لوگ ان باتوں کو بلا دلیل درست تسلیم کرتے ان پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ ان باتوں کی حمایت کا اعلان عوام کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے اور ان کی مخالفت یا ان سے اختلاف اقتدار وقت اور عوام کے عتاب و مخالفت کا باعث ہوتا ہے۔ لوگ ان اصولوں کو فطرت کے عین مطابق اور ابدی سچائیوں کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ ان کے خلاف وہ کوئی دلیل سننا گوارا کرتے ہیں اور نہ انہیں تسلیم کرنے کے لیے کسی دلیل کی حاجت محسوس کرتے ہیں۔ یوں تو اس قاعدے کی کارفرمائی ہر معاشرے اور ہر دور میں دکھائی دیتی ہے لیکن اسلام کی تاریخ کی اس کی سب سے واضح مثال یہ ہے کہ جب بھی انبیاء علیہم السلام نے کفار و مشرکین کے سامنے، توحید کا تصور پیش کیا اور اس تصور کے حق میں دلائل بھی پیش کئے تو مخاطبین نے ان دلائل کا سامنا کرنے یا اپنی بت پرستی اور غیر اللہ کی اطاعت کے جواز میں دلائل دینے کے بجائے ہمیشہ حیرانی اور پریشانی کے لہجے میں کہا ''کیا ہم ان بتوں (یا عبادت واطاعت کے دوسرے طریقوں) کو ترک کر دیں جنہیں ہمارے آباء واجداد اور ہم ہمیشہ سے پوجتے آئے ہیں؟''۔ یعنی نہ دلیل سنی جاتی ہے نہ دلیل دی جاتی ہے بلکہ اپنی سابقہ روش سے اس قدر اندھا دھند وابستگی ہے کہ اسے ترک کرنے کے تصور تک سے وحشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید میں انبیاء کی جدوجہد کی جو داستانیں بیان کی گئی ہیں ان سے اور بھی بہت سی ایسی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ جب بھی کسی نبی نے کسی مسلمہ اصول کی مخالفت کی تو اس پر نہ صرف ناراضی بلکہ حیرانی اور پریشانی کا اظہار کیا گیا، دیوانگی تک کے الزامات لگائے گئے اور نئے اصولوں کو انوکھا اور تباہ کن قرار دیا گیا۔ آباء و اجداد سے ورثے میں حاصل کردہ اصولوں اور انداز فکر و عمل کے حق میں انسان کے اندر عام طور پر اس قدر تعصب پایا جاتا ہے کہ قرآن میں ہمیں متعدد ایسے انبیاء کا تذکرہ ملتا ہے جو اپنی تمام صلاحیتوں اور خالق کائنات کی طرف سے براہ راست رہنمائی کے باوجود تعصب کے ان پردوں کو چاک نہ کر سکے اور برسوں کی تبلیغ کے علی الرغم بعض اوقات گنتی کے چند افراد کے سوا اپنی قوم کے قائم شدہ نظریات ترک کرنے اور اپنے پیش کردہ نظریات کو اپنانے پر آمادہ نہ کر سکے۔ اور ان کے مخاطب معاشرے اپنی سابقہ روش پر ہی قائم رہے۔ یہی نہیں

بلکہ قوموں اور امتوں نے ان انبیاء کو بھی جھٹلایا اور قتل تک کیا ہے جو سابقہ انبیاء کی اطاعت کا دعویٰ کرنے والی امتوں کی طرف بعض اوقات نئی شریعت کے ساتھ اور بعض اوقات پرانی شریعت کے مطابق ہی دین کی تجدید و احیاء کے لیے بھیجے گئے تھے۔ تاریخ اسلام میں اس کی نمایاں ترین مثال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہودیوں کا طرز عمل ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ نبی آخر الزمان کے انتظار میں رہتے تھے اور اس بات کا تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ وہ اس کو جھٹلائیں گے۔ لیکن جب آپ تشریف لے آئے تو یہودیوں نے مخالفت و عداوت میں کوئی وقیقہ فرد گزاشت نہ کیا۔ حالانکہ یہودیوں کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تسلیم کرنا اصولی حیثیت سے اپنے سابقہ دین سے انحراف اور کسی نئے دین کو قبول کرنے کے مترادف نہ تھا لیکن تعصّبات نے انہیں ایک ایسی ہستی کو تسلیم کرنے سے باز رکھا جسے وہ صدیوں سے پیشگی طور پر عقیدے کی حد تک صرف درست تسلیم ہی نہ کرتے چلے آئے تھے بلکہ اس بنی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے لیے گڑ گڑا کر دعائیں مانگا کرتے تھے جس کے متعلق ان کی کتابوں میں واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں۔

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ غیر اسلامی تحریکوں کے ساتھ بھی ان کے مخاطبین کا یہی طرز عمل رہا ہے اور جہاں عوام نے تعصب کا شدید ترین مظاہرہ کیا ہے اور بر سر اقتدار گروہ نے ہمیشہ اس تصب کی آگ کو ہوا دینے کی کوشش کی ہے وہیں علمی دائرے میں بھی ہمیشہ پرانے نظریات کی مدافعت اور نئے نظریات کی مخالفت کی گئی ہے۔ قطع نظر اس بات سے کہ کوئی تحریک نئے نظریات پیش کر رہی ہو یا اپنی مخاطب قوم کے انہی نظریات کو ان کی اصلی شکل و صورت میں پیش کر رہی ہو جن سے وہ قوم خود بھی وابستگی کا دعویٰ کرتی ہو، یہ ایک واقعہ ہے کہ آج تک کسی ایسی تحریک کا جس کے پیش نظر تغیر و انقلاب کا کوئی پروگرام ہو مخاطبین نے آگے بڑھ کر خیر مقدم نہیں کیا بلکہ تحریک کے نظریات کو پھیلانے کے لیے عظیم قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ حتیٰ کہ ان نظریات کے سلسلے میں بھی چوٹیں کھانی پڑتی ہیں جنھیں لوگ زبانی اقرار کی حد تک بالکل درست تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً آج کے دور میں جمہوریت یعنی عوام کی مرضی و منشاء کے مطابق نظم حکومت چلانے کے اصول کو بالاتفاق درجہ قبولیت حاصل ہے حتیٰ کہ کلیت پسند اور آمرانہ حکومتوں کے سربراہ بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ عوامی تائید کے ساتھ ہی مسند اقتدار پر متمکن ہیں۔ لیکن آپ ذرا ان ممالک میں جمہوریت کی اصل قدروں کو نافذ کرنے کی کوشش کیجیے جہاں انہیں پامال کیا جارہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ کس طرح جمہوریت کے نام پر ہی آپ کو کچلا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی آج تک یہی دعویٰ کیا ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں کے تحت

زندگی بسر کرنے کی پر خلوص آرزو رکھتے ہیں، لیکن جونہی کسی طرف سے اسلام کو نظام زندگی کی حیثیت سے برپا کرنے کی آواز اٹھتی ہے اسے دبانے کے لیے بے شمار طاقتیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس آواز کے دب جانے کے بعد آنے والی نسلیں آواز اٹھانے والوں کی اس قدر عزت و توقیر کریں گی کہ ان حضرات کی قبروں تک کو سجدہ گاہوں میں تبدیل کر دیا جائے گا لیکن عین اس وقت ان کے اپنے اندر کوئی اسی قسم کی تحریک چل رہی ہو گی تو اپنی پیش رو نسلوں کی طرح وہ بھی اسی شد و مد کے ساتھ احیاء دین کی اس کوشش کی مخالفت کر رہی ہوں گی۔

دور حاضر میں جب کہ نظریات کی اشاعت کے لیے پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما وغیرہ کے ذرائع عالم وجود میں آچکے ہیں، قائم شدہ نظریات اور نظام کی خرابیوں کی نشان دہی کرنے اور نئے نظریات کو پیش کرنے کے سلسلے میں شدید تر کشمکش کرنا پڑتی ہے۔ ہر قائم شدہ نظام اپنے نظریات اور مفادات کی مدافعت کے لیے تعزیر و قانون کے علاوہ ان سب وسائل نشر و اشاعت کو پوری طرح استعمال میں لاتا ہے اور چونکہ نئے نظریات پیش کرنے والوں کے پاس ان وسائل کی شدید کمی ہوتی ہے اس لیے سہولتوں اور وسائل کی اس عدم مساوات کے اثرات کو محنت، بردباری، عزم اور نظریات کی پختگی اور بالاتری کی قوت سے زائل کرنا ہوتا ہے۔ بہر حال جس قدر قوتوں کا بھی سامنا کرنا پڑے یہ ایک حقیقت ہے ——— اور اس معاملے میں قدرت نے آج تک کسی کے ساتھ رعایت نہیں برتی ——— کہ عمل کی دنیا میں نتائج اسی وقت نکلتے ہیں جب کہ فکر کی دنیا میں پرانے نظریات کو شکست دے دی جائے اور نئے نظریات غالب آجائیں۔

ہم یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اپنے نظریات کو پیش کر دینے یا قائم شدہ نظریات کو غلط ثابت کر دینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ آپ ارباب اقتدار پر کچھ تنقید کر ڈالیں، ان کے اعمال کی خرابیوں کی نشان دہی کر دیں اور موجود الوقت حکمرانوں سے عوام کے عدم اطمینان سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو ان سے بیزار کر دیں اور پھر ان باتوں کو کافی سمجھ کر یہ اعلان کر دیں کہ چند مسند نشینوں کی تبدیلی سے نظام بدل جائے گا۔ اس پالیسی سے سیاسی قیادتیں بدل سکتی ہیں اور سیاسی یا پارلیمانی پارٹیوں کا یہی طریق کار ہوتا ہے لیکن اس سے صرف چند ہاتھوں کی تبدیلی ہو گی نظام میں اس طرح آج تک نہ کوئی تغیر رونما ہوا ہے اور نہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ طریق کار وہاں اختیار کیا جاتا ہے جہاں زندگی کی بنیادوں پر تو اتفاق پایا جاتا ہو، لیکن تفصیلات میں اختلاف ہو۔ تفصیلات کے اس اختلاف کو عوام کے سامنے پیش کر کے ان سے انتخابات کے ذریعے رائے طلب کی جاتی ہے اور عوام کی

اکثریت جس جماعت کے نظریات سے اتفاق کا اظہار کرے وہ برسر اقتدار آکر اپنے ان محدود نظریات کو نافذ کرتی ہے۔اس کے برعکس انسانی زندگی کے متعلق نئے بنیادی نظریات پیش کر کے ان کی برتری ثابت کرنے اور پرانے نظریات کو شکست دینے سے ہماری مراد یہ ہے کہ کائنات کے متعلق قائم شدہ نظریات،انسان کی ابتداء و انتہاء اور اس کی زندگی کے منتہائے مقصود سے لے کر معیار خیر و شر اور اخلاقی اقدار، سیاست، معیشت اور عمرانیات کے متعلق نقطہ نظر تک بدل جائے اور فکری و طبعی علوم کو از سر نو مرتب کرنے کے لیے موزوں مواد فراہم ہو جائے۔ زندگی کے ایک ایک مسئلے کا حل پیش کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ نئے نظام کے داعیوں کے انداز بحث و فکر کی سطح اس قدر بلند ہو کہ ایک دنیا ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے میں فخر محسوس کرے اور نظری حیثیت سے ان کے اصول علم کے سب گوشوں پر حاوی ہو جائیں۔ سابقہ تھیوریوں کی بنیادیں نہ صرف متزلزل بلکہ منہدم ہو جائیں اور ایک قوم کی فکری راہنمائی کی باگ ڈور دوسروں کے ہاتھوں سے نئے نظام کے داعیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے۔ اپنی قوم کے لوگ نئے نظریات کو اپنے دکھوں کا علاج تصور کریں اور بیرونی دنیا ان کا سکہ تسلیم کرنے لگے اور قائم شدہ نظریات کے داعیوں کی مجلسوں میں تہلکہ مچ جائے۔

انحراف اور اس کی وجوہ

کام کا یہ مرحلہ بہت ہی محنت و مشقت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے دوران علمی و فکری کاوشوں میں پوری یکسوئی کے ساتھ منہمک رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ ارد گرد کے حالات و وسائل اور ماحول سے کلی قطع تعلق تو ممکن نہیں ہوتا لیکن یہ تعلق اسی حد تک ہونا چاہیے جس قدر اپنے فکر کو پیش کرنے کے لیے ضروری ہو کیونکہ اس مرحلے پر عملی مسائل میں الجھ جانے سے توجہ اور قوتیں اصل بنیادی کام سے اس قدر ہٹ جاتی ہیں کہ فکری انقلاب کے کام کی عظمت اور اہمیت کا شعور رکھنے والا کوئی شخص یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ انسان کی قوتیں اور صلاحیتیں غیر محدود نہیں ہیں اور کسی جماعت یا تحریک کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ بیک وقت فکری انقلاب کا عظیم الشان اور ہمت طلب کام کرنے کے علاوہ عملی سیاسیات کے جھمیلوں میں بھی الجھتی چلی جائے۔ اول الذکر کام کے لیے ذہنی و فکری قوتوں کو مجتمع کر کے اس قدر یکسوئی کے ساتھ علمی کاوشوں پر مرکوز کرنا ہوتا ہے کہ معمولی سے معمولی صرف توجہ بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ تحریک کے قائدین کا یہ فرض ہوتا ہے اور اس فرض کی اچھے طریق سے ادائیگی پر تحریک کے مستقبل کا انحصار

ہوتا ہے کہ وہ ماحول سے مناسب تعلق قائم رکھتے ہوئے تحریک کے مرحلے سے مناسبت رکھنے والے اصل کام کو معمولی سے معمولی گزند بھی نہ پہنچنے دیں۔ یہ مرحل دراصل فکر کے دائرے میں بیک وقت تخریب و تعمیر کا مرحلہ ہوتا ہے اور اس میں عظیم صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اپنے اعلان کردہ اصولوں کے ساتھ مخلصانہ اور بے غرضانہ وابستگی ثابت کرنے کے سلسلے میں ایک بہت بڑے امتحان کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب اس تحریک کے وابستگان اپنی علمی کاوشوں کے ذریعے عوام میں تھوڑے بہت متعارف ہو جاتے ہیں اور انہیں کچھ مادی وسائل بھی مہیا ہو جاتے ہیں تو سیاسی میدان کی جاذبیتیں ان کے استقلال و تحمل کو آزمائش میں ڈال دیتی ہیں۔ اگر اس موقع پر تحریک کے تقاضے پیش نظر رہیں اور اپنے پیش کردہ نظام کا قیام ہی اصل مقصود ہو تو ایک خاص مرحلے تک ـــــــ جس کے تعین کے سلسلے میں ہم اپنے خیالات بعد میں غرض کریں گے ـــــــ یہ تحریک عملی سیاسیات سے، جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں کشمش اقتدار ہوتا ہے، الگ رہتی ہے، لیکن اگر اپنے اصولوں سے وابستگی کی شدت اقتدار کی حرص پر غالب نہ آسکے تو عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ تحریک کو اس کے اصولوں کے نام پر ہی سیاسیات میں جھونک دیا جاتا ہے۔ اس انحراف کے لیے وجہ جواز تلاش کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ ہر ملک ہر وقت مختلف مسائل، پیچیدگیوں اور مشکلات میں الجھا رہتا ہے اور کسی جماعت کے قائدین کے لیے یہ مشکل نہیں ہوتا کہ وہ کسی ایک مسئلے کو ملک و قوم اور تحریک کے مستقبل کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل قرار دے کر میدان سیاست میں کود پڑیں اور اپنے ساتھ وابستہ افراد کو یہ باور کرا دیں کہ فی الحقیقت اس موقع پر الگ رہنا فلاں فلاں خطرات کو انگیز کرنے کے مترادف ہے اور اس سے خود اس تحریک کے مستقبل اور اس نظام کے قیام کے امکانات ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے جسے لے کر ہم چل رہے ہیں۔ تاریخ میں ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ جب کوئی اصولی تحریک ایسے حیلے بہانوں کی آڑ میں قبل از وقت سیاسیات میں کود پڑتی ہے تو وہ ملکی سیاسیات میں تو اپنے ایک خاص مزاج کی وجہ سے کوئی موثر کردار ادا نہیں کر سکتی البتہ اپنی تحریک کی حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔ اگرچہ کچھ عرصہ تک تو قائدین تحریک اپنے متبعین کو یہ کہہ کر تسلی دیتے رہتے ہیں کہ یہ ایک عارضی سا دور ہے اور ہم اپنے سابقہ مقام پر پھر واپس آجائیں گے، لیکن تاریخ میں آج تک ایسی ''واپسی'' کی ایک مثال بھی نہیں ملتی اور بالاخر ایسی جماعت اس طرز سیاست کی کان نمک کا ایک حصہ بن جاتی ہے جس میں بنیادی انقلاب پیدا کرنے کے دعاوی کے ساتھ وہ اٹھی تھی۔

دراصل یہ حادثہ کسی تحریک یا جماعت کو اس وقت پیش آتا ہے جب اس کے قائدین کے دماغوں پر درج ذیل تینوں یا ان میں سے کوئی ایک خیال مسلط ہو جاتا ہے۔

ا۔ یا تو وہ عوام میں تھوڑا سا تعارف حاصل کر کے خواہش اقتدار کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۲۔ یا اپنی نادانی سے ان کے ذہنوں پر یہ خیال مسلط ہو جاتا ہے کہ وہ جس نظام کے اصولوں کو پیش کر رہے ہیں اسے اقتدار کی مسندیں حاصل کر کے خود ہی نافذ کریں گے۔

۳۔ اور یا وہ غلطی سے قبل از وقت یہ سمجھ لیتے ہیں کہ تطہیر و تعمیر فکر کا کام مناسب حد تک ہو چکا ہے۔

انحراف کے باعث خواہ اول الذکر دو وجوہات میں سے کوئی ایک ہو یا دونوں کی آمیزش لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد قیام نظام کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اپنے اصولوں سے بالکل مختلف اصولوں کی بنیاد پر نشوونما پائی ہوئی سیاست کی خار دار وادیوں میں قدم رکھنے کے بعد وہ ایک مصلحت سے دوسری مصلحت اور دوسری مصلحت سے تیسری مصلحت کے تحت اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان کے لیے اس دوراہے پر واپس آنا ہی مشکل ہو جاتا ہے جہاں سے انہوں نے اپنی اصل شاہراہ کو چھوڑا تھا اور جہاں واپس پہنچے بغیر ان کے لیے اپنی اصل منزل کی طرف پیش قدمی کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اور اگر انحراف کا باعث تیسری وجہ ہو تو ایک عارضی دور کے بعد اصل راستے پر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس صورت میں تو قائدین تحریک یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کسی وقتی مجبوری یا مصلحت کے تحت نہیں بلکہ مناسب موقع پر حصول اقتدار کی کشمکش میں حصہ لینا شروع کیا ہے اور فی الحقیقت معاشرہ فکری اور اخلاقی اعتبار سے ان کے پیش کردہ نظریہ زندگی کو اپنانے کے لیے بالکل تیار ہے۔ اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریک کے قائدین اصلاح و تغیر کی ہر کوشش کے سلسلے میں غلط اندازے قائم کرتے ہیں اور انہیں اور ان کے متبعین کو پے در پے مایوسیوں نامرادیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہر اجتماعی مسئلے کے ضمن میں قوم سے غلط امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور ان کی ہر پالیسی ناکامی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریک کے قائدین کی طفل تسلیوں کے باوجود اس کے متعلقین آہستہ آہستہ مایوسی اور احساس ناکامی کا شکار ہوتے جاتے ہیں اور بالآخر تحریک یا تو مرجھا کر رہ جاتی ہے یا اپنے اصل راستے سے بالکل ہٹ جاتی ہے۔

اپنے آپ کو سیاسیات میں براہ راست الجھا دینے اور کشمکش اقتدار میں حصہ لینے کا مطلب دور حاضر میں یہ ہوتا ہے کہ وہ جماعت ملک میں قائم شدہ نظام کے پیدا کردہ مسائل میں سے ہر ایک کے متعلق کوئی نہ کوئی

موقف اختیار کرتی ہے، انتخابات میں حصہ لینا شروع کردیتی ہے اور اس طرح حصول اقتدار کی سعی وجہد میں منہمک ہو جاتی ہے۔ انتخابات میں حصہ لینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس سلسلے میں اپنی صلاحیتوں اور وقت کا اسی قدر حصہ کھپانا پڑتا ہے جو انتخابات کے انعقاد میں صرف ہوتا ہے، نہیں، بلکہ اس کے برعکس انتخابات میں حصہ لینے اور نتائج پیدا کرنے کی خاطر ایک خاص طرز سیاست کو اپنانا ناگزیر ہوتا ہے۔ اگر آپ نے انتخابات میں حصہ لینے سے قبل اپنے اصولوں اور نظریات کے مطابق عوام کی ایک خاص حد تک تربیت نہ کر رکھی ہو گی تو لامحالہ آپ کو عوام کے موجودہ رجحانات کی پیروی کرنا ہو گی۔ آپ کا نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ بدل جائیں گے۔ پہلے آپ کسی مسئلے پر اپنے طرز عمل کو متعین کرنے کے لیے اپنے اصولوں کو مد نظر رکھتے تھے، لیکن اب آپ کے لیے ہر معاملے میں موزوں ترین کسوٹی رائے عامہ ہو گی۔ آپ انقلاب فکر کا وہ کام تو نہ کر سکیں گے جس کا مطلب ماحول اور رائج شدہ نظریات سے بغاوت ہوتا ہے بلکہ اب آپ کو انتخابات کے نقطہ نظر سے اپنی پالیسیوں کو مرتب کرنا ہو گا۔ آپ کو ملک کے ہر مسئلے پر اس زاویہ نگاہ سے غور کرنا ہو گا کہ اس سے جماعت کی مقبولیت پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ کو اکثر اوقات اصولوں کی روشنی میں کئے ہوئے فیصلوں کو عوامی رجحانات سے مطابقت اختیار کرنے کی خاطر بدلنا پڑے گا حتیٰ کہ آپ کی ذہنیت آہستہ آہستہ اس قدر مسخ ہو جائے گی کہ آپ انتخابات میں اچھے نتائج پیدا کرنے کے لیے ان جماعتوں اور سیاسی عناصر تک سے گٹھ جوڑ کریں گے جن کے پروگرام اور آپ کے اعلان کردہ نظریات واقدار کے درمیان سرے سے کوئی قدر مشترک ہی موجود نہ ہو گی۔ غرضیکہ نئی پالیسی کے تقاضے آپ کو ایسی ایسی پرپیچ وادیوں میں لیے پھریں گے جہاں سے اصل منزل کی طرف رخ کرنا تو کجا سمت منزل کا تعین کرنا بھی آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

اگر کوئی شخص حقائق سے آنکھیں بند نہ کرلے تو اسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس ملک میں پارلیمانی جمہوریت رائج ہو وہاں سیاسی جماعتوں کی پالیسیاں عوام کے رجحانات کے تابع ہوتی ہیں جو جماعت اجتماعی زندگی کے نقشے کو ہی بدل دینے کی خواہش رکھتی ہو اس کے لیے اپنے اصولوں کے مطابق اصلاح و تطہیر فکر کے بغیر انتخابات میں حصہ لینا مضحکہ خیز بات ہے۔ اگر وہ جماعت عوامی تائید حاصل کرنے کی خاطر ـــــ جس کے بغیر ووٹ نہیں مل سکتے ـــــ عوام کی خواہشات کے پیچھے چلے گی تو اپنے اصولوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گی اور اگر عوام کو اپنے نظریات کے مطابق چلانے کی کوشش کرے گی تو انقلاب فکر کے بغیر اس کام میں اس کا کامیاب ہونا ناممکنات میں سے ہو گا۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں جب تک وہ فکری انقلاب رونما نہ ہو ــــــــ مکمل نہیں تو ایک حد تک ہی سہی ــــــــ جس کا ایک سرسری سا نقشہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے، کسی نظام کے قیام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اس انقلاب کے بغیر پارلیمانی طریق سیاست سے اقتدار حاصل کر کے کچھ اصلاحات تو نافذ کر سکتے ہیں اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ آپ معاشرے کی موجودہ حالت کے باوجود انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آجائیں لیکن کوئی نیا نظام قائم نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ہماری رائے میں یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ اپنے معیار اخلاق اور اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اس تحریک کے علمبردار ایک ایسے معاشرے میں برسر اقتدار آجائیں جس کی قدریں اور مزاج ان سے مختلف ہو۔ ان حالات میں انقلاب فکر سے قبل انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آنے کی کوشش کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں۔

یا تو وہ تحریک قائم شدہ قدروں سے بتدریج مصالحت کر کے اپنی قدریں کھو بیٹھے گی۔ اور یا پھر متواتر شکستیں کھا کر اس کے کارکن اور موئدین مایوسی کے عالم میں گوشہ تنہائی اختیار کر لیں گے۔

مناسب حد تک انقلاب فکر برپا کرنے سے قبل سیاسیات میں پوری طرح الجھ جانا اس سبق کی روشنی میں بھی غیر مناسب ہے جو ہم نے تاریخ سے حاصل کیا ہے۔ آج تک ساری دنیا کی تاریخ میں ہمیں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ مخصوص نظریات رکھنے والی کوئی جماعت اپنے نظریات پر قائم رہتے ہوئے انقلاب فکر کے بغیر برسر اقتدار آگئی ہو۔ لیکن اگر اس پہلو کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور ایک ناممکن بات کا ممکن ہونا فرض بھی کر لیا جائے تو بھی ہم یہ عرض کریں گے کہ اگر معاشرہ اپنی سابق حالت پر قائم رہے گا، مخالف فکر لوگوں کے ذہنوں پر مسلط ہو گا اور حق و باطل کے معیارات میں کوئی تغیر نہ ہو گا تو اپنی پسند کا نظام قائم کرنا تو درکنار وہ جماعت نظم حکومت کو اس کی موجودہ سطح پر رکھنے کے بھی ناقابل ثابت ہو گی۔ نظم حکومت چند وزراء کے بل پر نہیں چلا کرتا بلکہ اس میں حکومت کے تمام شعبوں کی پوری مشینری حصہ لیتی ہے۔ ہر سکیم اور منصوبے کو عمل کا جامہ پہنانے کا کام ہمیشہ وہ غیر سیاسی لوگ کرتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمام محکموں کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان تمام منصوبوں اور سکیموں کو ان کی پوری روح کے ساتھ نافذ کر سکیں، جن کے بنیادی مقاصد کا نہ صرف یہ کہ وہ کوئی تصور نہیں رکھتے بلکہ ذہنی طور پر وہ ان مقاصد سے متفق بھی نہ ہوں۔ ان حالات میں انقلاب فکر کے بغیر کسی اصولی جماعت کا سیاسیات میں حصہ لینا اور حصول اقتدار کی کوشش کرنا قطعاً نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا۔

یہاں یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا کسی خاص نظام کی علمبر دار جماعت کو سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ ہمارا یہ موقف نہیں ہے سیاسیات میں اپنے آپ کو غیر مناسب طریقے پر موزوں وقت اور موقع سے قبل الجھا دینا اور بات ہے اور اس سے اپنے آپ کو الگ رکھنا دوسری بات۔ ایک تحریک اپنی تاسیس و ظہور کے اول روز سے ہی اپنے ماحول سے گہرا تعلق قائم کر لیتی ہے لیکن اس کا یہ تعلق اس نوعیت کا نہیں ہوتا، کہ وہ اس کے ساتھ سازگاری اختیار کرے بلکہ اس کا یہ تعلق ایک طرف مقابلے اور مخاصمت کا ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ حالات کا گہرا جائزہ لے کر تمام خرابیوں کی نشان دہی کرتی ہے اور ہر اس موقع سے فائدہ اٹھاتی ہے جو اس ماحول کی بنیادوں پر فکری ضرب لگانے کے لیے نفسیاتی طور پر موزوں و مناسب ہو۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس تحریک کے قائدین ملک و قوم کے اہم مسائل کا تجزیہ کر کے اپنے نظریات کی روشنی میں ان کا حل بھی بتاتے ہیں۔ اعلیٰ سطح کا فکری کام تو اونچی ذہنی سطح رکھنے والے حلقوں کے لیے ہوتا ہے لیکن پیش آمدہ مسائل کا تجزیہ اور ان کا حل پیش کرنے سے عوام کی فکری تربیت ہوتی ہے اور اس طرح مختلف ذہنی طبقات میں انقلاب فکر کے لیے بیک وقت تدریجی کام ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا انقلاب فکر کے مرحلے پر کسی تحریک کو جو کام انجام دینا ہوتا ہے اس کی نوعیت معاشرے کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی ہوتی ہے نہ کہ عام سیاسی جماعتوں کی طرح خود عوامی رجحانات کے سانچے میں ڈھل جانے کی۔ ظاہر ہے کہ ماحول سے یہ تعلق زیادہ گہرا اور دوررس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے ماحول سے تعلق رکھنے کی یہی صورت ہے کہ جزوی اہمیت رکھنے والے مسائل اور انتخابات میں الجھا جائے وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

ہمارا یہ نظریہ بھی نہیں ہے کہ کوئی تحریک اپنے ماحول سے کٹ کر بھی پنپ سکتی ہے جو تحریک کسی معاشرے میں مکمل انقلاب برپا کرنا چاہتی ہو اس کے متعلق آخر یہ کس طرح سوچا جا سکتا ہے کہ وہ ماحول سے الگ تھلگ رہ کر بھی اپنا کام انجام دے سکتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اپنے ماحول سے تحریک کو ہر مرحلے پر اس نوعیت کا تعلق قائم کرنا چاہیے جو اس کی ترقی اور ارتقاء کے لیے اصولی حیثیت سے موزوں ہو۔ کسی انسان اور جماعت کے لیے ایک وقت میں بہت سے کام کرنا ممکن نہیں ہوتا اس لیے ہر فرد اور جماعت کے لیے یہی مناسب ہوتا ہے کہ وہ اس قدر ذمہ داریاں قبول کرے جن سے احسن طریق پر عہدہ برآ ہونے کا امکان موجود ہو۔ ورنہ وہ اپنی قوت سے زیادہ ذمہ داریاں قبول کر کے کسی ایک ذمہ داری کو بھی اچھی طرح ادا نہ کر سکے گی۔ کسی تحریک کو اپنے کام کے ابتدائی مرحلوں میں انقلاب فکر کے لیے جو عظیم کام کرنا ہوتا ہے وہ سیاسی

سر گرمیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ دنیا میں آج تک جتنی اصولی تحریکیں ظاہر ہوئی ہیں ان کی تاریخ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام دو الگ الگ مرحلوں پر کئے گئے ہیں اور اگر کبھی ان دونوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو اس کے نتائج اس تحریک کے لیے کبھی بھی اچھے نہیں رہے۔ اس صورت میں نہ تو فکری سطح پر کوئی کام ہو سکا ہے اور نہ ہی سیاسیات میں حسب خواہش نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

انقلاب فکر کس حد تک

ہمارے ناظرین کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم سیاسیات میں عملاً حصہ لینے سے قبل انقلاب فکر کے کام کی تکمیل چاہتے ہیں۔ ایسا سمجھنا درست نہ ہو گا۔ انقلاب فکر کی تکمیل تو اس وقت ہو گی جب وہ نظام اپنے سارے اصولوں کے ساتھ قائم ہو جائے گا اور زندگی کے سارے شعبوں میں اسی کی روح جاری و ساری ہو گی۔ ہمارا مدعا در اصل یہ ہے کہ اپنی توجہات اور سعی وجہد کو اس وقت تک انقلاب فکر کے کام پر یکسوئی کے ساتھ مرکوز رکھنا چاہیے جب تک علمی حلقوں میں وہ نظام فکر اپنی برتری نہ منوا لے زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے لوگوں کی ایک معقول تعداد اس کے بنیادی اصولوں پر ایمان نہ لے آئے اور تحریک کے ساتھ ایسے کارکنوں کی ایک ایسی اچھی خاصی تعداد وابستہ نہ ہو جائے جو ایک ملک کے نظم کو اپنے اصولوں کے مطابق چلانے کے لیے کافی بھی ہو اور اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو۔ اس مرحلے کا پیشگی طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہوتا ہے اور یہ تحریک کے قائدین کا کام ہے کہ وہ اس مرحلے پر یہ طے کریں کہ اب نظام کو عملاً برپا کرنے کے لیے اقدامات کرنے کا مناسب موقع آ پہنچا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ہم تو یہ دعویٰ بھی کریں گے کہ اس فیصلے کا انحصار محض تحریک کے قائدین کے اجتہاد پر ہی نہ ہو گا بلکہ اس مرحلے پر پہنچ کر ماحول خود تقاضا کرے گا کہ وہ تحریک عملی سیاسیات میں حصہ لے۔ اس وقت حالات فطری طور پر زور کر رہے ہوں گے کہ وہ نظام قائم ہو۔ اس موقع پر سابقہ نظام کی بنیادیں ہر شخص کو منہدم ہوتی دکھائی دیں گی۔ ہر صاحب بصیرت شخص یہ گواہی دینے لگے گا کہ اب یہ نیا نظام اس ملک کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ اس وقت لوگوں کو یہ باور کرانے کی ضرورت نہ ہو گی کہ یہ نظام اب یہاں آ کے رہے گا بلکہ در و دیوار خود اس کی شہادت دینے لگیں گے۔

کسی تحریک کے لیے تو یہ مرحلہ جلدی آجاتا ہے اور کسی کے لیے دیر سے آتا ہے۔ بالفاظ دیگر بعض نظاموں کے لیے تو انقلاب فکر کا کام وسیع تر پیمانے پر کرنا پڑتا ہے اور بعض دوسرے نظاموں کے لیے اول الذکر کے مقابلے میں کم کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کا انحصار پیش نظر نظام کے نظریات اور اس نظم حکومت کی نوعیت پر ہے جسے وہ نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اگر تو ایک ایسا آزادی پسندانہ نظام مقصود ہو جس میں معاشرے کے مقابلے میں فرد کو اپنی شخصیت کے ارتقاء اور خودی کی تعمیر کے لیے کافی حد تک آزادی ہو گی تو ایسے نظام کو عملاً برپا کرنے کی براہ راست کوششوں کو اس وقت تک موخر کرنا پڑے گا جب تک حالات فطری طور پر اس کا تقاضا کرنے لگیں، جب تک اس قدر انسانی مواد (Human Material) فراہم نہ ہو جائے جس کے بل پر اس نظام کو چلایا جا سکے اور عوام کے مختلف طبقات اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق اس کے اصولوں اور اقدار کو اپنانے پر کسی نہ کسی حد تک آمادہ نہ ہو جائیں۔ لیکن اگر وہ نظام کلیت پسندانہ (Totalitarian) مزاج رکھتا ہے تو اس کے لیے انقلاب فکر کی اس حد تک ضرورت نہیں ہوتی جس قدر پہلی قسم کے نظاموں کے لیے ہوتی ہے۔ اس کمی کو ایک جابرانہ اور قاہرانہ نظم حکومت کے ذریعے بعد میں پورا کیا جا سکتا ہے لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ ایسے نظام کو برپا کرنے کے لیے تحریک کی تاسیس کے اول روز سے ہی سیاسی سطح پر سعی وجہد شروع کر دی جاتی ہے۔ نہیں، بلکہ فکر کی دنیا میں خاصا کام کرنا پڑتا ہے۔ حصول اقتدار کی براہ راست کوششوں سے قبل اس قسم کے نظام کے علمبرداروں کے لیے بھی یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ کارکنوں کی ایک اچھی خاصی تعداد فراہم کر لیں اور فکر کے دائرے میں بھی اتنا کام کر لیں کہ کم از کم اس کے اصولوں کا سکہ ضرور مانا جاتا ہو۔

پہلی قسم کے نظام کی مثال اسلام اور دور حاضر کا مغربی جمہوری نظام فراہم کرتے ہیں اور دوسری قسم سے کمیونزم اور فسطائیت تعلق رکھتے ہیں۔ اب ہم ان چاروں نظاموں پر جو اپنی ہمہ گیری کے لحاظ سے الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں، پیش نظر پہلو سے بحث کر کے اپنا مدعا واضح کریں گے۔

آزادی پسند نظاموں کی مثالیں

اسلامی نظام

مکہ کے زمانہ قیام میں جو نبوی زندگی کے نصف عرصے سے زیادہ پر مشتمل ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالصتاً تعمیر فکر و سیرت کا کام کیا۔ اس زمانے میں عام معاملات کے سلسلے میں ماحول سے الجھنے یا مروجہ سیاسیات میں حصہ لینے سے پوری طرح اجتناب کیا گیا۔ مکہ میں قائم شدہ نظام میں داعی اسلام نے کبھی کوئی مقام حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ کوشش تو درکنار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس قسم کی تمام پیشکشوں کو ٹھکرا دیا گیا۔ تاریخی حقائق اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اصولوں پر معمولی سی مصالحت (Compromise) کے تحت اکابرین قریش محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حلقے میں جو اقتدار کے ہم معنی تھا، لینے کے لیے ہر وقت تیار تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس راستے کو اختیار کرنے کے امکانات پر بھی غور نہ فرمایا اور پوری یکسوئی کے ساتھ دعوت کا کام کرتے رہے۔ حالانکہ ان حلقوں میں گھسنے حق میں بہت سے مصالح گنوائے جا سکتے تھے اور یہ دلیل دی جا سکتی تھی کہ ایک دفعہ ان میں نفو کر کے اثر و قوت کا مقام حاصل کر لیا جائے۔ پھر بتدریج موجودہ نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کیا جائے گا۔ اس کے برعکس محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طرز عمل اختیار کیا کہ چونکہ مکی دور میں قیام نظام کے اسباب فراہم نہ ہوئے تھے اس لیے نزاعوتی کام ہی جس میں تعمیر سیرت کا کام بھی شامل تھا، جاری رکھا۔ لیکن جب مدینہ میں حالات ساز گار ہو گئے تو بلا شرکت غیرے خالص اسلامی نظام برپا کر دیا۔ اس وقت تک اتنے کارکن بھی فراہم ہو چکے تھے جو قیام نظام کے لیے کافی تھے اور مدینہ کے حالات از خود بھی اس نظام کے قیام کا تقاضا کر رہے تھے۔

تاریخ سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسلامی نظام مدینہ کی ریاست کی شکل میں بالکل فطری طریق پر برپا ہوا۔ اگرچہ جنگیں بھی لڑنا پڑیں اور بہت سی ریشہ دوانیوں سے بھی سابقہ پیش آیا لیکن ان باتوں کے اسباب بالکل الگ تھے اور یہ واقعات کسی نظام کے قیام کے سلسلہ میں بھی غیر متوقع نہیں ہوئے لیکن جہاں تک قیام نظام کا تعلق ہے اس میں کوئی مصنوعی یا جلد بازی کا طریقہ اختیار نہ کیا گیا۔ حالانکہ قرآن مجید گواہی دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کو اسلام کی برکات سے مالا مال کرنے کے لیے سب سے زیادہ بے چین تھے۔ اور اس معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بے چینی محسوس کرنے کا کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا۔ قیام نظام کے لیے آمرانہ اور جبر کے طریقوں کے استعمال کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور عین اس وقت جب کہ مدینہ کی ریاست دشمنوں کے نرغے میں تھی، باہر سے فوجی حملے کئے جا رہے تھے اور اندر سے اسے سبوتاج کیا جا رہا تھا۔ شہری آزادیاں پوری طرح بحال تھیں اگر معاشرے نے اس نظام کو پورے شرح صدر اور شعور کے ساتھ قبول نہ کیا ہوتا تو یہ صورت کبھی ممکن نہ ہوتی۔

مدینہ کی اسلامی ریاست کے قیام کے بعد تکمیل و توسیع نظام کے سلسلے میں جو کام کرنے پڑے، ان کی انجام دہی ممکن ہی نہ تھی اگر مکی دور میں یکسوئی کے ساتھ ایک ایسی جماعت پیدا نہ کر لی گئی ہوتی جو فکر و عمل کے اعتبار سے پوری طرح اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اگر مدینہ کی ریاست اس ضروری ابتدائی کام سے قبل قائم بھی ہو جاتی تو نہ ان مخالفتوں کا جو پیش آئیں کامیابی سے مقابلہ ہو سکتا اور نہ مثبت طور پر اس نظام کے اصولوں کی ترویج و اشاعت ہی ہو سکتی جس کا قیام مقصود بالذات شے کی حیثیت رکھتا تھا۔ کارکنوں کی تربیت کا یہ عالم تھا کہ جس کام پر جس کارکن کو مامور کیا جاتا وہ اسے اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ آج مہذب انسان، جسے نظریات کی تعلیم اور نشر و اشاعت اور کارکنوں کی ٹریننگ کے بے پناہ ذرائع حاصل ہیں، اس پر حیرانی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر انقلاب فکر اور تعمیر سیرت کا کام قیام نظام سے قبل نہ کیا گیا ہوتا تو ایسا کس طرح ممکن ہو سکتا تھا۔ اس صورت میں آپ دیکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا حضور کے خلفاء جب کسی فوج کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو وہ اسلام کے جنگی اور بین الاقوامی قوانین کی پابندی نہ کر سکتی، اگر کسی سفیر کو کسی قبیلے یا حکومت کے سربراہوں سے گفت و شنید کے لیے بھیجا جاتا تو وہ غلطیاں کرتا، اگر تبلیغ و اشاعت دین کے لیے مبلغین بھیجے جاتے تو وہ لوگوں تک اسلام کے نظریات کو ان کی صحیح شکل و روح کے ساتھ نہ پہنچا سکتے اور اگر حکومت کے کارکنوں کو نظم و ضبط اور سیاست و معیشت کے معاملات کے سلسلے میں سرکاری ہدایات بھیجی

جاتیں تو وہ انہیں خوش اسلوبی کے ساتھ جامہ عمل نہ پہنا سکتے۔ اس کے علاوہ اگر یہ کارکن مکی دور کی بھٹی سے گزر کر سیرت و کردار کے اعتبار سے خاصی تربیت حاصل نہ کر چکے ہوتے تو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی اور اپنی نجی زندگیوں میں اس حسن اخلاق اور پختگی سیرت کا مظاہرہ نہ کر سکتے جو اسلامی نظام کی جان ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے اور نہ یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ساری کی ساری آبادی قیام نظام سے قبل ہی اس رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ قیام نظام سے قبل ایک تو اصلاح یافتہ فکر و کردار رکھنے والے کارکنوں کی اس قدر تعداد فراہم ہو چکی تھی جو قیام و استحکام نظام کے لیے کافی تھی۔ دوسرے مروجہ نظریات پر اس قدر تنقید ہو چکی تھی، جیسا کہ قرآن کی مکی دور کی سورتوں سے واضح ہے کہ ان کے ساتھ عوام کی وابستگی متزلزل ہو گئی اور تیسرے مثبت طور پر اسلامی نظریات کی برتری قائم ہو گئی تھی۔ جب یہ کام انجام دے دیئے گئے تو تکمیل نظام کے لیے مدینہ میں نظم حکومت بھی قائم کر دیا گیا بلکہ یوں کہئے کہ قائم ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر تربیت اور اصلاح و تطہیر فکر و سیرت کے کام پہلے نہ کئے گئے ہوتے تو نظام کے قیام کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور اگر انہیں ناکافی حد تک انجام دیا جاتا تو قیام نظام کے لیے کچھ کارکن تو مہیا ہو جاتے لیکن ان کی تعداد اتنی قلیل ہوتی اور ان میں صلاحیت کار کی اس قدر کمی ہوتی کہ قیام نظام کے لیے جبر اور آمریت کے طریقے اختیار کرنے پڑتے اور ایک کلیت پسندانہ نظام قائم کئے بغیر چارہ نہ ہوتا۔ لیکن چونکہ انقلاب فکر کا کام مناسب حد تک کیا جا چکا تھا، اس لیے نہ کوئی مصنوعی طریقہ اختیار کرنا پڑا اور نہ جبر سے کام لینے کی ضرورت پڑی۔

مغربی جمہوریت

اسی طرح اگر مغرب کی مادہ پرستانہ جمہوریت کے ارتقاء کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس نظام کی پشت پر ایک مضبوط اور مستقل فکر موجود ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کے متعلق اپنے مخصوص تصورات رکھتا ہے۔ اس نظام فکر نے صرف یورپ میں پائے جانے والے کلیسائی نظام ہی کو ختم نہیں کیا بلکہ اس کے سیل بے پناہ کے سامنے دنیا کے دوسرے خطوں میں پائی جانے والی تہذیبیں اور نظام بھی تنکوں کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں اور اس کی اقدار آج ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر چکی ہیں۔ اگرچہ دو عظیم جنگوں کے بعد یورپ کی سیاسی ساکھ خاصی مجروح ہو چکی ہے، دنیا کے بہت سے خطوں نے حال ہی میں مغربی ممالک کی سیاسی غلامی کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکا ہے اور بعض دوسرے ممالک اس کے لیے کوشاں ہیں، سابقہ جور و ستم کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے اور بعض نئے زخم ابھی لگ رہے ہیں۔ بعض ممالک میں تو مغرب کے

خلاف نفرت و حقارت کے غیر معمولی جذبات پائے جاتے ہیں اور قوم پرستانہ خیالات نہایت ہی متشددانہ شکل اختیار کر چکے ہیں لیکن ان تمام رجحانات و میلانات کے علی الرغم ان خطوں اور ممالک میں مغربی افکار و اقدار اور طرزِ سیاست کو ہی نہیں بلکہ مغربی طرزِ بود و باش اور اندازِ نشست و برخاست تک کو اپنایا جا رہا ہے۔ ان قوموں کے سیاسی و مذہبی رہنما رات دن مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف تقاریر کرتے اور اس تہذیب کے خاتمے کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں اور عوام ایسے خیالات پر نعرہ ہائے تحسین و ستائش بلند کرتے ہیں، لیکن اخلاق و سیاست اور تمدن و معیشت کے دائروں میں سکہ مغرب کا ہی چلتا ہے۔

اس نظام کو وجود میں لانے کے لیے گزشتہ تین چار صدیوں کے دوران اتنے کثیر التعداد مفکرین نے محنت کی ہے کہ ان کا سرسری تذکرہ بھی ان صفحات میں نہیں سما سکتا۔ جہاں اس نظام نے فلسفے کے میدان میں دنیا سے اپنی امامت تسلیم کروائی ہے وہیں عالم طبعی کی تسخیر کے معاملے میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ایٹمی توانائی کی شکل میں اس تہذیب کے ہاتھ میں ایسی قوت موجود ہے جو ایک طرف اس کرہ ارض کو ہی فنا کر دینے کا باعث ہو سکتی ہے اور دوسری طرف اگر اسے پیداواری قوتوں سے اضافے کے لیے استعمال کیا گیا تو بقیہ دنیا پر ایٹمی توانائی کے موجد ممالک اس سے بھی کہیں زیادہ فوقیت حاصل کر جائیں گے جس قدر فوقیت انہوں نے بھاپ اور کوئلے کے استعمال اور مشینی طریق پیداوار کی ایجاد سے حاصل کی تھی اور مادی حیثیت سے ان ممالک کی برتری حسب سابق قائم رہے گی۔ یہ تو تسلیم ہے کہ یہ نظام کسی خاص جماعت کی جدوجہد یا کسی منظّم تحریک کی کاوشوں کے نتیجے میں برپا نہیں ہوا لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی مادی ترقی اس کی فکری برتری کی مرہونِ منت ہے ——— اور اس وقت ہم یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

مسئلے کے جس دوسرے پہلو پر ہم روشنی ڈالنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انیسویں صدی سے قبل ——— جبکہ یہ تہذیب اپنے عروج کے نصف النہار پر پہنچ چکی تھی ——— اس نظام کے فکری خطوط پوری طرح طے پا چکے تھے اور اسی وجہ سے اس کے نفاذ کے لیے (Regimentation) کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ جوں جوں فکر ارتقاء کرتا چلا گیا نظام میں بھی پختگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ لیکن یہ بات خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ ترتیب کے لحاظ سے فکری تغیرات پہلے آتے رہے ہیں اور عملی زندگی میں ان تغیرات کے اثرات بعد میں مرتب ہوتے رہے ہیں۔

اگرچہ مزاج اور نظریات کے لحاظ سے ان دونوں نظاموں میں بعد المشرقین پایا جاتا ہے لیکن طریق نفاذ کی حد تک اسلام اور مغرب کی مادہ پرستانہ جمہوریت میں یہ مماثلت پائی جاتی ہے کہ یہ دونوں نظام ایک ایسی تدریج کے ساتھ وجود میں آئے جسے ارتقائی عمل کا نام دیا جاسکتا ہے اور دونوں ہی میں جبر نہیں پایا جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام تو ایک منظّم تحریک کے نتیجے میں قائم ہوا اور مغربی مادہ پرستانہ جمہوریت کے تصورات غیر معمولی ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے بعض ایسے مفکرین کے مرہون منت تھے جنہوں نے زندگی کے اہم گوشوں میں تحقیق و مطالعہ سے فکر کی دنیا میں ایسے نقش قائم کردئیے جن سے سوچنے کی ایک خاص نہج مقرر ہوگئی اور اس کے بعد ایک ایک شعبہ علم میں ایسے بے شمار مفکرین پیدا ہوئے جنہوں نے اس نہج پر چل کر ایک مکمل مقام فکر کو جنم دیا۔ لیکن اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ موخر الذکر طریقہ اتفاقات وحالات کا مرہون منت ہوتا ہے اور جب کوئی قوم شعوری طور پر کوئی نظام برپا کرنا چاہتی ہے تو ایسے کسی نہ کسی تنظیمی ڈھانچے کو وجود میں لانا ہی پڑتا ہے۔

کلیت پسندانہ نظاموں کی مثالیں

دوسری قسم کے نظاموں کے سلسلے میں ہم کیموزم اور فسطائیت کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے ضمن میں بھی ہم اس پہلو پر روشنی ڈالیں گے کہ قیام نظام سے قبل ان کے معاملے میں بھی فکری انقلاب کی ضرورت محسوس ہوئی، اگرچہ یہ فکری انقلاب پہلی مثالوں کے مقابلے میں خام ہوتا ہے اور اس وجہ سے تکمیل نظام کے لیے جبر (Regimentation)، آمریت (Dictatorship) اور کلیت پسندانہ (Totalitarian) طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ اگر یہ طریقے اختیار نہ کئے جائیں تو یہ نظام قائم ہو ہی نہیں سکتے جس مرحلے پر ان نظاموں کی داعی جماعتیں سیاسی انقلابات کے ذریعے عنان حکومت سنبھالتی ہیں اس وقت تک عوام وخواص ان نظاموں کے فکر واقدار کو اس حد تک نہیں اپنا چکے ہوتے کہ وہ کسی جبر کے بغیر از خود انہیں اختیار کرلیں۔

ہم یہ بات واضح کردینا چاہتے ہیں کہ ہماری رائے یہ نہیں ہے کہ یہ نظام محض اس لیے کلیت پسندانہ طرز حکومت قائم کرتے ہیں کہ سیاسی قوت حاصل کرنے سے قبل فکری انقلاب میں خامی رہ جاتی ہے۔ کلیت پسندانہ طرز حکومت کا باعث تو دراصل ان نظاموں کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ یہ نظام چونکہ زندگی کے ایک پہلو پر بہت ہی غیر معمولی زور صرف کردیتے ہیں اس لیے جبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم اپنے مدعا کو ان الفاظ میں ادا کرسکتے ہیں کہ چونکہ یہ نظام کلیت پسندانہ طرز حکومت قائم کرتے ہیں اس لیے ان کے لیے یہ ضروری نہیں

ہے کہ انقلاب فکر کے کام کو بہت زیادہ آگے بڑھا کر ہی حصول اقتدار کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ بلکہ جس وقت عوام ان کے اصولوں سے کسی حد تک روشناس ہو جاتے ہیں اور ضرورت کے مطابق انہیں تربیت یافتہ کارکن فراہم ہو جاتے ہیں تو یہ اقتدار پر قبضہ کرنے کی براہ راست کوششیں شروع کر دیتے ہیں اور انقلاب فکر کی کمی کو حصول اقتدار کے بعد جبر کے طریقوں سے پورا کر لیتے ہیں۔ بہر حال ہم یہاں اس مسئلے کے سارے پہلوؤں پر گفتگو نہیں کر سکتے، اس کے لیے طویل اور مستقل بحث کی ضرورت ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ناظرین مسئلے کے اس پہلو پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں کہ جس قسم کا نظام بھی قائم کرنا مقصود ہو اس کے لیے سیاسی اقدار کے حصول کی کوششیں کرنے سے قبل انقلاب فکر ضروری ہے۔ یہ انقلاب کس حد تک برپا ہونا چاہیے؟ اس کا تعین وہ نظام خود کرتا ہے۔

کمیونزم

کمیونزم نے مغرب میں قائم شدہ نظام کے مادہ پرستانہ تصور سے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ اسے مزید تقویت دی ہے۔ بنیادی طور پر اول الذکر کا آخر الذکر سے صرف اقتصادی دائرے میں اختلاف ہے اور سیاسی اور نظم حکومت کے طرز کا اختلاف معاشی اختلاف کا ہی مرہون منت ہے لیکن صرف اقتصادی دائرے میں مغربی نظام سرمایہ داری سے اپنے اختلاف کو واضح کرنے اور مثبت طور پر اپنے نظام کی فکری بنیادوں کو پیش کرنے میں تقریباً ایک صدی کا عرصہ صرف ہو گیا۔ تب کہیں جا کر روس میں ۱۹۱۷ء کا سیاسی انقلاب رونما ہوا اور دنیا کے صرف ایک ملک میں کیمونسٹ پارٹی کو اقتدار نصیب ہوا۔ کارل مارکس سے پہلے ہی بہت سے ماہرین اقتصادیات نے انفرادی حق ملکیت کے جواز کو فکری حیثیت سے چیلنج کر دیا تھا حتیٰ کہ اس بغاوت کے جراثیم کلاسیکی ماہرین اقتصادیات کی متعدد اہم تھیوریوں میں موجود تھے (اگرچہ کلاسیکی ماہرین کو اس کا شعور نہ تھا اور انفرادی حق ملکیت کے جواز ہی کے قائل تھے) مارکس اور اس کے محسن دوست اینگلز نے تیس سال کی محنت شاقہ سے علم اقتصادیات کی سابقہ تھیوریوں کا تجزیہ کیا اور مشینی صنعت سے پیدا شدہ نئے عمرانی حالات کی روشنی میں پرانی تھیوریوں کے مقابلے میں سائنٹیفک طریق پر اپنے اقتصادی نظریات پیش کیے۔ صرف اقتصادی نظریات ہی کی وضاحت نہ کی بلکہ ان کے لیے فلسفے کے دائرے میں فکری بنیادیں فراہم کرنے کے لیے اپنے مخصوص مابعد الطبیعاتی (Metaphysical) تصورات پیش کئے اور تاریخ کی جدلی مادیت (Dialetical Materialism) کا نظریہ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسانی معاشرے کے ابدی قوانین کے تحت اب نظام سرمایہ

داری اپنی عمر کے آخری سانس لے رہا ہے اور پیداواری قوتیں پرولتاریہ کی آمریت قائم کرنے کے لیے زمین ہموار کر رہی ہیں۔ گویا مارکس نے زندگی کا ایک مکمل فلسفہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ مارکس کی بیشتر تھیوریاں علم و عمل کے دائروں میں باطل قرار پاچکی ہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک زمانے میں ماہرین اقتصادیات کے حلقوں میں اس کے فکر سے تہلکہ مچ گیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری ربع میں ایسے بیسیوں اقتصادی ماہرین پیدا ہوئے جنہوں نے مارکس کی تھیوریوں کو اپنا کر نظام سرمایہ داری پر کڑی تنقید کی اور سیاسی دائرے میں بھی ایسا کثیر المقدار لٹریچر پیدا کیا جس کے ذریعے مارکس کے فلسفہ تاریخ اور جدلی ارتقاء کے نظریات کو بنیاد بنا کر مغرب کے قائم کردہ سیاسی و اقتصادی نظام کا تجزیہ کیا گیا اور اس کی خرابیوں کی نشان دہی کی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تصورات جنگل کی آگ کی طرح تمام علمی حلقوں میں موضوع بحث بن گئے اور یورپ کے ایوانہائے حکومت پر لرزہ طاری ہو گیا۔ کمیونزم کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی فکری و سیاسی سطح پر ان نظریات اور ان کی علمبردار جماعتوں اور تحریکوں کا نوٹس لینے پر مجبور ہو گئے۔ یورپ کے قریب قریب تمام ممالک میں ان نظریات کے تحت جماعتیں وجود میں آ گئیں۔ متعدد رسائل و اخبارات ان کی ترجمانی کرنے لگے اور سینکڑوں تصنیفات یورپ کے طول و عرض میں پھیل گئیں۔ مزدور جگہ جگہ اشتراکی اثرات کے تحت منظّم ہونے لگے اور ہڑتالوں اور ہنگامہ آرائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان نظریات کو اپنانے والوں کی تعداد سے قطع نظر خود نظام سرمایہ داری کے علمبرداروں کو اپنے فکر اور طریقوں میں ترمیمات کرنا پڑیں۔ جب حالات یہاں تک پہنچ گئے اور کمیونزم ایک مضبوط بین الاقوامی تحریک بن گئی تب کہیں جا کر روس کا انقلاب واقع ہوا۔ لیکن یہ پہلو قابل غور ہے کہ اتنے وسیع پیمانہ پر فکری کام ہونے کے باوجود جب روس میں تیس سال کی متواتر جدوجہد کے بعد کمیونسٹ پارٹی بر سر اقتدار آئی تو فکری انقلاب اس حد تک برپا نہ ہو چکا تھا کہ وہ کسی جمہوری سیاسی نظام کے قیام کے لیے کافی ہوتا۔ چنانچہ ان نظریات کے عملی نفاذ کے لیے ایک آمرانہ نظام قائم کرنے کے باوجود جبر و تشدد کے خوفناک ترین طریقے اختیار کرنے پڑے۔ کسی نظام کے قیام کے راستے کی مشکلات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ڈیڑھ صدی کے اس فکری و عملی کام کے بعد بھی آج یہ مسئلہ خود روس میں باعث اختلاف بنا ہوا ہے کہ آیا ابھی تک کمیونزم (اشتمالیت) سے پہلے آنے والا سوشلزم (اشتراکیت) کا مرحلہ بھی طے ہوا ہے یا نہیں۔ گویا منزل ابھی بہت دور ہے۔

فسطائیت

فسطائیت زندگی کے کسی ہمہ گیر اور مستقل فلسفے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ عام طور پر قوم اور نسل پرستی کے انتہا پسندانہ جذبات کے تحت قومی قوت کے نشوو ارتقاء کی خاطر تمام قومی وسائل پیداوار کو ایک متعین منصوبے کے تحت استعمال کرنے کا ضابطہ ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سیاست کے دائرے میں ایک قاہرانہ آمریت قائم کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے ہمہ جہتی اور عالمگیر نظام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے قیام کے لیے بھی بہت سا فکری کام کرنا پڑتا ہے اور عوام میں اس کے مناسب حال ایک خاص ذہنیت اور قوم اور نسل کے متعلق ایک خاص جذباتی کیفیت پیدا کرنا ہوتی ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ جنگ عظیم دوم سے قبل جرمنی کے آمر ہٹلر نے محض ہنگامہ آرائی سے یہ نظام قائم کر لیا تھا۔ یہ خیال غلط فہمی اور حالات کے سطحی مطالعہ پر مبنی ہے۔ دراصل اس نظام کے لیے جرمن قوم کے ذہن و فکر اور مزاج واحساسات ایک عرصے سے ہموار چلے آتے تھے۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ برطانیہ جہاں دنیا میں سب سے پہلے صنعتی انقلاب رونما ہوا، انیسویں صدی میں تجارتی اعتبار سے دنیا کے ایک اچھے خاصے حصے پر چھا چکا تھا۔ اٹھارویں صدی کے اخیر اور انیسویں صدی کے آغاز میں اس ملک کے ماہرین اقتصادیات نے خالص علمی سطح پر آزاد معیشت (Laissez Faire) کا فلسفہ پیش کر دیا تھا اور ایک دنیا اس فلسفے کو درست تسلیم کرتی تھی۔ یہ انداز فکر برطانیہ کے لیے تو بہت مفید تھا لیکن اس کے تحت تجارت و صنعت کے میدان میں برطانیہ کے مقابلے میں دوسرے ممالک کی مقابلے کی قوت (Competitive Power) بہت کمزور ہو جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جرمنی ایک زرعی خطہ تھا اور اس کے باشندوں میں صنعت و تجارت کو بڑھانے اور مشینی طریق پیداوار کو رائج کرنے کی شدید خواہش پائی جاتی تھی لیکن دوسرے ممالک میں اپنی مصنوعات کھپانا تو درکنا برطانیہ کی مصنوعات خود جرمنی میں آکر جرمنی کے کارخانوں کی مصنوعات کے مقابلے میں ارزاں نرخوں پر فروخت ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں جرمنی کی صنعت کے لیے ترقی کرنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آغاز ہی میں فکری و سیاسی سطح پر آزاد معیشت کے نظریے کے خلاف جرمنی میں بغاوت شروع ہو گئی۔ اس سلسلے میں جہاں فریڈرک لسٹ (Frederich List) کے زیر اثر لٹریچر پیدا ہونا شروع ہوا وہیں سیاسی و تجارتی حلقوں نے پر زور مطالبہ کیا کہ حکومت ملکی مصنوعات کے تحفظ کے لیے مثبت اقدامات کرے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تا آنکہ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں اقتصادیات کے تاریخی کتب فکر (Historical School) کی شکل میں کلاسیکی کتب کی فکری بنیادوں کو ہی چیلنج کر دیا گیا اور یہ فلسفہ

پیش کر دیا گیا کہ اقتصادیات اور معاشی ترقی کے کوئی لگے بندھے قواعد نہیں ہیں بلکہ ہر ملک کو اپنے حالات کے مطابق قواعد وضع کرنے چاہئیں۔ اس مکتب فکر کے نظریات کی صدائے بازگشت سارے یورپ کے ممالک اور امریکہ میں سنی گئی اور جرمنی میں پیداواری قوتوں کو حکومت کی نگرانی میں ترقی دینے اور ملک کی اقتصادی زندگی پر حکومت کی کڑی گرفت کی ضرورت کا رجحان زیادہ تقویت حاصل کر گیا۔ پہلی جنگ عظیم کی شکست کے بعد ایک طرف جرمن قوم کی حمیت کو معاہدہ ورسیلز سے بہت ٹھیس پہنچی اور دوسری طرف جرمنی میں قائم ہونے والی حکومتوں کی مصنوعی اور سطحی اقتصادی پالیسیوں، امریکی سرمایہ کی درآمد اور تاوان جنگ کی شکل میں جرمنی سے مصنوعات کی بڑے پیمانے پر یک طرفہ برآمد نے اقتصادی دائرے میں اس قدر ابتری پھیلادی کہ ۱۹۳۱ء کے عالمی اقتصادی بحران نے جرمن قوم کے صبر واستقلال کے لیے اس روایتی تنکے کا کام کیا جس نے اونٹ کی کمر توڑ دی۔ جرمن قوم پہلے ہی سیاسی و اقتصادی دائروں میں اپنی اجتماعی زندگی کی ترقی کے سلسلے میں مخصوص نظریات رکھتی تھی۔ اگرچہ پہلی جنگ عظیم سے قبل ہی جرمنی کی صنعتی پیداوار برطانیہ سے بھی بڑھ چکی تھی لیکن نوآبادیات کی کمی نے ان مصنوعات کی فروخت کے مسئلے کو بہت پیچیدہ بنادیا تھا۔ اور اس طرح جرمنی کی اقتصادی ترقی کے امکانات پر ایک بہت بڑی پابندی عائد تھی۔ اس مجبوری اور بے بسی نے جرمن قوم کی نفسیات میں نوآبادیاتی طاقتوں کے خلاف نفرت کے جذبات کو بھی شامل کر دیا تھا اور یہی بات پہلی جنگ عظیم کا باعث ہوئی۔ معاہدہ ورسیلز کے تحت عائد شدہ پابندیوں نے ان جذبات کو اور بھی بھڑکا دیا۔ جرمن قوم کی بے چینی کی یہ کیفیت جب نقطہ عروج پر تھی تو ہٹلر نے اپنی تصنیف ''میری جدوجہد'' کی شکل میں قوم کے سامنے جرمن قوم کی نسلی برتری، یورپ میں مملکت کو سعت دینے، جرمنی کی خارجہ پالیسی کو نئی، صحت مند اور سائنٹیفک بنیادوں پر استوار کرنے اور قوم کو ایک مضبوط نظم کے تحت منظّم کرنے کا ایک ایسا فلسفہ پیش کیا جو جرمن قوم کے مزاج و نفسیات کے عین مطابق تھا۔ اس نے دس بارہ سال کی محنت سے اپنی قوم کے ذہن کو اس بات کے لیے پوری طرح ہموار کر لیا کہ وہ اسی صورت میں سیاسی و اقتصادی حیثیت سے ترقی کر سکتی اور بین الاقوامی حلقوں میں عزت کا مقام حاصل کر سکتی ہے جبکہ وہ اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو مجتمع کر کے ایک مضبوط مرکز سے اپنے معاملات کو چلائے۔ اس نے جرمن قوم کی برتری کے اس فلسفے کو زندہ کرنے کے ساتھ جو گزشتہ صدی میں نیٹشے فکر کی دنیا میں پیش کر چکا تھا اقتصادی ترقی اور داخلی و خارجی پالیسی کا ایک واضح اور غیر مبہم نقشہ پیش کیا اور وہ اس وقت برسراقتدار آیا جبکہ وہ قوم کے بڑے حصے کے ذہن پر چھا چکا تھا۔ اس ذہنی

فضا کے ساتھ ساتھ ہٹلر نے اپنے تصورات کے مطابق ایک ایسی مضبوط جماعت کو منظّم کیا جس کا نظم دنیا کی بہتر سے بہتر فوج سے بھی زیادہ کسا ہوا تھا اور جس کے کارکنوں کے ذہن اور ان کا کردار نازی فلسفے کے رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے تھے۔ سیاسی، اقتصادی اور فوجی شعبوں میں کام کرنے کے لیے ہٹلر نے بہترین شخصیتیں پیدا کیں اور اختلافات کے باوجود ایک دنیا اور افراد کی ذہنی و عملی صلاحیتوں کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ تھے وہ حالات جن کے تحت جرمنی میں نازی ازم قائم ہوا۔

مباحث کا خلاصہ

اس باب میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کسی قوم کے لیے ان نظریات اور اصولوں کا شعور حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے جن پر چل کر اسے ترقی کی منازل طے کرنا ہوتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان اصولوں اور نظریات کو اس قوم کی فکر پر غالب آجانا چاہیے اور اس میں ان پر عمل پیرا ہونے کا شدید داعیہ پیدا ہو جانا چاہیے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب زندگی کے متعلق اس قوم کا مجموعی نقطہ نظر اور جزوی طور پر زندگی کے ایک ایک مسئلے کے متعلق اس کا زاویہ نگاہ ان اصولوں کے سانچے میں ڈھل جائے، اور اس کی اخلاقی قدریں اور سیرت و کردار ان اصولوں کی عملی تفسیر ہوں۔ ہم نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ ان اصولوں اور نظریات کی تنفیذ کے لیے حصول اقتدار سے قبل اس انقلاب فکر کی تکمیل ممکن نہیں ہوتی، بلکہ یہ انقلاب صرف اس حد تک بروئے کار لایا جائے گا——بلکہ لایا جانا ناگزیر ہے——جو اس فکر کو غالب کر دینے اور اسے نافذ کرنے کے لیے موزوں کارکن تیار کرنے کے لیے کافی ہو۔ یہ وہ کم سے کم شرط ہے جو تنفیذ نظام کے لیے ضروری ہے۔ مستقبل میں کوئی شخص یا جماعت اس قسم کے انقلاب فکر و سیرت کے بغیر کسی نظام کو قائم کر دے تو ہم اس کی اعجازی قوتوں کو تسلیم کر لیں گے، لیکن انسانی تہذیب کی گزشتہ چھ ہزار سال کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہر دور کے حالات اور پیش نظر نظام زندگی کے مزاج کے مطابق یہ انقلاب ناگزیر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اول تو اس نظریے کو لے کر چلنے والوں کو وہ اقتدار حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو اس نظام کے قیام پر منتج ہو اور اگر ہیر پھیر کے راستوں سے محض سیاسی جدوجہد کے بل پر وہ لوگ اقتدار میں حصہ دار بن بھی جائیں تو موزوں فکر، سازگار اجتماعی فضا اور تربیت یافتہ کارکنوں کے فقدان کے باعث اس نظام کو برپا کر دینا ان کے لیے ممکن نہیں ہو گا۔

ہم اس نقطے کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ دور حاضر میں کسی نظام کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے ایسی سہولتیں میسر آچکی ہیں جن کے تحت ایک مرکز سے زندگی کے تمام شعبوں کی نہ صرف نگرانی کی جا سکے بلکہ انہیں ایک ہمہ گیر منصوبے اور ضابطہ کار کے مطابق چلایا جا سکے۔ کلیت پسندانہ نظاموں کے تحت تو اقتدار کو زندگی کے سارے معاملات کی باگ ڈور براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھنا ہی ہوتی ہے، لیکن آج کے زمانے میں وہ نظام بھی جو معاشرے کے مقابلے میں فرد کو کافی حد تک آزادی عمل دینے میں زندگی کے ایک ایک گوشہ اور قومی فکر و عمل کے ایک ایک پہلو پر نگاہ رکھتے ہیں اور اچنبھے کی بات یہ ہے کہ انفرادی آزادی کی حدود کی نگہداشت اور اسے روبہ عمل لانے کا انتظام بھی مرکزی اقتدار کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس بات میں بظاہر تضاد پایا جاتا ہے لیکن واقعہ یہی ہے۔

ان حالات میں قومی زندگی کے نظم کو چلانا اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک زندگی کو ایک کل کی حیثیت دے کر اسے ایک واضح سکیم کے تحت استوار نہ کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ نہ ایسی کسی سکیم کو مرتب کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کا شعور ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جب تک زندگی کے کسی ہمہ جہتی نظریے کو اپنایا نہ جائے۔ اس صورت حال کے پیش نظر کسی نظام کو قائم کرنے کے لیے آج پہلے زمانوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر انقلاب فکر کی ضرورت ہے۔ پہلے جو طبقات حکومت اور حکومت کی پالیسیوں اور نظریات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے آج وہ بھی حکومت کے ایک ایک کام پر نگاہ رکھتے اور اس پر اظہار رائے کرتے ہیں۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ رائے دہی کے حق نے ہر بالغ شہری کو اپنے ملک کے نظم کو چلانے کے کام میں حصہ دار بنا دیا ہے۔ اس لیے جو کام بھی حکومت کے پیش نظر ہو اس کی فکری بنیادوں سے قوم کا آگاہ ہونا اور اکثریت کا اس پر ایمان لانا ضروری ہے ——— اور کسی نئے نظام کے اصولوں سے آگاہ ہونا اور اس پر ایمان لانا ہی انقلاب فکر کے ہم معنی ہے۔

دستور کی حیثیت

پچھلے باب میں ہم نے کسی قوم کی ترقی اور کسی نظام کے غلبے کا وہ فطری طریق بیان کیا ہے جس کو اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ ہمارے ہاں قومی تعمیر و ترقی کے لیے کن طریقوں اور کن ذرائع پر انحصار کیا جارہا ہے۔

پاکستان کے قیام کے ابتدائی سالوں میں حکمران طبقہ کی طرف سے تعمیر و ترقی کے سلسلے میں قوم کے تمام مطالبات کا جواب یہی دیا جاتا تھا کہ ہم ایسا دستور بنا رہے ہیں جو نہ صرف پاکستان کے لیے باعث خیر و برکت ہو گا بلکہ اس کی حیثیت ساری دنیا اور آئندہ نسلوں کے لیے روشنی کے مینار کی ہو گی۔ آپ ذرا انتظار کیجیے اور اس دستور کو بننے دیجیے اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کس طرح آپ کے مسائل حل ہوتے ہیں اور کس طرح ہماری قومی زندگی ایک نئے اور روشن باب کا افتتاح کرتی ہے۔ سیدھی سادی قوم ایک عرصہ تک اسی خیالی سی بات سے سکون و اطمینان حاصل کرتی رہی۔ اس کے بعد اگرچہ ایک دور ایسا آیا جب کہ صاحب اقتدار طبقہ دستور بنانے سے جی کترانے لگا، لیکن اب نو سال کی کشمکش کے بعد ایک دستور بنا ہے جسے ایک طرف اسلامی قرار دیا جارہا ہے اور دوسری طرف گفتگو اس انداز سے کی جارہی ہے کہ جس سے قوم کو یہ باور کرایا جا سکے کہ اس دستور کے تحت یہاں ایک نہایت ہی اچھا نظام قائم کیا جائے گا اور عوام کو یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ جیسے دستور مرتب ہو جانے سے اسلامی نظام میکانکی طریق سے ظہور میں آجائے گا۔ اگرچہ ''اسلامی دستور'' کے نفاذ کے بعد بھی جن بداعمالیوں کا صدور ہو رہا ہے ان کے پیش نظر اب زیادہ دیر تک عوام کو اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہ رکھا جا سکے گا کہ اس دستور سے لازماً اچھے نتائج نکلیں گے، البتہ اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ اب بھی بعض حلقوں کی طرف سے متواتر اس بات پر زور دیا جاتا رہے کہ دستور تو اچھا ہے اور بہت معجزے دکھا سکتا ہے لیکن فی الحقیقت حکمران گروہ غلط کار ہے اور وہ قوم کو اس دستور کی برکتیں حاصل ہونے کی راہ میں حائل ہے۔ (درحقیقت اس طرح کی باتیں شروع بھی ہو چکی ہیں اور یہ آواز بھی سنائی دے چکی ہے کہ حکمران گروہ چاہئے تو اس دستور کے

تحت اس ملک میں خلافت راشدہ کا نمونہ پیدا کر سکتا ہے) ہم چاہتے ہیں کہ اس سطحی اور خالصتاً سیاسی طرز استدلال کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کریں کہ اس قسم کا انداز فکر سرے سے ہی غلط ہے۔ دستور سے صرف مناسب توقعات ہی وابستہ کرنی چاہئیں اور ہمیں جذباتی نعروں پر اپنے فکر و عمل کی بنیاد رکھنے اور کسی ایک مسئلے کو ساری قومی زندگی کا محور قرار دینے کا طریقہ جلد از جلد ترک کر دینا چاہیے۔ زندگی کے مجموعی نقشے میں جس بات کی جس قدر اہمیت ہو اسے اسی قدر اہمیت دینی چاہیے وہ اصلاح و تعمیر کا جس قدر کام کر سکے اس سے زیادہ کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ خوش فہمیوں کی دنیا میں رہنے کا نتیجہ بالاخر مایوسی کی شکل میں ظاہر ہوا کرتا ہے، حقیقت تو اس سے نہیں بدلتی، قوم کو تو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا البتہ بعض سیاست دانوں کی شخصیتیں ضرور نمایاں ہو جاتی ہیں اور ان کا سیاسی کاروبار ضرور چمک اٹھتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہماری رائے میں دستور کے متعلق یہ غلط فہمی اب بہت جلد دور ہو جائے گی کہ یہ لازماً ایک اچھے نظام کا ذریعہ ثابت ہو گا۔ گزشتہ سوا سال کے تجربات نے ہی یہ ثابت کر دیا ہے کہ دستور نہ تو ہر معاملے میں غلط کار حکمرانوں کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے اور نہ اس میں ملک کے نظام کو بطور خود کسی خاص سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب دستور کے متعلق گفتگو کے انداز اور استدلال کے طرز میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ حکمران اپنے افکار و کردار کو دستور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں۔ گویا ایک غلط بات کو چھوڑ کر دوسری غلط بات کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دوسرا نقطہ نظر بھی حکمرانوں اور عوام کو محض پند و نصیحت کے ذریعے اس دستور کے مطالبات پورا کرنے کے لیے کہا جائے غلط ہے۔ ایسی باتیں انتخابی نقطہ نظر سے تو مفید ثابت ہو سکتی ہیں اور برسر اقتدار پارٹی کو ان سے بدنام کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے قومی تعمیر و ترقی کے لیے کبھی راستہ ہموار نہیں ہو سکتا۔ اس طرح قوم حسب سابق جزوی اور ہنگامی مسائل میں الجھی رہے گی اور اس کا زاویہ نگاہ ہمیشہ محدود رہے گا۔ اس کیفیت سے بچنے کی صرف ایک ہی تدبیر ہے اور وہ یہ کہ اجتماعی تعمیر و ترقی کے اصولوں کی شکل میں قوم کے سامنے کوئی نہ کوئی معیار ہو تا کہ ہر دعوے کو اس پر پرکھ لیا جائے اور اس کی حقیقی قدر و قیمت اور اس کی عملی حیثیت کا تعین کر لیا جائے۔ مثلاً جب قیام پاکستان کے بعد مختلف حلقوں نے اپنے انداز سے محض ''اسلامی دستور'' بنا کر اسلامی نظام قائم کرنے کا تصور پیش کیا تھا در آنحالیکہ اجتماعی زندگی کا ایک ایک شعبہ غیر اسلامی سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ تو اس وقت اس دعوے کے بے حقیقت ہونے کا اندازہ اس کو کسی نظام کے طریق نفاذ کی کسوٹی پر پرکھ کر باآسانی لگایا جا سکتا تھا،

لیکن چونکہ ہمارے ہاں کسی ایسی کسوٹی کا تصور ہی نہیں پایا جاتا اس لیے ہماری اجتماعی زندگی نعرہ بازیوں کے محور پر گھومتی چلی جارہی ہے۔

ہم کسی نظام میں دستور کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن کسی مقصد کے لیے کسی ایک چیز کا ایک عامل کی حیثیت سے اہم ہونا اور بات ہے اور اس کا حصول مقصد کا واحد ذریعہ ثابت ہونا دوسری بات۔ قومی زندگی میں مختلف عوامل مختلف مراحل پر اپنا اپنا کام کرتے ہیں لہٰذا قومی تعمیر کی کسی سکیم پر غور کرتے وقت ہر عامل کی اہمیت اور مختلف مراحل میں اس کے کردار (Role) کا صحیح تصور ہونا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملکی دستور کی اہمیت اور قیام نظام میں اس کے کردار کے متعلق کسی قدر وضاحت سے گفتگو کریں اور بتائیں کہ آج تک دنیا میں جو مختلف نظام قائم ہوتے رہے ہیں ان میں دستور کو کیا مقام حاصل رہا ہے۔

دستور کی تعریف

ہر ادارے اور تنظیمی ہئیت کو چلانے کے لیے ایک انتظامی ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ڈھانچے کی ساخت اور ترتیب کا انحصار اس ادارے کے مقاصد اور مزاج پر ہوتا ہے جس کا انتظام مطلوب ہو۔ آپ کسی تعلیمی ادارے کو چلانا چاہیں یا کاروباری فرم کو، کسی بنک کا انتظام مطلوب ہو یا کسی اصلاحی تنظیم کا، کسی سیاسی جماعت کو چلانا مقصود ہو یا کسی سماجی مجلس کو، نظم کو چلانے کے لیے آپ ہر حالت میں ضروریات کے مطابق ایک انتظامی مشینری وجود میں لائیں گے۔ اس انتظامی مشینری میں ہر کل پرزے کی ذمہ داریاں اور اختیارات مقرر ہوں گے اور ان کے باہمی تعلق کی نوعیت بھی واضح ہوگی تاکہ کام پورے تعاون واشتراک اور افہام وتفہیم کی فضا میں چلایا جاسکے اور پیش نظر مقاصد کے حصول کے لیے بہترین طریق پر سعی وجہد ہو سکے۔ انتظامی مشینری کے تمام کل پرزوں اور شعبوں کے اختیارات، ذمہ داریوں اور باہمی تعلق کے سلسلے میں جو مجموعہ قواعد مرتب کیا جائے گا اسے اس ادارے کا ''دستور'' کہا جائے گا۔

ایک ریاست کے نظم کو چلانے کے لیے جو حکومت وجود میں آتی ہے اس کا بھی ایک متعین ڈھانچہ ہوتا ہے جس کا نقشہ اس ریاست کے بنیادی مقاصد طے کرتے ہیں۔ اگرچہ تحریری دستور تو ماضی قریب ہی کی اختراع ہے لیکن ظاہر ہے کہ چاہے آپ کسی حکومت کا دستور ضبط تحریر میں لائیں یا نہ لائیں جب بھی آپ کوئی حکومت قائم کر کے اس کے ذریعے ملک کا انتظام وانصرام کریں گے عملاً ایک دستور وجود میں آجائے گا لیکن جب سے شخصی حکومت کے بجائے جمہوریت کے تصور نے مقبولیت حاصل کی ہے، یہ رجحان زیادہ سے زیادہ قوی تر ہوتا جا

رہا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ ڈور دی جائے انہیں ایک تو قوم کے سامنے جوابدہ ہونا چاہیے اور دوسرے کسی ایک منصب یا شعبہ حکومت کو اس قدر وسیع اور غیر مشروط اختیارات حاصل نہ ہونے چاہئیں کہ وہ انہیں مستبدانہ طریق پر استعمال کر سکے۔ اس رجحان کے تحت جہاں نیابتی طرز حکومت کا رواج عام ہو گیا ہے وہیں یہ طریقہ بھی چل پڑا ہے کہ ایک تحریری دستاویز جسے عوامی نمائندوں کی ایک مجلس مرتب کرے، کی شکل میں حکومت کے ترتیب پانے کے طریق اور اس کے مختلف شعبوں کے حدود و اختیارات اور ذمہ داریوں کا تعین کر دیا جائے تا کہ ایک جانے بوجھے طریق پر حکومت مرتب ہو اور کوئی ایک شخصیت یا شعبہ اتنا طاقتور نہ ہو جائے کہ وہ ظلم و تعدی پر اتر آئے اور ریاست کے اصل اجتماعی مقاصد کو پس پشت ڈال دے۔

دوسری بات جو تحریری دستور کے طریقے کو رواج دینے کا باعث ہوئی یہ ہے کہ دور حاضر میں حکومت کی ذمہ داریوں کا حلقہ اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اس کے نظم کو چلانا اب ایک یا چند اشخاص کے بس کا روگ نہیں ہے بلکہ اس کام سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک نہایت ہی وسیع اور پیچیدہ انتظامی ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ڈھانچے کی ترتیب کے کام کو اتفاقات یا شخصی رجحانات پر نہیں چھوڑا جا سکتا اس لیے ضروری سمجھا جانے لگا ہے کہ حکومت کا ایک خاص اور متعین دستور ہو۔

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جب دستور بن جاتا ہے تو اس کے بعد حکومت کے معاملات بے جان مشین کی طرح ایک لگے بندھے قاعدے کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی ہر لحظہ کثیر النوع حالات و واقعات سے دوچار رہتی ہے اور ہر موقعہ و محل کے متعلق پیشگی طور پر دستور میں مفصل ہدایات نہیں دی جا سکتیں۔ حکومت کے ذمہ داروں کو آئے دن نئے نئے واقعات اور مسائل سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے اور ضروری ہے کہ انہیں ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کسی نہ کسی حد تک اختیار و تمیز کی آزادی دی جائے۔ اس لیے عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ دستور حکومت کے مختلف مناصب اور شعبوں کے حدود و عمل کے لیے بنیادی خطوط مقرر کر کے انہیں ایک اصولی رہنمائی دے دیتا ہے اور ان حدود کے اندر رہتے ہوئے انہیں استعمال اختیارات کی کافی حد تک آزادی ہوتی ہے۔ اس لیے عملاً یہی صورت ہوتی ہے کہ حکومت کے ذمہ داروں کے طرز عمل کو ان کا اپنا مخصوص فکر و کردار ہر وقت متاثر کرتا رہتا ہے۔ مثلاً آپ مقنّنہ کے لیے قانون سازی کے اختیارات کے حدود تو مقرر کر سکتے ہیں لیکن یہ تو ناممکن ہے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اسے غلط قسم کی قانون سازی سے بھی از روئے دستور روک سکیں۔ اگر مقنّنہ میں کسی ایسی جماعت کو اکثریت حاصل ہو

جائے جس کے افراد خود غرض اور اقتدار پرست ہوں تو وہ عین دستوری حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسی قانون سازی کریں گے جو ظلم وتعدی پر مبنی اور دستور کی روح کے سراسر منافی ہو۔ اور اگر زندگی کے متعلق کچھ خاص نظریات رکھنے والی کوئی ایسی جماعت برسر اقتدار آجائے جو دستور سازوں کے نظریات سے مختلف نظریات رکھتی ہو تو وہ بھی دستوری حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسی قانون سازی کر سکے گی جس سے قومی زندگی میں ایسے رجحانات پرورش پانے لگیں جو دستور کی اصل روح سے مختلف ہوں۔ دراصل ہر دستور میں ایک قدر لچک موجود ہوتی ہے کہ اس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے مختلف نظریات رکھنے والی جماعتیں حکومت کے نظم کو چلا سکیں۔ مثلاً برطانیہ میں ایک ہی دستور کے تحت کبھی کنزرویٹو پارٹی حکومت چلاتی ہے اور کبھی لیبر پارٹی، حالانکہ ان کے اجتماعی نظریات میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اسی طرح انتظامیہ کو آپ مقنّنہ یا عوام کے سامنے براہ راست جوابدہ قرار دے سکتے ہیں لیکن اسے از روئے دستور وجود میں لانے کے بعد ان حدود کے اندر جو آپ دستور میں اس کے لیے مقرر کر دیں گے، خاصی آزادی عمل دینا ہو گی۔ مقنّنہ کے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ، سیاسی و معاشی دائروں میں ایک خاص پالیسی کی ترویج اور غیر ممالک سے معاملہ کرنے کے اختیارات تو بہر صورت انتظامیہ کو حاصل ہی ہوں گے اور دستور کے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہ ان میں سے ایک ایک معاملے کے لیے تفصیلی ہدایات دے دے۔ ظاہر ہے کہ ان سب ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ان کا فکر و کردار انہیں ہر وقت متاثر کرتا رہے گا۔ یہی حال عدلیہ کا ہے۔ عدلیہ کو عام طور پر دستور کا محافظ اور عوام اور اقتدار کے درمیان پیدا ہونے والے نزاعات اور اختلافات کا فیصلہ کرنے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر عدلیہ انتظامیہ کے زیر اثر آجائے یا ملکی سیاسیات میں الجھ جائے تو دستور اس کا کوئی علاج نہیں کر سکتا۔

دستوری قانون کی یہی محدودیت ہے جس کی وجہ سے دستوری لٹریچر میں دستوری روایات (Constitutional Conventions) کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، اور ماہرین دستوریات دساتیر عالم کے اصولوں کی بحث میں دستوری روایات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ آج کل ان ممالک کو چھوڑ کر جن کی سیاست تخریب پسند، بد دیانت اور خود غرض عناصر کی گرفت میں آچکی ہے اس بات کا کم ہی موقعہ آتا ہے کہ کسی بااصول جماعت کی حکومت کے کسی فعل پر اس حیثیت سے اعتراض کیا جا سکے کہ وہ قانونی نقطہ نظر سے خلاف دستور ہے بلکہ جب بھی کوئی شک پیدا ہوتا ہے وہ دستوری روایات

واخلاقیات سے ہی متعلق ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی دستوری روایت کی خلاف ورزی پر عدالت میں انتظامیہ یا مقنّنہ کے کسی فعل کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا لیکن بااصول قیادتیں اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھتی ہیں کہ ان کا کوئی فعل مروجہ دستوری روایات سے ٹکرانے نہ پائے۔ مثلاً برطانیہ میں دارالعلوم کی مدت عمر چار سال ہے۔ ملک کے اندر چاہے جو حالات بھی پیدا ہو جائیں جب تک کسی جماعت کو ایوان کے اندر اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، اسے اقتدار سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ لیکن اس ملک میں یہ نظریہ ایک دستوری روایت کی حیثیت رکھتا ہے کہ اگر کسی وقت ملک کے اندر کوئی ایسا اہم مسئلہ پیدا ہو جائے جو انتخابات کے وقت نمایاں نہ تھا اور اس پر عوام کی رائے نہ لی جا سکی تھی تو برسر اقتدار پارٹی خود ہی وقت سے پہلے ایوان کی تحلیل کی تجویز پیش کر دیا کرتی ہے اور اس طرح اقتدار سے محروم ہو جانے کا خطرہ مول لے لیتی ہے۔ برطانیہ کی پارلیمانی زندگی کی تاریخ میں ایسے بیسیوں مواقع پیدا ہو چکے ہیں اور مختلف جماعتوں کی حکومتوں نے اس دستوری روایت کا احترام کیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دستوریات کے سلسلے میں اسی طرح اخلاقی قدریں وجود میں آ چکی ہیں جس طرح انسان کی عام مجلسی زندگی میں۔ اگرچہ ان دستوری اخلاقی قدروں کی خلاف ورزی پر حکومت کے کسی عہدہ دار یا ادارے کے خلاف عدالت میں اسی طرح چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی جس طرح ہماری عام مجلسی زندگی میں کسی شخص کی خلاف اخلاق حرکت پر، چاہے وہ انتہائی طور پر قبیح ہی کیوں نہ ہو، عدالت میں استغاثہ دائر نہیں کیا جا سکتا لیکن جس طرح مجلسی آداب کا احترام ختم ہو جانے پر کسی معاشرے میں بداخلاقیاں رواج پا جاتی ہیں اور اس معاشرے کو کوئی طاقت تباہ ہونے سے نہیں بچا سکتی اسی طرح دستوری اخلاقیات کے پامال ہو جانے سے حکومت ریشہ دوانیوں اور تخریبی کارروائیوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دستور ایک غیر ضروری شے ہے اور اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے؟ نہیں، ہمارا یہ موقف نہیں ہے دستور کے بہت سے مثبت اور منفی فوائد ہیں اور دور حاضر میں اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دنیا میں ہر چیز سے بعض فوائد تو حاصل کیے جا سکتے ہیں اور بعض دوسرے فوائد حاصل کرنا اس سے ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا کسی چیز کے استرداد کے لیے اس بات کو وجہ جواز نہیں بنایا جا سکتا کہ اس سے فلاں فلاں فائدے حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ طرز حکومت کے تواتر و تسلسل، حکومت کے مختلف شعبوں میں توازن، قوت و اقتدار کے قیام اور عوام و حکومت کے باہمی تعلق کے تعین کی خاطر دستور از حد ضروری ہے۔ لیکن جس طرح کسی معاشرے کو محض قانون کے بل پر ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ نہیں رکھا جا

سکتا اور تعلیم و تربیت کے ذریعے افراد میں احساس ذمہ داری، فرض شناسی اور اخلاقی اقدار کا شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح محض دستور صاحب اقتدار طبقہ کے حسن عمل اور کسی صالح نظام کے وجود میں آجانے کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ لیکن دستور سے اسی قدر توقعات وابستہ کرنی چاہئیں جن کے پورا ہونے کا امکان ہو۔

دستور سے صحیح نتائج پیدا کرنے کی شرائط

درحقیقت دستوری روایات و اخلاق کی پابندی کی ضمانت صرف اس صورت میں مہیا ہو سکتی ہے جب کہ ایک مضبوط رائے عامہ اس کی نگرانی کے لیے موجود ہو۔ اس دور جمہوریت میں دنیا کا ہر دستور، چاہے وہ کسی جمہوری ریاست کا ہو یا کلیت پسند ریاست کا، ایک متعین اور مقررہ وقفے پر مقنّنہ اور انتظامیہ کو انتخابات کے ذریعے عوام کا سامنا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر کسی ملک کی رائے عامہ بیدار ہو، شہریوں میں کوئی قومی کردار پایا جاتا ہو اور ان میں ملکی مسائل اور ان کے حل کا شعور موجود ہو تو عوام ہمیشہ ایسے نمائندے منتخب کرتے ہیں جو قابل اعتماد بھی ہوں اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی مختلف جماعتیں قوم کے سامنے قومی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں اپنا اپنا پروگرام پیش کرتی ہیں۔ ان جماعتوں کے کارکنوں کی زندگیاں عوام کے سامنے ہوتی ہیں، وہ جماعتیں اپنے اپنے نظریات رکھتی ہیں اور ان کے کارکنوں نے اپنی صلاحتیوں اور توانائیوں کا ایک بڑا حصہ ان نظریات کی اشاعت و ترویج میں صرف کیا ہوتا ہے۔ ایک طرف ان جماعتوں کے اپنے کارکنوں کا ایک خاص مزاج بن چکا ہوتا ہے اور وہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنے مخصوص مزاج اور اصولوں کی خلاف ورزی آسانی سے نہیں کر سکتے اور دوسری طرف انہیں ہر وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک بیدار رائے عامہ ان کے اعمال کا مشاہدہ کر رہی ہے اور انہیں ان نظریات کی کسوٹی پر پرکھ رہی ہے جنہیں پیش کر کے انہوں نے عوام سے ووٹ حاصل کئے تھے اور ایک متعین وقفے کے بعد انہیں پھر انتخابات کے ذریعے اسی رائے عامہ کا سامنا کرنا ہے۔ چنانچہ اپنے اعلان کردہ اصولوں سے وابستگی اور ان کی لاج رکھنے کی تمنا اور رائے عامہ کی مخالفت کا ڈر مل کر برسر اقتدار جماعت کو جہاں تعمیر و ترقی کے ان وعدوں کو پورا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں جو انہوں نے عوام سے کر رکھے ہوتے ہیں وہیں یہ دونوں چیزیں انہیں استعمال اختیارات میں دستوری اخلاق کی پابندی پر مجبور کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر دستور کو چلانے والی برسر اقتدار جماعتیں بااصول نہ ہوں اور ان کی نگرانی کے لیے ایک باشعور رائے عامہ موجود نہ ہو تو دستور کا

اپنی صحیح سپرٹ کے ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا اور چاہے دستور میں آپ جس قدر تحفظات بھی رکھ دیں یہ چیز بااصول سیاسی جماعتوں اور باشعور رائے عامہ کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی۔

دستور اور نظام کا تعلق

دستور کے متعلق ہماری انتہا پسندی

کسی نظام کے قیام کی صورت اور ملکی دستور کے کردار (Role) کی نوعیت واضح کرنے کے بعد ان دونوں کے تعلق کا تعین کرنا آسان ہے جیسا کہ ہم نے اس سے قبل عرض کیا ہے ہمارے ہاں ایک عرصے سے یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ دستور اس ملک میں تعمیر و ترقی کے کام کا ضامن ہو گا۔ جو لوگ اسلامی نظام کے متمنی ہیں انہوں نے اپنی تمام تر توجہات کو پہلے تو ایک ایسا دستور مرتب کرانے کی جدوجہد پر مرکوز کئے رکھا جس کے ذریعے اس ملک میں قانون سازی قرآن و سنت کے اصولوں کی پابند ہو جائے[۸]۔ اور اب وہ اس دستور کا سہارا لے کر حکمرانوں اور عوام سے یہ مطالبات کئے چلے جا رہے ہیں کہ اپنے آپ کو اسلام کے مطابق ڈھالو۔ چنانچہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے اب وعظ و نصیحت کی اس مہم پر تکیہ کیا جا رہا ہے۔ نیز جو لوگ اس ملک میں مغرب کی مادہ پرستانہ جمہوریت کی کسی شکل کو رائج کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اسی آرزو کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ دستور جلد از جلد مرتب کیا جائے۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً اقتدار حاصل کرنے والے گروہوں نے بھی آج تک یہی تاثر پھیلایا ہے کہ دستور بن جانے دیجیے اس کے بعد قومی تعمیر کے کام کا آغاز ہو گا۔ گویا دستور کو اس ملک میں بالاتفاق قیام نظام کا واحد ذریعہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ مزید براں ترتیب دستور کے کام کے اختتام پر مختلف دینی

---

[۸] یہ ایک نہایت ہی عجیب و غریب واقعہ ہے کہ آج تک اس بات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی کہ بحالات موجودہ حکومت کا کس قسم کا ڈھانچہ اسلام کے اجتماعی اصولوں کے نفاذ کے لیے مفید ہو گا۔ اس کے برعکس اس ایک شق کو اپنی تمام تر جدوجہد کا محور بنایا گیا ہے کہ قانون سازی کو قرآن و سنت کے اصولوں کا پابند بنایا جائے۔ چنانچہ جس دستور کو "اسلامی" قرار دیا جا رہا ہے اس میں صرف یہ صراحت ہے کہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ اسلام کے اصولوں کو نافذ کرنے کا جو طریقہ دستور میں تجویز کیا گیا ہے اس سے ملک کے دینی حلقوں نے بالاتفاق عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے لیکن اس کے باوجود دستور کو "اسلامی" ہی قرار دیا گیا ہے۔

وسیاسی حلقوں اور دستور سازوں کی طرف سے جن الفاظ میں دستور کا خیر مقدم کیا گیا ان سے بھی اسی تاثر کی نشان دہی ہوتی ہے کہ دستور اب اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

عین ممکن ہے بعض حضرات اپنے سابقہ طرز عمل کے برعکس اب یہ دعویٰ کریں کہ ہم تو دستور کو اپنے تمام دکھوں کا واحد علاج تصور نہیں کرتے۔ ان حضرات سے ہم کوئی تعرض نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اس ملک میں آج تک دینی وسیاسی جماعتوں نے عملاً جو طرز عمل اختیار کئے رکھا ہے اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ چاہے ان جماعتوں کے اکابرین بھی دستور کو قیام نظام کا واحد ذریعہ نہ سمجھتے ہوں لیکن اجتماعی زندگی کی تعمیر کے دوسرے تمام تقاضوں کو یکسر نظر انداز کرکے جس طرح اس ملک میں تدوین دستور پر کلی توجہ صرف کی گئی ہے اس سے عمل اسی اصول پر ہوا ہے کہ دستور ہی وہ واحد نسخہ ہے جو اس ملک کی مشکلات دور کرنے اور زندگی کو کسی خاص نظام کے اصولوں کے مطابق استوار کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے اور عوام نے دستوری جدوجہد سے ہمیشہ یہی تاثر لیا ہے۔ اگرچہ مسئلہ دستور نو سال تک اس ملک میں موضوع بحث بنا رہا ہے لیکن کسی جماعت یا رہنما کی طرف سے ایک بار بھی اس بات کو واضح نہیں کیا گیا کہ دستور تو قومی تعمیر کے پروگرام کی ایک شق ہے اور اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اور بھی بہت سے کام کرنے ہوں گے۔ دستوری مہم کو اس انداز سے چلانے کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر آپ اسلامی دستور کے حامیوں میں سے کسی کے ساتھ یہ بات بھی کرتے تھے کہ ہماری مشکلات کا دستور ہی واحد علاج نہیں ہے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اسلامی دستور بن جانے پر اسلامی نظام آپ سے آپ وجود میں آجائے تو مخاطب کے جذبات کو بہت ٹھیس پہنچتی تھی اور اس قسم کے خیالات کو اسلامی دستور کی مہم کو سبوتاژ کرنے کے مترادف قرار دیا جاتا تھا۔ اس سے صاف طور پر واضح ہے کہ اسلامی دستور اور اسلامی نظام کو ہم معنی سمجھ لیا گیا تھا۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ''اسلامی دستور'' بن جانے پر اب بعض لوگ اپنی زبانوں پر یہ بات لائے ہیں کہ اگر عوام اور حکمرانوں نے اپنے رویے میں تبدیلی نہ کی تو دستوری دستاویز کو کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ وقعت حاصل نہیں ہوگی۔ لیکن یہ بات اب مجبوری کے تحت اور آئندہ کے سیاسی عزائم کے نقطہ نظر سے کہی جارہی ہے۔ گزشتہ ایک سال میں ہر شخص نے اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کر لیا ہے کہ ''اسلامی دستور'' نے اس ملک کے نظام میں یک سر مو تبدیلی نہیں کی۔ اس لیے اب عوام کے حافظے کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر موقف بدل لیا گیا ہے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں اول روز سے ہی متوازن فکر پیش کرنا چاہئے اور ہر مسئلے کو اسی قدر اہمیت دینی چاہئے جس قدر اسے اجتماعی زندگی کی پوری سکیم میں حاصل ہو۔ مخصوص سیاسی مصالح کی بنا پر کوئی غیر حقیقی نقطہ نظر پیش کرنا قوم پر بہت بڑا ظلم ہے۔

بہر حال ہم یہ چاہتے ہیں کہ دستور اور نظام کے تعلق کا تجزیہ کرکے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں کہ دستور کے معاملے میں جو نظریات پہلے پیش کئے گئے ہیں یا اب پیش کیے جارہے ہیں ان میں کس حد تک صداقت یا حقیقت پائی جاتی ہے۔

دستور میں قوت نافذہ نہیں ہوتی

ہم اس سے قبل یہ واضح کر چکے ہیں کہ کسی نظام کے اصولوں پر شعوری ایمان، ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی مخلصانہ آرزو اور اس کے ساتھ اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے عملی جدوجہد اس کے قیام کی لازمی شرائط ہیں۔ جب ان شرائط کو پورا کر دیا جاتا ہے تو اس کے بعد کسی معاشرے کے تمام شعبے ایک ارتقائی عمل کے تحت اس نظام کا رنگ قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم نے اس امر کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ دستور کسی ملک کے نظم حکومت کے ڈھانچے کا ایک ایسا نقشہ ہوتا ہے جس میں اس ملک کی اجتماعی زندگی کے مقاصد کی طرف بھی اشارات موجود ہوتے ہیں۔ اس نقشے کی حیثیت بھی قریب قریب وہی ہوتی ہے جو کسی دوسرے ادارے یا جماعت کے دستور کی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ محض کسی ادارے کے دستور کی ترتیب اس ادارے کے مقاصد کے حصول کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ حصول مقصد کی خاطر بہت سے کام کرنے ناگزیر ہوتے ہیں، ان میں دستور سازی فقط ایک کام یا شق کی حیثیت تو ضرور رکھتی ہے لیکن اس ادارے کے مقاصد کا پورا ہونا ان تمام ذرائع و وسائل کی فراہمی پر موقوف ہے جو ان مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہوں۔

ہم اپنے مدعا کو ایک مثال کے ذریعے واضح کریں گے۔

فرض کیجیے آپ تعمیر عمارات کے لیے ایک کاروباری ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس ادارے کو چلانے کے لیے آپ ایک دستور العمل بھی مرتب کر لیتے ہیں۔ اس کے لیے کچھ ایسے کارکن بھی جمع ہو جاتے ہیں جو انجنیئر نگ کے فن سے تو واقف نہیں البتہ اس ادارے کو چلانے کی تمنا کا اظہار ضرور کرتے ہیں لیکن آپ اس ادارے کے لیے نہ تو سرمایہ مہیا کرتے ہیں اور نہ ایسے انجنیئر فراہم کرتے ہیں جو تعمیر عمارات کا کام کر سکیں۔ اب آپ سوچئے کہ کیا اس دستور العمل کے مرتب ہو جانے، انجنیئر نگ کے فن سے نابلد افراد کے فراہم

ہو جانے، ان افراد کے تمام مناصب پر متمکن ہو جانے اور ان شعبوں کو ترتیب دے دینے کے باوجود جو از روئے دستور آپ مرتب کرنا چاہتے ہیں اس ادارے کو اپنے مقاصد کے حصول میں کامیابی ہو گی؟ کوئی عقل کا اندھا ہی ہو گا جو اس کا جواب اثبات میں دے گا۔ دستور مرتب کرنا نہایت ہی ضروری کام تھا۔ اس کے بغیر نہ تو تقسیم کار ممکن تھی اور نہ معروف قاعدوں کے تحت اس ادارے کے نظم کو بطریق احسن چلایا جا سکتا تھا۔ لیکن کیا اس دستور کی ترتیب سے قبل اس پہلو پر غور کر لینا زیادہ مناسب نہیں تھا کہ ہم جس مقصد کو سامنے رکھ کر دستور بنا رہے ہیں اس کے حصول کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ اور کیا عقلمندی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ہم دستور مرتب کرنے سے پہلے نہیں تو کم از کم اس کے ساتھ ساتھ انجنیئر فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ کیا آپ صحیح کارکن اور سرمایہ فراہم کئے بغیر دستور بنانے پر دوسروں کے مضحکہ کا ہدف نہ بنیں گے؟ اور اگر آپ دوسروں کی تضحیک کی پرواہ کئے بغیر اپنے مقصد کے شوق میں اپنے ادارے کا دستور بنا بھی لیں تو دستور کی ترتیب اور فن انجنیئرنگ سے ناواقف لوگوں کو ادارے کے مناصب پر مقرر کرنے کے بعد آپ یک لخت نامرادی و خجالت کے ایک نہایت ہی عبرتناک احساس میں مبتلا ہو جائیں گے؟

ہم قومی زندگی میں نظام و دستور کے تعلق کی جس نوعیت کو واضح کرنا چاہتے ہیں وہ انجنیئرنگ کی اس فرم کے مجموعی نظام اور اس کے دستور کے تعلق ہی کے مشابہ ہے۔ دستور دونوں صورتوں میں ضروری ہے، لیکن اس کی اہمیت اپنی کچھ حدود رکھتی ہے اور اسے ان حدود سے بڑھا دینا کسی طرح بھی آپ کی آرزوؤں کی تکمیل کا باعث نہیں ہو سکتا۔ آپ کو کوئی شخص ترتیب کار کے عام فہم اصولوں کو ملحوظ رکھنے پر تو مجبور نہیں کر سکتا لیکن عقلمندی کا یہی تقاضا ہے اور تضیع محنت سے بچنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ انسان ہر کام کے مختلف مراحل کی مناسب ترتیب کو پیش نظر رکھے۔ اگر آپ انجنیئرنگ کے اس کاروباری ادارے کی مثال پر غور کریں گے تو یقیناً آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اگر سرمایہ اور صحیح قسم کے ترتیب یافتہ کارکن میسر آ جائیں تو کسی ادارے کا دستور مرتب کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ نہ صرف یہ کہ مشکل نہیں بلکہ کام کی نوعیت کا صحیح شعور رکھنے والے جن لوگوں کو اصل کام کرنا ہو وہی اس ادارے کا دستور مرتب کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ ان ماہرین کی عدم موجودگی میں جو دستور بنایا جائے گا اس میں لازماً بہت سی خامیاں ہوں گی۔ اس دستور میں اگر آپ یہ لکھ دیں گے کہ ہم تعمیر عمارات کا کام کرنا چاہتے ہیں تو اس سے کچھ زیادہ فرق واقع نہ ہو گا۔ دستور کا اصل اور اہم حصہ تو وہ ہے جس کے ذریعے اس ادارے کا وہ نظم وجود میں آئے گا جس نے حصول مقصد

کے لیے کام کرنا ہے اور اس حصے کو مرتب کرنے کے لیے وہی لوگ موزوں ہو سکتے ہیں جو اس مقصد کے لیے کام کرنے کی فکری و عملی صلاحیت واہلیت رکھتے ہوں۔

دستور خود بخود آتا ہے

اس مثال سے آپ پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ قومی زندگی میں اجتماعی اصولوں پر شعوری ایمان اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت شرط اول کی حیثیت سے بدرجہ اولی ضروری ہے۔ اگر یہ صلاحیتیں پیدا ہو جائیں تو جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں فطری طریق پر کام کرنا ہوتا ہے اسی طرح دستور بھی لازماً ان مقاصد کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جاتا ہے جن کا حصول پیش نظر ہو۔ بلکہ اس صورت میں ترتیب دستور کا کام مجموعی نقشہ کار میں کچھ بہت زیادہ اہم اور کٹھن دکھائی نہیں دیتا، بلکہ جو قوم کچھ اصولوں کو اپنانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے وہ لازماً اور بالکل منطقی طور پر نظم حکومت کا ایک ایسا ڈھانچہ مرتب کرتی ہے جو ان اصولوں کے نفاذ کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس مرحلے پر پہنچ کر دستور ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور اس کے لیے کسی خصوصی جدوجہد یا مہم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نقطہ نظر سے دستور حصول مقصد کے ایک ذریعے سے زیادہ کچھ نہیں اور کسی جماعت یا قوم کو جو کوئی خاص مقصد ہی نہ رکھتی ہو ایسے ذرائع اختیار کرنے کی ترغیب دینا یا مجبور کرنا جو کسی مقصد کی طرف لے جانے والے ہوں نہایت ہی مضحکہ خیز حرکت ہے۔ جس طرح ایک شخص اپنے منتہائے مقصود کو حاصل کرنے کے لیے پورے اطمینان کے ساتھ مناسب ذرائع اختیار کرتا ہے اسی طرح جو قوم تعمیر و ترقی کا کوئی نصب العین اپنا لیتی ہے وہ لازماً اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ حکومت کے ڈھانچے کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ موزوں بنائے۔

لیکن دنیا میں آج تک کسی نظام کے قیام کی ابتدا تدوین دستور سے نہیں ہوئی اور نہ تاریخ اقوام میں کوئی ایسی مثال مل سکتی ہے کہ کوئی دستور قیام نظام کا ذریعہ ثابت ہوا ہو۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ قیام نظام کی سب سے پہلی شرط اس کے اصولوں پر شعوری ایمان ہے اور عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی قوم متعین اصولوں کے تحت اپنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے ان اصولوں اور زندگی کے عملی معاملات پر ان کے اطلاق کے ڈھنگ اور طریقے کا صحیح تصور پیدا کیا جاتا ہے۔ جو لوگ ان اصولوں کو پیش کرتے اور انہیں زندگی پر نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں قوم اجتماعی کی باگ ڈور ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ اور وہ عنان اقتدار

سنبھالنے کے اول روز سے کسی دستور کے بغیر ہی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان اصولوں کا نفاذ شروع کر دیتے ہیں۔ دنیا میں زندگی کے مختلف ضابطوں کی ترویج و تنفیذ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم یہ طے کر لیتی ہے کہ اس نے فلاں ضابطہ زندگی کو اپنانا ہے تو ان اصولوں کے نفاذ میں تو قوم کی اس آمادگی کے باوجود بہت سی مشکلات [۹] کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن دستور کی ترتیب کے لیے کبھی کسی خاص سعی و جہد کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ جب ترویج نظام کا کام کچھ ابتدائی مراحل طے کر لیتا ہے اور اس دوران میں کام کی نوعیت کے مطابق انتظامی مشینری کا ڈھانچہ حسب ضرورت وجود میں آجاتا ہے تو اس وقت جا کر قوم اور قائدین کے ذہنوں میں اس نظام کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حکومت کے ایک موزوں ڈھانچے کا واضح تصور ابھرتا ہے۔

عملاً اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اگر کسی نظام کی علمبردار جماعت کسی ایسے انقلاب کے ذریعے بر سر اقتدار آئی ہو جس کی وجہ سے پہلا نظام درہم برہم ہو گیا ہو اور نظم کا سابقہ تسلسل ٹوٹ گیا ہو تو اسے عام طور پر ایک عرصے کے لیے آمرانہ حیثیت اختیار کر لینا ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ کام اپنے نظریات کے مطابق ہی کرتی ہے اور ضروری نہیں کہ اس آمریت میں قہر و جبر کی خصوصیات بھی پائی جائیں۔ اس دوران میں وہ جماعت اپنے پروگرام اور نظریات کے ان حصوں کو جو فوری طور پر نافذ کئے جا سکتے ہیں، یا جن کے معاملے میں اپنی جد وجہد انقلاب کے دوران اس نے عوام سے اس طرح کے غیر مشروط وعدے کر رکھے ہوں کہ جن کے ایفاء میں تاخیر خلاف مصلحت ہو، نافذ کرنے کی ابتدا کر دیتی ہے۔ اس زمانے میں اس کا ہر قدم تعمیر و ترقی کے اس نصب العین کی طرف اٹھتا چلا جاتا ہے جسے اس نے اپنے سامنے رکھا تھا۔ تبدیلی کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ سیاست، معاشرت، معیشت اور اخلاق اس کے اصولوں کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کو لانے اور اپنی پسند کا نظام قائم کرنے کے لیے پہلے سے مختلف حکومتی مشینری کی ضرورت

---

[۹] ۔ عوام کا بھی عام طور پر یہی خیال ہوتا ہے اور سیاست دان بھی انہیں یہی باور کرانے کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ جو لوگ کسی نظام کے متعلق تھوڑی بہت معلومات رکھتے ہوں وہ قومی زندگی کی سربراہی سنبھالتے ہی نہایت آسانی کے ساتھ اس نظام کو برپا بھی کر دیں گے۔ لیکن عمل کی دنیا میں ایسے نہیں ہوا کرتا۔ یہ بات مشاہدے سے ثابت ہے کہ نفاذ کا مرحلہ بہت کٹھن ہوتا ہے اور ابتدائے کار ہی سے ایسی ایسی پیچیدگیوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عظیم فکری و فنی صلاحیتوں اور کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو زندگی صدیوں سے ایک خاص نہج پر چل رہی ہو اس میں ایک ہمہ جہتی تغیر پیدا کرنا مذاق نہیں ہے۔

ہوتی ہے۔ یہ ڈھانچہ قدرتی طور پر حالات کے دباؤ کے تحت ایک تدریج کے ساتھ وجود میں آتا ہے۔ابتدائی تعمیری کام سے فارغ ہو کر یا اس تعمیری کام کو ایک خاص نہج پر ڈال دینے کے بعد اس ڈھانچے کو، جو وجود میں آچکا ہوتا ہے، دستوری شکل دے دی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ پہلی دفعہ مرتب کیا ہوا دستور ہی پوری طرح اس نظام کے مطابق ہو۔ بلکہ جوں جوں قیام نظام کا کام ارتقائی منازل طے کرتا جاتا ہے حکومت کے ڈھانچے یعنی دستور میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔

انقلاب کی دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ کسی نئے نظام کی داعی جماعت بالکل دستوری اور آئینی ذرائع سے بر سر اقتدار آئے اور سابقہ نظم کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ اس طرح بے دستوری کے کسی دور سے سابقہ نہیں پڑتا بلکہ کام کی ابتدا سابقہ دستوری ڈھانچے کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ایسی صورت میں تعمیر و ترقی کے کام کی ابتدا کی خاطر بر سر اقتدار جماعت ابتدائی مراحل میں ہی دستور بنا سکتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جو نظام وہ بر پا کرنا چاہتی ہے وہ اس دستور کا مرہون منت ہو گا۔ یہ صورت نہیں ہوتی، بلکہ وہ جس طرح اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبوں میں اصلاحات کرتی ہے اسی طرح حکومت کے نظم میں اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق اصلاح کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اصلاح یا اس اصلاح کی غرض سے دستور مرتب کرنے کے لیے کسی جد وجہد یا مطالبے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ وہ جماعت یہ کام کرنے پر اپنے اصولوں کے تقاضوں کی وجہ سے مجبور ہو گی۔ اگر اسے زندگی کو اپنے اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہے تو لامحالہ اسے حکومت کی مشینری میں مناسب ردو بدل کرنا ہو گا۔ لیکن ایسا دستور آج تک مرتب نہیں کیا گیا جو حکمرانوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کسی خاص نظام کو برپا کرنے پر مجبور کر دے۔ جہاں تک کسی نظام کو قائم کرنے کا تعلق ہے ہمیشہ یہی صورت دیکھنے میں آئی ہے کہ اگر قوم کسی تغیر کے لیے تیار ہو اور ایسی قیادت کو ابھار کر لے آئے جو تعمیر و ترقی کا کام کرنا چاہتی ہو تو اول روز سے ہی تعمیری کام کی ابتداء ہو جاتی ہے اس کے لیے دستور سازی کی شرط یا تاریخ مقرر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

پہلی شکل تو مکمل انقلاب کی ہوتی ہے لیکن دوسری شکل میں کلی نہیں بلکہ عام طور پر جزوی تغیر ہی ممکن ہوا ہے۔ چونکہ جزوی تغیر کا دائرہ مختلف صورتوں میں مختلف ہوتا ہے اس لیے تاریخ میں اس

کی جو مثالیں ملتی ہیں ان میں مشترک عوامل کا کھوج لگانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال ہم ان دونوں شکلوں کی الگ الگ مثالیں دے کر اپنا مدعا واضح کریں گے۔

انقلاب کی پہلی شکل کی مثالیں

اس سلسلے میں ہم انہی دو نظاموں کے تذکرے پر اکتفا کریں گے جن کی مثالیں ہم اس سے پہلے دے چکے ہیں۔ یہ مثالیں ہمارے مقصد کے لیے موزوں تر ہیں اور چونکہ ان کا تذکرہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں اس لیے جس پہلو کی وضاحت اب مطلوب ہے اس کے سمجھنے میں ناظرین کو آسانی رہے گی۔

اسلام

مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام کے برپا ہونے کی عملی شکل کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ حضور نے اسلامی نظام کے قیام کی ابتداء دستور سازی یا نظم حکومت کا ڈھانچہ مرتب کرنے سے نہیں بلکہ اسلام کے اخلاقی، معاشی اور معاشرتی اصولوں کو نافذ کرنے سے کی تھی اور جوں جوں حالات تقاضا کرتے گئے حکومت کا ڈھانچہ بھی آہستہ آہستہ وہ شکل اختیار کرتا گیا جو اسلامی نظام کو چلانے کے لیے موزوں تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ فی الحقیقت اس دور کے حالات کے مطابق اسلامی نظام کو چلانے کے لیے جس نظام حکومت کی ضرورت تھی وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے اختتام تک متواتر ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ نئے نئے مسائل کے تقاضوں کے مطابق نظم حکومت میں موزونیت پیدا کی جاتی رہی۔

انسان ہمیشہ سب سے پہلے اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو مقصود بالذات ہو۔ اپنی اخلاقی قدروں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ اس کے حصول کے لیے ایسے ذرائع اختیار کرتا ہے جو زیادہ سے زیادہ سود مند اور موثر ثابت ہو سکیں۔ حکومت کے ڈھانچے کی کوئی خاص شکل کسی نظام کے نزدیک بھی مقصود بالذات شے کا مقام نہیں رکھتی۔ اصل چیز وہ بنیادی اصول ہوتے ہیں جن کے نفاذ کے لیے وہ نظام وجود میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا قدم اصولوں کے نفاذ کے لیے اٹھے گا اور اس سلسلے میں جو ذرائع موزوں ہوں گے انہیں اختیار کیا جائے گا۔ مدینے میں پیغمبر اسلام نے ایسا ہی کیا۔ اسلام کا جو اصول نافذ کرنا ہوتا تھا، اس کے متعلق تو قطعی فیصلہ ہوتا تھا کہ اس پر کسی مصالحت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس اصول کو جامہ عمل پہناتے وقت ان تمام

متبادل ذرائع پر غور کر لیا جاتا تھا جو اس اصول کے نفاذ کے لیے ممکن ہوتے تھے اور جو کسی حیثیت سے اسلام کے کسی دوسرے مستقل اصول سے ٹکرانے والے نہ ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قاعدے کی رو سے دستور کو نہیں بلکہ اجتماعی اصولوں کے نفاذ کو اولیت کا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ اصولوں کے نفاذ سے قبل حکومت کے ایک متعین ڈھانچے کو وجود میں لانے کی کوشش کرنا بالکل مصنوعی طریقہ عمل ہے۔ اسلام نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح دستور کے متعلق بھی کچھ ہدایات اور بنیادی اصول دیئے ہیں۔ ان کی پابندی کرتے ہوئے آپ وقت اور مقام کے مطابق ہر قسم کا دستوری ڈھانچہ تجویز کر سکتے ہیں اور اس کی بہترین شکل وہی ہو سکتی تھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مدینہ کی ریاست میں بالکل غیر محسوس طور پر اور ہر قسم کے تکلف کے بغیر ایک ایسا نظم حکومت ایک فطری تدریج کے ساتھ وجود میں آتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو تفصیلات کے لحاظ سے اسلامی نظام کے اصولوں کے نفاذ کے لیے اس وقت کے حالات میں بہترین تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس طریقے کو اختیار کرنے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس دور میں دستور کو ضبط تحریر میں لانے کا رواج نہ تھا لیکن ہم نے یہاں دستور کو ضبط تحریر میں لانے کا سوال نہیں اٹھایا بلکہ محض یہ کہا ہے کہ قیام نظام کے کام کی ابتداء حکومت کے کسی خاص ڈھانچے کی ترتیب و ترویج سے نہ کی گئی ——— اور یہ بات ہمارے نقطہ نظر کی تائید کے لیے کافی ہے۔

کمیونزم

یہ مثال دور حاضر سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا وقوع آج سے بہت پہلے ہوا اور اب حالات بدل چکے ہیں۔ روس میں ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے قبل کمیونزم کے نظریات کو پھیلانے کے لیے جو کام کیا گیا، اس کے متعلق ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ اس ملک میں انقلاب کے بعد جب کمیونسٹ پارٹی بر سر اقتدار آئی تو پرانا نظم درہم برہم ہو چکا تھا لیکن عنان حکومت سنبھالتے ہی اس جماعت نے زندگی کے تمام شعبوں میں حتی المقدور اپنے نظریات کی ترویج کا کام شروع کر دیا۔ اگرچہ اس سلسلے میں بہت بڑھے ہوئے قدم واپس بھی لینے پڑے اور عبوری طور پر بعض ایسی پالیسیوں کو بھی اختیار کرنا پڑا جو بظاہر کمیونزم کے اصولوں سے ٹکراتی تھیں (اور اس پر جماعت کے اندر اختلافات بھی رونما ہوئے) لیکن یہ سب کچھ حالات کے دباؤ کے تحت کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی پر کمیونزم کے اصولوں سے بالارادہ انحراف کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال

ہمیں یہاں نہ کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیوں سے کوئی بحث ہے اور نہ ہم یہاں اس مسئلے پر اظہار رائے کرنا چاہتے ہیں کہ یہ پالیسیاں حالات کے دباؤ کے تحت اختیار کی گئیں یا اس میں ایک نظام کی حیثیت سے کیمونزم میں پائے جانے والے عدم توازن کو بھی دخل تھا۔ ہم یہاں صرف مسئلے کے اس پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی نے روس میں بر سر اقتدار آتے ہی اپنی صوابدید کے مطابق اشتراکی نظریات کی تنفیذ کا کام شروع کر دیا اور اس کے لیے اس بات کی فکر نہیں کی کہ پہلے دستور مرتب کر کے حکومت کا ایک ایسا ڈھانچہ وجود میں لایا جائے جو ان نظریات کی ترویج کے لیے موزوں ہو۔ یہ بات فی الحقیقت اختیاری نہیں تھی۔ اصل صورت ہی یہ تھی کہ کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کو خود یہ معلوم نہ تھا کہ اسے کن حالات میں اور کس طریق پر اپنے اصولوں کو نافذ کرنا ہو گا اور اس کے لیے حکومت کا کون سا ڈھانچہ موزوں ہو گا۔ ان کے لٹریچر میں صرف نظریے کی حد تک پرولتاریہ کی آمریت کا تذکرہ تو تھا لیکن پرولتاریہ کی یہ آمریت کیا شکل اختیار کرے گی اور اس کے لیے جو نظم حکومت مرتب کرنا پڑے گا اس کی تفصیلی شکل و صورت کیا ہو گی۔ اس کے متعلق کوئی اتفاق رائے نہ پایا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اس سلسلے میں اختلاف رائے کا یہ حال تھا کہ عین انقلاب کے موقع پر جماعت کے اندر ریاست و حکومت کے وجود و عدم وجود پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ کسی منظّم ہئیت حاکمہ کی ضرورت ہی نہیں ہے اور دوسرے گروہ کا جس کی سربراہی لینن کر رہا تھا یہ خیال تھا کہ ایک عبوری دور کے لیے ایسی ہئیت حاکمہ ناگزیر ہے۔ گویا حکومت کے ڈھانچے کے متعلق کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ چنانچہ کمیونسٹ حکمرانوں کو ہر شعبے میں تجرباتی دور سے گزرنا پڑا۔ اس کی وجہ اپنے نظریات سے ناواقفیت نہ تھی۔ بلکہ اس کا سبب دراصل عملی زندگی کے مسائل کی پیچیدگی تھی۔ اگرچہ دور حاضر کی پرپیچ زندگی کے تقاضوں اور عملی مسائل کی پیچیدگیوں سے ناواقف لوگ کسی نظام کی ترویج کے کام کو بہت آسان سمجھتے ہیں اور اس کے لیے اپنی خوش فہمیوں کی بنا پر آسان نسخے بھی تجویز کر دیتے ہیں لیکن دور حاضر میں متعدد قوموں نے تعمیر و ترقی کے جو کام کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعیت کا کام کرنے والوں کو شدید قسم کی الجھنوں سے واسطہ پڑتا ہے اور بعض اوقات مزاحمتیں ایسی ایسی سمتوں سے ظاہر ہوتی ہیں جن کا وقت سے پہلے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ روسی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت اس بات کا تفصیلی علم نہ رکھتی تھی کہ اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے حکومت کے کون سے ڈھانچے کی ضرورت ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ جوں جوں زندگی کے مختلف گوشوں میں اصولوں کی ترویج ہوتی گئی ایک تدریجی طریق پر ضرورت کے مطابق حکومت کی موزوں مشینری وجود

میں آتی گئی۔ اس کے بعد جب مناسب مرحلہ آگیا تو حکومت کا جو ڈھانچہ عملی ضروریات کے تحت وجود میں آیا تھا اسے دستوری شکل دے دی گئی۔

ہمیں یہاں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے نظریات صحیح تھے یا غلط۔ یا اس جماعت نے روس میں جو نظام قائم کیا اس کی نوعیت کیا تھی۔ ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ انقلاب کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنے کام کی ابتداء ترتیب دستور سے کرتی۔ اس کے برعکس کمیونزم کے اصولوں پر سچا ایمان رکھنے کی وجہ سے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد اس نے جو قدم بھی اٹھایا وہ ان اصولوں کے مطابق ہی اٹھایا اور اگر کبھی کوئی مصالحت کی تو اس کی نوعیت فی الحقیقت تدبیر کی تھی، انحراف کی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح زندگی کے دوسرے معاملات ان اصولوں کے سانچے میں ڈھل گئے اسی طرح حکومت کا ڈھانچہ بھی انہی کے مطابق مرتب ہو گیا۔ کمیونسٹ پارٹی نے اشتراکی نظام کے قیام کی خاطر ہمہ جہتی اقدامات کئے اور کبھی بھی کام کو اس قسم کے مراحل میں تقسیم نہ کیا کہ آج دستور بنے گا اور کل اصولوں کی ترویج کا کام شروع کیا جائے گا۔ یہ ایک بالکل قدرتی سی بات تھی کہ جب وہ ایک نظام پر ایمان رکھتے تھے تو دستور موجود ہو یا نہ ہو، ان کا ہر قدم اس نظام کے تقاضوں کے مطابق اٹھے اور دراصل کسی اصول یا نظریے پر کسی جماعت یا طبقے کی ایمانی کیفیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ عنان حکومت سنبھالتے ہی کس متعدی کے ساتھ اپنے اعلان کردہ نظریات کو اپناتا ہے۔

تغیر کی دوسری شکل کی مثالیں

اگرچہ ہمارے مقصد کے لیے پہلی قسم کے انقلابات میں دستور اور نظام کے تعلق کا تذکرہ کافی تھا لیکن اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ انقلابات باقاعدہ آئینی جدوجہد کے نتیجے میں برپا نہیں ہوئے، اس کے برعکس اگر کوئی انقلاب دستوری خطوط پر برپا ہو تو اس میں دستور کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تغیر کے اس طریق میں بھی نظام و دستور کے تعلق کی نوعیت واضح کر دیں تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ اس صورت میں بھی دستور کی یہ حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی قیادت کو کسی خاص نظام کے اصولوں کو اپنانے پر مجبور کر سکے۔ البتہ ہمیں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ دستور کو بدلے بغیر زندگی کے بعض شعبوں میں دور رس نتائج رکھنے والے تغیرات ممکن ہو سکے اگرچہ دستوری ذرائع سے کسی کلی انقلاب کے برپا ہونے کی کوئی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ بہر حال ہم جزوی انقلاب میں دستور کا کردار واضح کرنے کے لیے بھارت اور برطانیہ کی مثالیں پیش کریں گے۔

بھارت

بھارت میں حصول آزادی کے موقع پر ایسی قیادت برسر اقتدار آگئی جس کے اکابرین قومی تعمیر و ترقی کا ایک تصور تو رکھتے تھے لیکن اجتماعی و انفرادی زندگی کی بنیادی قدروں کی تبدیلی ان کے پیش نظر نہ تھی۔ قوم اور قیادت دونوں ترقی کے مغربی تصورات کو اپنانا چاہتے تھے۔ آزادی کے بعد ایک غیر ملکی حکمران قوم کے ہٹ جانے سے وہ قومی ترقی کے ارتقاء کی رفتار کو انہی خطوط پر تیز تر کر دینا چاہتے تھے جن کے کچھ ابتدائی نقش انگریز نے قائم کر دیئے تھے۔ چنانچہ آزادی حاصل کرتے ہی سابقہ دستور کے تحت معیشت و معاشرت کے شعبوں میں تعمیری کام کی ابتدا کر دی گئی، اور اس دستور کی وجہ سے اس کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے بعد جلد ہی دستور بنا دیا گیا۔ اس سے نظم حکومت پہلے سے زیادہ جمہوریت پسندانہ ہو گیا۔ ورنہ اس دستور میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے برسر اقتدار جماعت ترقی کے کسی خاص منصوبے کو اپنانے پر مجبور کرتی۔ چنانچہ اس نوعیت کے دستور کے تحت جو سرمایہ دار ملکوں میں رائج ہے اور جس کی بنیادی اصول وہی ہیں جو دنیا

کے بعض پس ماندہ ترین ممالک کے دساتیر میں بھی پائے جاتے ہی، ملک کی تعمیر کا کام نیم اشتراکی اصولوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ دستور اس تعمیری کام کے سلسلے میں نہ تو حکومت کی کوئی متعین رہنمائی کرتا ہے اور نہ اسے کوئی خاص نظریاتی ضابطہ اپنانے پر مجبور کرتا ہے۔ بھارت نے جو خارجہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس کے سلسلے میں بھی دستور سے حکومت کو کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ اگر بھارتی حکومت معاشرتی سطح پر وہ اصلاحی کام نہ کرے جو اس وقت وہاں کیا جا رہا ہے تو اس پر دستور کی خلاف ورزی کرنے کا قانونی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ دستور کا وہاں اس کے سوا کوئی کردار نہیں ہے کہ وہ عوام کے نمائندوں کو مجالس قانون ساز میں لے آئے اور حکومت کو عوام کے سامنے جوابدہ قرار دیدے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کی برسراقتدار جماعت قومی امنگوں اور تصورات کے مطابق کام کر رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دستور قومی زندگی کے ایک محدود دائرے میں تو موثر ثابت ہو سکتا ہے لیکن وہ تنہا کسی نظام یا تعمیر و ترقی کے کسی منصوبے کے نفاذ کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔

برطانیہ

اول تو برطانیہ میں کوئی تحریری دستور موجود ہی نہیں ہے لیکن جو دستوری روایات وہاں دستور کا کام دیتی ہیں اور ان کے بل پر نظم حکومت کا جو ڈھانچہ وجود میں آگیا ہے اس میں کوئی بنیادی ردوبدل کئے بغیر گزشتہ ایک صدی میں اس ملک کے اندر ایک بہت بڑا معاشی انقلاب برپا کر دیا گیا ہے۔ نہ دستور اس کام کے راستے میں حائل ہوا اور نہ اس نے براہ راست حکومت کو کسی ایسے اقدام پر مجبور کیا ہے صرف ان نظری تغیرات کے تحت جو اس ملک کے فکری دائرے میں رونما ہوتے رہے وہاں کی برسراقتدار جماعتیں نظام معیشت میں تغیرات کرنے پر مجبور ہوتی رہیں ہر جماعت انتخابات کے موقع پر اپنا پروگرام پیش کرتی رہی اور جس جماعت کو قوم کی اکثریت کی تائید حاصل ہو گئی اس نے وزارت بنا کر اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔ چنانچہ جس ملک میں گزشتہ صدی کے نصف ثانی تک آزاد معیشت کے اصول کے تحت بدترین قسم کا نظام سرمایہ داری رائج تھا، غریب طبقے غریب سے غریب تر اور دولت مند طبقے زیادہ سے زیادہ دولت مند ہوتے چلے جا رہے تھے اور مارکس اور دوسرے اشتراکی مفکرین اس ملک میں اشتراکی انقلاب کو نہ صرف ناگزیر بلکہ قریب الوقوع سمجھتے تھے، اس ملک کی آج یہ حالت ہے کہ منصفانہ تقسیم دولت کے اصولوں کے تحت وہاں کے ایک ایک شہری کی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی خود حکومت ذمہ دار ہے۔ گویا نہ کوئی تحریری دستور ہے، نہ دستوری روایات میں کوئی ایسی بات جو حکومت وقت کو کسی خاص پالیسی کے اختیار کرنے پر مجبور کرے، اور پھر بادشاہ

اور پارلیمنٹ مل کر غیر محدود اختیارات استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو جماعت بھی بر سر اقتدار آتی ہے وہ وقت کے تقاضوں اور فکری رجحانات کو حیرت انگیز ہوشیاری اور دیانتداری کے ساتھ پورا کرتی ہے۔ اس سے اس کے سوا کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ملکی تعمیر و ترقی کے معاملے میں کسی دستور کو قوت نافذہ حاصل نہیں ہوتی۔ ترقی کے پروگرام کا انحصار سراسر قوم کے فکر و شعور، اس کی اخلاقی و سیاسی تربیت اور تصورات و نظریات پر ہوتا ہے۔

خلاصہ بحث

ہم نے گزشتہ صفحات میں جو گزارشات پیش کی ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل اصول مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ کوئی قوم اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کا کام انجام نہیں دے سکتی جب تک وہ انسانی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے کسی نہ کسی نظام فکر و عمل کو پنا نہ لے۔

۲۔ تعمیر و ترقی کا کام کرنے کے لیے انقلاب فکر ضروری ہے اور قیام نظام سے قبل یہ انقلاب کم از کم اس حد تک ضرور رونما ہونا چاہئے کہ وہ فکر قوم کے ذہن پر غالب آجائے اور اس فکر کو سمجھنے والے اور اسے عملی جامہ پہنانے کی آرزو اور صلاحیت رکھنے والے اتنے کارکن مہیا ہو جائیں جو اسے نافذ کرنے کی ابتدا کر سکیں۔

۳۔ کسی قوم کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح محض ملک کا دستور بنا کر یہ سمجھے کہ اب ترتیب دستور کے نتیجے میں اس کی پسند کا نظام لازماً برپا ہو جائے گا۔ دستور میں کسی نظام کو بزور نافذ کرنے کی قوت نہیں ہوتی بلکہ اس کے اپنے نفاذ کے لیے خارجی قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

حصہ سوم

اصلاح کی ضرورت

ہم نے گزشتہ صفحات میں کسی قوم کی ترقی و تعمیر کے کام کی شرائط و علامات بیان کر دی ہیں۔ ہم نے یہ بھی عرض کر دیا ہے کہ یہ کام آج کے زمانے میں اس صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب کہ زندگی کے اصولوں کا ایک مربوط و ہمہ جہتی ضابطہ اپنایا جائے۔ اس کے علاوہ ہم پاکستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کا ایک مختصر سا تجزیہ اور قوم کی موجودہ حالت کا تاریخی پس منظر بھی پیش کر چکے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بحالات موجودہ ہمارے پنپنے اور نشو و نما پانے کی کیا صورت ہے اور ترقی و تعمیر کا کام ہمارے اندر جو تغیرات چاہتا ہے اس کے تقاضے کیا ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم اس مسئلے پر گفتگو کریں گے۔

ہم نے اس تجزیے میں کسی خاص ضابطہ زندگی کو سامنے رکھ کر قومی زندگی کی تعمیر و ترقی کے اصولوں اور طریق پر روشنی نہیں ڈالی اور نہ یہ ہمارا مدعا تھا۔ بلکہ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے ہم نے ان بنیادی خطوط کی نشاندہی کی ہے جنہیں اجتماعی فلاح و بہبود کے قریب قریب ہر پروگرام میں مشترک طور پر ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے۔ ایسی آراء کو قطعیت کا مقام تو حاصل نہیں ہو سکتا البتہ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بحث کے دائرے کو بہت زیادہ وسعت نہیں دی بلکہ تفصیلات سے بچ کر صرف چند بنیادی اصول بیان کئے ہیں اور اپنے نظریات کی تائید میں ہم نے ان مختلف نظاموں کی تنفیذ کی مثالیں عرض کی ہیں جن میں مزاج و اقدار کے لحاظ سے بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ ہم انہی بنیادی اصولوں کی کسوٹی پر پاکستانی قوم کی موجودہ روش کو پرکھ کر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری ناقص رائے میں ہمارا موجودہ طرز عمل صرف یہی نہیں کہ ہمیں ایک ممتاز و باوقار اور ترقی یافتہ قوم کا مقام نہیں دلا سکتا، بلکہ اس سے شدید اندیشہ ہے کہ ہم تنزل و انحطاط کی پستیوں میں گرتے چلے جائیں اور بالآخر کسی ایسے قومی حادثہ کا شکار ہو جائیں جس کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے عام طور پر صدیوں

کی مدت درکار ہوا کرتی ہے۔ آخر اسی قسم کے ایک حادثے کی بدولت ہم نے ابھی ابھی ڈیڑھ دوسو سال کی غلامی کی سزا بھگتی ہے۔ ذلت کا یہ طویل عرصہ گزارنے کے بعد ایک بار پھر ہمارے مستقبل کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں آگئی ہے اور ہمیں موقعہ ملا ہے کہ آپنے آپ کو سدھار سکیں۔ اس زندگی میں جمود وقرار کی حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے یا تو آپ آگے بڑھیں گے اور یا پیچھے دھکیل دیے جائیں گے۔ آپ کے سامنے صرف دو متبادل راستے کھلے ہیں۔ پہلا راستہ تو یہ ہے کہ نشو ونما پانے اور ترقی کرنے کی قوتوں کو بروئے کار لا کر دنیا کی بااثر اور معززاقوام کی صف میں کھڑے ہو جائیے۔ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ جمود وانتشار کی نذر ہو کر دوبارہ ان بدبخت اقوام کے زمرے میں شامل ہو جائیے جن پر اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ذلت ومسکنت کی پھٹکار پڑ جاتی ہے، اور وہ بدحالی وپریشانی کے عالم میں کبھی اپنی گردن میں کسی ایک قوم کا طوق غلامی پہنتی ہیں اور کبھی کسی دوسری طاقتور قوم کے آلہ کار کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر وہ کھلم کھلا کسی کی غلامی اختیار کر لیتی ہیں تو بے غیرتی اور نکبت کی زندگی بسر کرتی ہیں اور اگر ان کا وجود دوسروں کی نظر کرم کا مرہون منت ہوتا ہے——— اور یہ بھی غلامی ہی کی ایک شکل ہے——— تو انہیں خودی وحمیت سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور ان کی حیثیت شطرنج کے مہرے کے مشابہ ہوتی ہے۔ ذلت ونامرادی کی ان صورتوں سے بچنے کی ایک ہی ممکن شکل ہے اور وہ یہ کہ کسی متعین قومی مقصد کو اپنایا جائے اور اس کے حصول کے لیے اپنی تمام تر سعی، جدوجہد اور جملہ توانائیوں کو وقف کر دیا جائے۔

زندگی کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا

آگے بڑھنے سے قبل ہم ایک نہایت ہی ضروری بات واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ ہر مسئلے کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں اور کسی قوم کی اجتماعی زندگی پر ان گنت قوتیں اور عوامل بیک وقت اثرانداز ہو رہے ہوتے ہیں۔ قومی زندگی کو کسی جہت سے بھی مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ سہولت کلام کے لیے یہ ناگزیر ہوتا ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ گفتگو کی جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بقیہ تمام پہلوؤں سے کسی ایک پہلو کا تعلق منقطع کر کے موخرالذکر کی اصلاح کی جا سکتی ہے اور اس پر توجہ صرف کر کے کوئی نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس زندگی کو ایک کل کی حیثیت سے ہی لینا ہوتا ہے۔ نہ تو موجودالوقت حالات میں اسے مختلف غیر متعلق حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور نہ زمانے کے اعتبار سے اسے ایسے ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے جو ایک دوسرے کے اثر سے بالکل آزاد ہوں۔ جس طرح مختلف شعبے ایک وقت میں ایک دوسرے سے پورا پورا ربط رکھتے ہیں اسی طرح اجتماعی زندگی کے مختلف ارتقائی مراحل بھی ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے اور پیوست ہوتے ہیں کہ کسی ایک مقام پر انگلی رکھ کر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس موقع پر کام کا ایک مرحلہ ختم ہو گیا اور دوسرے کا آغاز ہوا۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس قوم کی سیاسی حالت یہ ہے، اقتصادی کیفیت اس طرح کی ہے اور معاشرتی معاملات اس نہج پر چل رہے ہیں، اور پھر ہم اس کا تجزیہ کرتے اور اصلاح کی تجاویز پیش کرتے ہیں تو اگرچہ انسانی طرز کلام کی محدودیتوں کی وجہ سے ہمیں گفتگو الگ الگ عنوانات کے تحت کرنا پڑتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ عمل کی دنیا میں زندگی کو اسی طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے یا اجتماعی مسائل سے عہدہ برآ ہونے اور تعمیر و ترقی کے کام انجام دینے کے لیے ایک خاص وقت تک کے لیے سیاسی دائرے میں کام کیا جائے گا۔ پھر ایک متعین مدت کے لیے اقتصادی پہلو پر توجہ دی جائے گی اور معاشرتی معاملات کے لیے وقت کا کوئی دوسرا حصہ صرف کیا جائے گا۔ اس کے برعکس اصل صورت یہ ہوتی ہے کہ ان تمام شعبوں میں بیک وقت کام کیا جاتا ہے اور ہر شعبہ دوسرے تمام شعبوں کو ہر وقت متاثر کرتا رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی ایک موقعہ پر وسائل کی کمی یا ترتیب کار کی مصلحتوں کے مطابق کسی ایک شعبے پر خصوصی

توجہ دی جائے۔اسی طرح جب یہ گفتگو کی جائے گی کہ سب سے پہلے فکری انقلاب کی کوشش کی جائے اور جب قوم ایک خاص فکر کو اپنا لے گی تو اس کے بعد ہی اس کے اصولوں کا نفاذ ممکن ہو گا تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہے کہ دنیا کے سب کام کاج چھوڑ کر ساری قوم انقلاب فکر کی مہم سر کرنے میں مصروف ہو جائے گی۔ نہ موجودہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ملکی دفاع و تحفظ کے کام کو قابل التفات تصور کیا جائے گا۔ یہ صورت نہیں ہے۔ عمل کی دنیا میں کام کچھ ایسی شکل اختیار کرتا ہے کہ آپ کو اپنے تمام موجودہ مسائل سے عہدہ برآ ہونا ہوتا ہے اور اپنے اجتماعی معاملات کی طرف پوری توجہ دینا ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی تعمیری کام پیش نظر ہو تو معمول سے زیادہ ہمت کر کے اس کے تقاضوں کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔ تعمیر کے اصولوں (یعنی نظام) اور نقشہ کار (یعنی منصوبے) کا واضح تصور پیدا کرنے کے بعد جہاں زندگی کے سارے گوشوں کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے وہیں عام طور پر تدریج اور ترتیب کار کے تقاضوں کے تحت کبھی ایک پہلو پر خصوصی توجہ صرف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور کبھی کوئی دوسرا پہلو زیادہ کام کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ صورت کبھی پیدا نہ ہو گی کہ کوئی قوم کسی موقعہ پر زندگی کی الجھنوں سے گلو خلاصی حاصل کر لے اور اطمینان سے تعمیر کے کاموں میں منہمک ہو جائے۔ زندگی کی موجودہ پیچیدگیوں اور تعمیری کام کی طرف بیک وقت ہی توجہ کرنا ہوتی ہے۔

ہمارا مدعا ایک حد تک اس شخص کی مثال سے واضح ہو سکتا ہے جو اپنے تجارتی کاروبار کی توسیع اور اسے کچھ مختلف خطوط اور ایک نئے ڈھب پر چلانے کا ارادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ حصول مقصد کے لیے وہ یہ طریق کار اختیار نہیں کر سکتا کہ اس فیصلے کے ساتھ ہی اپنے سابقہ کاروبار کو یک لخت ترک کر دے یا اسے اس کے حال پر چھوڑ کر نئے راستے پر چل پڑے۔ نہ وہ ایسا کرے گا اور نہ اس کے لیے ایسا کرنا ممکن اور سود مند ہو گا۔ اسے ایک خاص تدریج کے ساتھ ——— جس کا تعین سابقہ اور نئے کام کی نوعیت پر منحصر ہو گا ——— پہلے کام کو ترک کر کے نئے کام کے لیے زمین ہموار کرنا ہو گی۔ ظاہر ہے کہ نیا کاروبار استوار کرنے کے لیے اسے زیادہ سرمایہ کی بھی ضرورت ہو گی اور اس کے لیے موزوں تکنیکی مہارت بھی فراہم کرنا ہو گی۔ وہ کام کا جو نقشہ تیار کرے گا اس میں کام کی ضروریات کے مطابق سرمایہ کی فراہمی کے ذرائع کا بھی تعین ہو گا اور کام کے استعداد پیدا کرنے اور کارکن مہیا کرنے کے وسائل کی بھی وضاحت ہو گی۔ لیکن نئے کاروبار کے ان تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نہ تو وہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے گا جس سے سرمایہ اور صلاحیت کار کی فراہمی کے لیے کسی دست غیب کی

اعجازی قوتوں پر بھروسہ کیا جائے اور نہ ان دونوں ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنی سابقہ کاروباری اور تمدنی و معاشرتی ذمہ داریوں سے دستکش ہو جائے گا تاکہ ایک طرف تمدنی ذمہ داریوں کے خاتمے سے اس کا سرمایہ بڑھنے لگے اور دوسری طرف تمام کام کاج چھوڑ کر رات دن نئے کام کے لیے استعداد پیدا کرنے میں منہمک رہ سکے۔ وہ کبھی ایسا نہ کر سکے گا۔ باوجود یہ کہ اسے سرمایہ کی اشد ضرورت ہو گی لیکن اسے اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات حسب سابق پوری کرنا ہوں گی اور زیادہ سے زیادہ محنت کی ضرورت کے علی الرغم اسے اپنی معاشرتی سرگرمیوں میں بھی وقت کا کچھ حصہ صرف کرنا پڑے گا۔ غرضیکہ وہ اپنے ذہن میں کام کا ایک ایسا منصوبہ تیار کرے گا کہ اپنی موجودہ ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہو سکے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بتدریج اپنے کاروبار کی نہج کو بدلنے میں مصروف رہے اور نئے کام کو استوار کرنے کے لیے جس پہلو پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہو زیادہ محنت کر کے اس کے تقاضوں کو بھی پورا کرے۔ اس کے لیے اسے اپنی توانائیوں کا وہ حصہ بھی بروئے کار لانا پڑے گا جسے اس نے ابھی تک نظر انداز کر رکھا تھا۔ اس فرد کے پیش نظر کام اور کسی قوم کی تعمیر نو کی مہم میں اگرچہ کلی مشابہت تو بہت پائی جاتی لیکن ان دونوں میں ایک حد تک مماثلت ضرور موجود ہے جو قوم نئے سرے سے اجتماعی تعمیر کا کام کرنا چاہے اسے اسی طرح اپنی موجودہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ تعمیر کے منصوبوں کے لیے وسائل مہیا کرنے ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں بڑی دقت یہ ہے کہ جب تعمیری کام کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو بعض لوگ اپنی نادانی اور کم فہمی اور حکمران طبقہ اپنی سیاسی مصلحت کی وجہ سے یہ کہتا ہے کہ چونکہ فلاں فلاں اہم قومی مسائل اور الجھنیں درپیش ہیں اس لیے تعمیر و ترقی کے کاموں کو موخر کرنا ناگزیر ہے۔ حالانکہ موجودہ مسائل اور معاملات سے صرف نظر کر کے نہیں، ان تمام مسائل کی طرف توجہ دیتے ہوئے تعمیر کے تقاضوں کو زیادہ محنت کے ساتھ پورا کیا جائے گا۔ کسی قوم کو ایسا کوئی لمحہ کبھی نصیب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے موجودہ حالات کی پیچیدگیوں سے پوری طرح نجات حاصل کر لے اور اطمینان کے ساتھ ترقی و تعمیر کا کوئی منصوبہ وضع کر کے اس پر عمل پیرا ہو جائے اور اس دوران میں دنیا اس سے کوئی تعرض نہ کرے کہ چونکہ یہ قوم اپنی تعمیر نو کے کام میں مصروف ہے اس لیے اسے پریشان نہ کیا جائے۔ یہ ایک نہایت ہی مضحکہ خیز تصور ہے۔ اسے جب تک ترک نہیں کیا جائے گا اس ملک میں ابدالاباد تک تعمیری کام کی توقع نہ کی جا سکے گی۔ نہ کبھی کوئی ایسا موقعہ آئے گا جبکہ آپ اپنے تمام حل طلب مسائل سے عہدہ برآ ہو چکے ہوں گے اور نہ آپ کبھی تعمیر کے کام کا آغاز کر سکیں گے۔

ہم ایک بار پھر اسلام اور کمیو نزم کی ان دو مثالوں کی طرف پلٹتے ہیں جن کا تذکرہ کر کے ہم اس سے پہلے بھی اپنے نظریات کی وضاحت کرتے رہے ہیں۔ مدینہ میں جس وقت اسلام کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی اصول نافذ کئے جا رہے تھے تو یہ وہی موقع تھا جبکہ سارا عرب اس چھوٹے سے شہر اور اس میں آباد مسلمانوں کی ایک مختصر سی جماعت کو اچک لے جانے کے لیے بے چین تھا اور شدت غضب سے رات دن انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ انہی حالات میں معاشرے کو اسلام کے اصولوں میں رنگنے کا کام پوری مستعدی اور یکسوئی کے ساتھ جاری رہا اور لطف کی بات یہ ہے کہ بڑھا ہوا ایک قدم کبھی واپس نہیں لینا پڑا۔ اسی طرح دور حاضر میں روس کے اندر کمیو نزم کے اصولوں کے نفاذ کی ابتدا اس وقت کی گئی جب کہ ساری سرمایہ دار دنیا اس کام کو ناکام بنانے اور روس کے راستے میں مشکلات پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ حد یہ ہے کہ انقلاب روس کے واقعہ کے تین سال بعد اتحادی اقوام کی فوجیں مختلف سمتوں سے روس کے اندر گھس کر انقلاب کو بزور ناکام بنانے کی زبردست کوشش کرتی رہیں۔ کمیونسٹ پارٹی ایک طرف ان افواج کا مقابلہ کرتی رہی اور دوسری طرف متوازی طور پر اپنے اصولوں کو زندگی کے عملی مسائل پر چسپاں کرنے کے لیے اقدامات بھی کرتی رہی۔ اگر مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور روس میں کمیونسٹ پارٹی یہ روش اختیار کرتے کہ پہلے داخلی اور خارجی پیچیدگیوں کو حل کر لیا جائے اس کے بعد تعمیر کا کام کیا جائے گا تو غالباً یہ موقع کبھی نہ آتا۔

پاکستان میں یہ طرز فکر کہ پہلے ان مسائل کو حل کر لیا جائے جو اس وقت حل طلب پڑے ہیں اس کے بعد تعمیر و ترقی کے کام کا آغاز کیا جائے گا، بہت عام ہے۔ اس میں عوام ہی نہیں تعلیم یافتہ شہریوں کی ایک بڑی تعداد بھی مبتلا ہے اور حکمران طبقہ تو ہمیشہ اسی استدلال کا سہارا لیتا ہے۔ ان حضرات کے ذہنوں میں غالباً زندگی کا ایک ایسا تصور پایا جاتا ہے جس کے تحت انہوں نے اسے مختلف غیر متعلق شعبوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ ایک سمت سے فارغ ہو جائیں تو دوسرا کام کریں۔ جب یہ کہا جائے کہ صاحب تعمیر اخلاق کی ضرورت ہے تو فرمایا جائے گا کہ کشمیر کا مسئلہ در پیش ہے اسے حل کر لیں تو اس طرف متوجہ ہوں۔ جب مطالبہ کیا جائے کہ عوام بدحال ہیں لہٰذا ملکی پیداوار بڑھانے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کا کوئی انتظام کیا جائے تو ارشاد ہو گا کہ پہلے کارخانے قائم کر لیں اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ اسی طرح آج تک جب یہ گزارش کی جاتی رہی ہے کہ جناب نظام تعلیم کی اصلاح ہونی چاہئے تو اس کے جواب میں فوراً یہ کہا جاتا رہا ہے کہ دستور بن رہا ہے اس کے

بعد ہی یہ کام انجام دیا جاسکے گا۔ غرضیکہ اسی طرح ہر کام کسی دوسرے کام کی آڑ لے کر ٹالا جاتا ہے اور کارگزاری ہر لحاظ سے صفر کے برابر ہے۔

سطور بالا میں ہم نے جو بحث کی ہے کہ وہ حکمران جماعتوں سے متعلق تھی، وہ اگر تعمیر کا کام کرنا چاہیں تو انہیں اس قسم کی روش اختیار کرنا ہوگی لیکن جو جماعتیں برسر اقتدار نہ ہوں، ان کے لیے یکسوئی کے ساتھ انقلاب فکر کی جدوجہد کر کے اپنے نظریات کے نفاذ کے لیے زمین ہموار کرنا مقابلتاً زیادہ آسان ہے۔ ان پر نظم حکومت کو چلانے کی براہ راست ذمہ داری نہیں ہوتی اور وہ اپنی توجہات کا بیشتر حصہ ان کوششوں میں کھپا سکتی ہیں جو حصولی مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ہوں۔ اگرچہ کوئی جماعت ملکی مسائل سے کلیتاً صرف نظر نہیں کر سکتی، لیکن ان مسائل کو حل کرنے کی براہ راست ذمہ داری اور ان پر رائے عامہ تیار کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے لہٰذا جو جماعت اپنے آپ کو ہوس اقتدار کی بیماری سے محفوظ رکھ سکے اور کشمکش اقتدار (Power Politics) میں نہ الجھ جائے اس کے لیے کسی نظریہ زندگی کی خاطر کام کرنے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔

پیش نظر کام کی نوعیت

ہم نے اپنے مباحث میں جگہ جگہ "تعمیر و ترقی" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ وضاحت مدعا کے لیے یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ پاکستان میں تعمیر و ترقی کے کام کی نوعیت کیا ہے اور قوم کی موجودہ حالت کے پیش نظر کن کن شعبوں میں کیا کیا کام مطلوب ہے۔اس سلسلے میں بھی ہم کسی خاص مکتب فکر یا آئیڈیالوجی کی ترجمانی نہ کریں گے بلکہ وہی باتیں بیان کریں گے جو آج کی دنیا میں مسلمات کی حیثیت رکھتی ہیں اور جنہیں تعمیر و ترقی کے ہر قومی منصوبے اور نظام کی تنفیذ کے سلسلے میں پیش نظر رکھا ہوتا ہے۔ہم ان باتوں کو چار عنوانات کے تحت بیان کریں گے۔

ا۔ قومی مزاج و کردار

سب سے پہلی بات جو کسی قوم کو تعمیر و ترقی کا کوئی پروگرام اپنانے کے لیے اپنے اندر پیدا کرنا ہوگی وہ یہ ہے کہ اپنی قومی روایات اور اس ضابطہ زندگی کے اصولوں کے مطابق جسے وہ رائج کرنا چاہتی ہے فکر و کردار کے اعتبار سے ایک مخصوص قومی مزاج پیدا کیا جائے۔جو قوم تعمیر و ترقی کا کوئی کام کرنا چاہے اسے اپنے اندر زندگی کے متعلق ایک متعین زاویہ نگاہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔اس سے اس کی اخلاقی قدریں متعین ہوتی ہیں۔اس سے اس کی ایک ذہنیت مرتب ہوتی ہے اور اس سے اس کے مجلسی آداب تک کا ایک ضابطہ وجود میں آتا ہے۔اگرچہ یہ ایک نہایت ہی وسیع موضوع ہے اور کسی قوم کے نشوو ارتقاء میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے لیکن یہاں چونکہ تفصیلات میں جانا ممکن نہیں اس لیے ہم اسی قدر اشارات پر اکتفا کریں گے جو پیش نظر بحث کے لیے ناگزیر ہیں۔

ہر نظام جس طرح انفرادی سیرت و کردار کا ایک تصور رکھتا ہے اسی طرح اس کو چلانے کے لیے ایک خاص قسم کے قومی مزاج و کردار (National Character) کی ضرورت ہوتی ہے۔اگرچہ علم عمرانیات (Sociology) میں یہ مسئلہ بہت ہی پیچیدہ اور طویل مباحث کا موضوع چلا آتا ہے کہ ایک معاشرہ بحیثیت مجموعی کس حد تک اپنے افراد کے انفرادی سیرت و کردار کی عکاسی کرتا ہے لیکن ان فلسفیانہ بحثوں میں

الجھے بغیر ہم یہ عرض کریں گے کہ انفرادی اور قومی سیرت و کردار کے معیارات جہاں ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں وہیں ان کے مظاہر کے دائرے ایک حد تک الگ الگ بھی ہوتے ہیں۔ ہر قوم میں دیانتدار افراد بھی پائے جاتے ہیں اور بد دیانت بھی، تعلیم یافتہ بھی اور غیر تعلیم یافتہ بھی، چالاک و عیار بھی اور سنجیدہ و پر وقار بھی، بے غیرت و بے حمیت بھی اور باغیرت و باحمیت بھی، ذلیل بھی اور خود دار بھی لیکن قوم کے اندر جن خاصیتوں کا اثر غالب ہوتا ہے وہ اس کے اجتماعی کردار کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں اور قومی سطح پر اس قوم سے اسی کے مطابق اعمال کا صدور ہوتا ہے اور دنیا اس کی طرف یہی مزاج و کردار منسوب کرتی ہے۔ یہ قومی مزاج قوم کے ذہن و فکر پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ وہ افراد بھی جن میں انفرادی طور پر اس کے برعکس عادات پائی جاتی ہوں قومی معاملات میں اسی مزاج کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جب بھی وہ کسی قومی مسئلے پر اظہار رائے کرتے ہیں تو ان کا رجحان غیر شعوری طور پر اسی مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔ ان کا ایک ایک فعل اس مزاج کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ یہ قوم اپنے ان اجتماعی معاملات کو اس طرح چلاتی ہے کہ دنیا اس کے مزاج کے متعلق ایک رائے قائم کر لیتی ہے اور کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات اس قوم کے متعلق پیشگی طور پر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ فلاں مسئلے یا معاملے میں اس کا ردعمل یہ ہوگا۔ جب اس قوم کے افراد دوسرے ممالک میں جاتے ہیں تو ان کے مجموعی طرز عمل میں غیر قومیں ان کے اجتماعی مزاج کی جھلک واضح طور پر دیکھتی ہیں۔

قومی مزاج کا یہ تصور ایک خیالی چیز یا اجتماعی نفسیات کا ایک دلچسپ موضوع ہی نہیں ہے بلکہ کسی قوم کی ترقی و انحطاط کے معاملے میں اہم ترین بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بڑھنے، ترقی کرنے اور نشو و نما پانے کی امنگ اور خواہش جس قوم میں پائی جاتی ہو وہی ترقی کر سکتی ہے۔ لیکن جس قوم کے ذہن و فکر اور مزاج پر جمود اور مردنی کی کیفیت طاری ہو اس کے لیے ترقی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ترقی کے ولولوں کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے حوصلہ مندی، اولوالعزمی، بردباری، محنت، جذبہ قربانی، نظم و ضبط، خلوص اجتماعی مسائل کے شعور، جدت پسندی اور اسی قسم کی دوسری خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہی قوم ترقی کر سکے گی، جس کے ذہن و مزاج اور سیرت و کردار میں ان خصوصیات کا عکس اس نسبت سے پایا جاتا ہو جس نسبت سے ان کا پایا جانا حصول مقصد کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک قوم اپنے اندر سے دوسری اقوام کے سیاسی و اقتصادی اثرات کو خارج کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے وہ اسی صورت میں جدوجہد کرے گی جب کہ اس کے اندر قومی سطح پر حمیت و غیرت کی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ جب اسے قومی

ضروریات پوری کرنے یا کسی خاص سمت میں ترقی کرنے کے لیے ایسے وسائل فراہم کرنے ہوں گے جو اس کے پاس موجود نہیں ہیں تو اسے اولوالعزمی، محنت اور جدت پسندی کی خصوصیات کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اگر اسے خطرات نے گھیر لیا ہو اور وہ قوم ان کا مقابلہ کرنا چاہتی ہو تو اس کے اندر خلوص، حوصلہ مندی، نظم و ضبط اور جذبہ قربانی کی قسم کے اوصاف کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس اگر اس قوم میں غیرت و حمیت نہیں ہے تو وہ معمولی سے معمولی مصالح اور وقتی فوائد کے تحت دوسروں کے اثرات قبول کرے گی اور ہر وقت دوسروں سے استمداد کے لیے بہانے تراشتی رہے گی اگر وہ جدت پسندی، محنت اور اولوالعزمی کی قسم کے اوصاف سے محروم ہوگی تو اس کے اند ترقی کی نئی نئی راہیں تلاش کرنے کی صلاحیت ہی پیدا نہ ہو سکے گی اور وہ ایک پس ماندہ قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگی۔ اگر اس میں خلوص، حوصلہ مندی، نظم و ضبط اور جذبہ قربانی کی خصوصیات کا فقدان ہوگا تو وہ ہر خطرے کے آگے سپر ڈال دے گی، ہر آفت اسے آسانی سے گھیر لے گی اور اس کے تمام معاملات تخریبی عناصر کے زیر اثر چلے جائیں گے۔ ان خصوصیات کی عدم موجودگی میں اس کے رہنماؤں اور سیاست دانوں کی جذباتی تقریریں اور روشن مستقبل کے خیالی وعدے کبھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکیں گے۔ ایسی قوم نہ تو ان خطرات کا مقابلہ کر سکتی ہے جو تاریخ میں ہر وقت ہر قوم کی گھات میں رہے ہیں اور نہ وہ مثبت طور پر تعمیر و ترقی کے وہ کام کر سکے گی جو اسے خوش حالی کی زندگی بسر کرنے اور اقوام عالم کی برادری میں عزت و سربلندی کا مقام دلوانے کے ذمہ دار ثابت ہو سکیں۔

ہم دو مثالوں کے ذریعے اپنے مدعا کی مزید وضاحت کریں گے۔

فرض کیجیے کوئی قوم جنگ میں الجھ جاتی ہے جنگ جیتنے کے لیے جذبہ قربانی، نظم و ضبط اور ہمت و شجاعت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر کسی قوم کے ذہن پر مایوسی چھائی ہوئی ہو، اس کے معاملات پر خود غرض اور مفاد پرست افراد مسلط ہوں اور انہی افراد کے سیرت و کردار کی جھلک ملک کے عوام میں بھی دکھائی دیتی ہو، اگر اس کے اقتصادی معاملات میں بد دیانتی، کنبہ پروری اور حرص و لالچ کا زہر سرایت کر چکا ہو تو جنگ کی حالت میں بھی ساری قوم اپنی قیادت سمیت انفرادی اور گروہی نفع اندوزیوں میں لگی رہے گی اور کبھی اس ہمت و استقلال کا مظاہرہ نہ کر سکے گی، جس کی جنگی حالت میں ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کوئی خیالی اندیشہ نہیں ہے بلکہ تاریخ میں ایسے ایسے واقعات دیکھنے میں آئے ہیں جب کہ ان خرابیوں کی بدولت جہاں قوم اور قیادت سے دوسری بہت سی کمزوریاں سرزد ہوئیں وہیں ناقص اسلحہ کی خرید اور فراہمی تک جیسے شرمناک واقعات بھی پیش آئے، اور

اس طرح قوم کی ساری جنگی تیاریاں کالعدم ہو کر رہ گئیں۔ جنگ کے زمانے میں انتہائی نظم وضبط کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر کسی قوم کو مجلسی آداب کے کسی ضابطے کو اختیار کرنے کی بھی توفیق نہ ہو تو وہ نظم وضبط کے ان کٹھن تقاضوں کو کس طرح پورا کر سکے گی جو حالت جنگ میں ضروری ہوتے ہیں۔ جنگ کی حالت میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جبکہ مختلف قومیں خوراک یا دوسری ضروریات زندگی کی کمی سے دوچار ہوئیں۔ جن قوموں میں قربانی، نظم و ضبط اور حب الوطنی کے اوصاف پائے جاتے تھے اور اپنی قیادت پر انہیں اعتماد تھا انہوں نے حکومت کے انتظامات کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا اور عظیم مشقتیں اور تکالیف برداشت کرنے کے باوجود ذرہ برابر بے قاعدگی نہ کر سکیں اس کے برعکس ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جبکہ امن کی عادات واطوار کے مطابق ایک طرف حکومت کے کارکنوں اور سرمایہ داروں نے اس موقعہ کو بددیانتیوں اور چور بازاری کے لیے غنیمت سمجھا اور دوسری طرف نہ صرف یہ کہ خوراک اور دوسری ضروریات زندگی کی فراہمی کے لیے حکومت کے انتظامات کو قوم نے ایک دن کے لیے بھی چلنے نہ دیا بلکہ بلووں اور لوٹ مار تک نوبت آگئی اور جس کام کو دشمن انجام دینا چاہتا تھا وہ اپنی قوم ہی کے افراد کے ہاتھوں انجام پا گیا۔

یہ تو تھی ایک منفی قسم کی مثال جب کہ محض ایک خطرے اور ضرر سے بچنا مقصود ہو۔ اب ایک مثبت قسم کی مثال لیجیے۔ فرض کیجیے اوپر بیان کردہ اوصاف سے محروم قوم ترقی کو کوئی اچھا یا برا منصوبہ بناتی ہے (زندگی کے کسی واضح تصور سے محروم قوم تعمیر کا کوئی معقول منصوبہ تو سرے سے تیار ہی نہیں کر سکتی) ظاہر ہے کہ اس منصوبے کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے جدت پسندی، محنت، دیانت اور اسی نوع کی دوسری خصوصیات کی ضرورت ہو گی۔ لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ حکومت کے عمال اور صاحب اثر اور سرمایہ دار طبقہ منصوبے پر خرچ ہونے والی رقوم سے اپنی جیبیں بھرنے کے لیے اسے ایک غنیمت موقع تصور کرتا ہے۔ کارکن تربیت یافتہ اور محنتی نہ ہونے کی وجہ سے اس جدت پسندی اور صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کرتے جو نئی سکیموں پر عمل پیرا ہونے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ قوم بحیثیت مجموعی اقتدار کے ساتھ تعاون ہی نہیں کرتی اس لیے کہ وہ خود قیادت کے اندر بے شمار خرابیاں دیکھتی ہے جس کے نتیجے میں اس کے نزدیک کوئی کوشش بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔ غور کیجیے ان حالات میں اگر کاغذ پر ترقی کا کوئی خوشنما منصوبہ لکھ بھی دیا جائے تو اس پر عمل کیوں کر ہو سکتا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی قوم میں اپنے اخلاقی نظریات و اقدار کے مطابق وہ خصوصیات نہ پائی جائیں اور ان سے اس کا ایک موزوں قومی مزاج و کردار تشکیل نہ پا چکا ہو تو اس کے لیے بیرونی آفتوں سے محفوظ رہنا ممکن ہے اور نہ وہ مثبت طور پر تعمیر و ترقی کا کوئی کام انجام دے سکتی ہے۔ فی الحقیقت ان خصوصیات کا پیدا کرنا باعزت قومی زندگی کا ناقابل انکار لازمہ ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان خصوصیات کو پیدا کرنا سہل ہے یا محض ہنگامہ آرائیوں، جوشیلی تقریروں اور نعرہ بازیوں سے کسی قوم میں یہ اوصاف پیدا کر کے ایک اعلیٰ قومی مزاج و کردار بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو ایک تدریج کے ساتھ قوم کی ہمہ جہتی تربیت کرنے سے ہی پیدا کی جا سکتی ہیں۔ بعض سطح بین لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جب قوم کسی حادثے یا خطرے سے دوچار ہوتی ہے یا اس کے سامنے کام کا کوئی منصوبہ پیش کر کے اسے اس کی اہمیت باور کرا دی جاتی ہے تو مستقل طور پر نہ سہی، ہنگامی اور عارضی طور پر قوم ان اوصاف سے متصف ہو جاتی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط اور اجتماعی نفسیات سے ناواقفیت پر مبنی ہے جس طرح ایک بزدل اور کم ہمت شخص عین اس وقت اپنے اندر شجاعت کا وصف پیدا نہیں کر سکتا جبکہ خطرہ اس کے سامنے آ کھڑا ہو اور وہ جھوٹا شخص اپنے اندر اس وقت سچ بولنے کی ہمت پیدا نہیں کر سکتا جب کہ وہ آزمائش میں گرفتار ہو جائے۔ اسی طرح جس قوم میں یہ خصوصیات مستقل طور پر پیدا کر کے اس کے مزاج و کردار کا جزو نہ بنا دی جائیں وہ عین اس وقت ان کا مظاہرہ نہ کر سکے گی جب کہ اسے کسی شکل یا مہم سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان خصوصیات کی ضرورت محسوس ہو۔

۲۔ قیادت

کسی قوم کی ترقی کی دوسری ضروری علامت اور شرط یہ ہے کہ اس کی زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو ایک طرف قوم کی تعمیری امنگوں اور ولولوں کی صحیح ترجمانی کر سکیں اور انہیں پورا کرنے کی فکری و عملی صلاحیت رکھتے ہوں اور دوسری طرف تعمیر کے ایسے ترقی پسندانہ تصورات رکھتے ہوں، جن کے تحت قوم کو مزید تربیت دے کر ترقی کی نئی راہیں پیدا کر سکیں۔ اس قسم کی قیادت کی عدم موجودگی میں قوم میں پائی جانے والی خصوصیات اور توانائیوں کو صحیح مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قیادت سے ہماری مراد وہ چند سیاست دان ہی نہیں ہیں جو وزارتوں کے حصول میں کامیاب ہو جائیں، بلکہ اس زمرے میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں سربراہی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اگرچہ قیادت کی کوئی متفقہ اور قانونی تعریف ممکن نہیں ہے لیکن اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو

اپنی علمی کاوشوں سے قوم کے ذہن وفکر کی تعمیر کرتے ہیں، وہ بھی شامل ہیں جو نظم مملکت چلانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، وہ بھی شامل ہیں جو سماج میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور عوام کے روزمرہ کے معاملات میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور وہ بھی شامل ہیں جو ملک کی سیاسیات کو کسی نہ کسی حیثیت سے چلاتے یا متاثر کرتے ہیں (آخری گروہ میں برسر اقتدار جماعت اور احزاب مخالف یکساں طور پر شامل ہیں) یہ سب عناصر اپنے اپنے شعبوں میں قوم کی سربراہی کرتے ہیں اور سب کے مجموعے پر ''قیادت'' کی اصطلاح کا اطلاق ہوتا ہے۔ کوئی قوم جس قسم کا مزاج رکھتی ہو گی عام حالات میں اسی قسم کی قیادت ابھرے گی اور جس قسم کی قیادت ہو گی اسی قسم کا قومی مزاج ارتقاء پذیر ہو گا۔ (یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قوم کی حالت اچھی نہ ہو گی تو اس کے اندر سے کبھی بھی باصلاحیت قیادت نہ ابھر سکے گی اور جب اچھی قیادت نہ ابھرے گی تو اصلاح و تعمیر کا کام کبھی بھی انجام نہ دیا جا سکے گا۔ اس شیطانی چکر کو توڑنے کی یہی تدبیر ہے کہ کام ان خطوط پر کیا جائے جن کی نشاندہی ہم نے اس کتاب کے حصہ دوم میں کی ہے) جس قوم کو ترقی کرنی ہو یا وہ ترقی کے مدارج طے کر رہی ہو اس کے متعلق یہی مشاہدے میں آیا ہے کہ اس کی قیادت صلاحیت کار رکھنے والے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ علم کے شعبے میں ایسے ایسے لوگ ظاہر ہوتے ہیں جو جدت فکر اور تحقیق و مطالعہ سے نئی نئی راہیں کھولتے، کائنات کے اسرار و رموز کا کھوج لگاتے اور عالم طبیعات کو مسخر کرنے کے لیے نئے نئے راستے دریافت کرتے ہیں۔ سماجی دائرے میں اصلاح پسند اور تعمیری کام کرنے والے ابھرتے ہیں۔ سیاسیات میں ایسے لوگ اثر و قوت حاصل کرتے ہیں جو قوم میں اونچی امنگیں پیدا کرتے اور اس کی تعمیر کے متعلق خود بھی بلند تصورات رکھتے ہیں۔ اقتصادی دائرے میں ایسے لوگ نمودار ہوتے ہیں جو قومی پیداوار کو بڑھاتے اور قوم کی تعمیر جدید کے لیے وسائل فراہم کرتے ہیں قطع نظر اس بات سے کہ ایسی قیادت کس طرح ابھرتی ہے۔ ہم یہ بات ایک واقعہ کی حیثیت سے بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی باصلاحیت قیادت کا ظہور کسی قوم کی ترقی کی لازمی شرط ہے اور جس قوم کی باگ ڈور ایسی قیادت کے ہاتھ میں نہ ہو، وہ ترقی نہیں کر سکتی۔

مختلف اقوام میں تعمیر و ترقی کے کام کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی قیادت موجود الوقت ناکارہ سیاسی رہنماؤں پر مخالفانہ تنقید سے نہیں ابھرا کرتی اور نہ اس کا وجود محض سیاسی وانتخابی جدوجہد کا مرہون منت ہوتا ہے۔ اس کا ظہور عام طور پر انقلاب فکر کے کام کے بعد ہوتا ہے۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات قومیں اپنی زندگی کی فکری بنیادیں طے کر لیتی ہیں، ان کے مطابق علم و تحقیق کے شعبے میں باقاعدہ کام شروع ہو جاتا ہے

اور عوام میں نئے نظریات درجہ قبولیت حاصل کر لیتے ہیں، لیکن سیاسی میدان میں اس انقلاب قیادت کی مہم سر کرنا باقی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ علت و معلول (Cause and Effect) میں تقدیم و تاخیر کا ابدی تعلق ہے جو طبقات اور عناصر اقتدار کے جملہ سر چشموں پر قابض ہوتے ہیں انہیں ایک تدریج کے ساتھ ہی حکومت کی مسندوں سے اتارا جا سکتا ہے اور یہ کام انجام دینا اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ قوم میں فکری انقلاب کی وجہ سے زندگی کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کی امنگ پوری طرح جڑ پکڑ جائے اور وہ پرانی سیاسی قیادت کو برطرف کر کے نئے کام کے تقاضوں کے مطابق مناسب لوگوں کو مسند اقتدار سونپنے پر آمادہ ہو جائے۔

اس عمل کی واضح مثال برطانیہ کی تاریخ میں ملتی ہے۔ اس ملک میں زندگی کا موجودہ مادہ پرستانہ اور جمہوری تصور اٹھارھویں صدی کی علمی و فکری کاوشوں کی وجہ سے ظہور میں آ چکا تھا۔ لبرل نظریات قوم کے علم و فکر کا ایک لازمی جزو بن چکے تھے اور ان کا اثر سیاسی و عمرانی لٹریچر کی ہر صنف پر نمایاں تھا۔ لیکن انیسویں صدی میں ابھی میدان سیاست کے اندر اقتدار کو عوام کی طرف پوری طرح منتقل کرنے کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ گویا فکری قیادت پہلے بدلتی ہے اور سیاسی قیادت اس کے بعد۔ ہم ان حضرات کی منطق سمجھنے سے قاصر ہیں جو پہلے سیاسی قوت حاصل کر کے اور مسند حکومت پر جلوہ افروز ہو کر بعد میں انقلاب فکر کی مہم سر کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ان کے خیال میں معلول کا ظہور پہلے ہو گا اور علت بعد میں آئے گی۔

۳۔ اقتصادی حالت

قومی ترقی کے سلسلے میں تیسری اہم اور قابل توجہ چیز قوم کی اقتصادی حالت ہے۔ صنعتی انقلاب سے قبل اس شعبے کو اجتماعی زندگی میں ایک اہم مقام تو حاصل تھا لیکن اس کی حیثیت ایک فیصلہ کن عامل کی نہ تھی۔ ہمیں تاریخ میں ایسی قومیں ملتی ہیں جو اس حالت میں دنیا پر چھا گئیں جبکہ ان کے اقتصادی وسائل نہایت ہی حقیر تھے اور ان کے پیداواری طریقے دوسری اقوام میں رائج شدہ طریقوں کے مقابلے میں تکنیکی لحاظ سے نہایت ہی پسماندہ تھے۔ اگرچہ غلبہ و استیلاء کے بعد انہیں دولت بھی حاصل ہو گئی، لیکن دولت اور پیداواری قوت ان کی ترقی و عظمت کا باعث نہیں بنی بلکہ اس کا نتیجہ تھی۔ لیکن آج کے دور میں یہ صورت نہیں ہے۔ اگرچہ اب بھی ——— جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے ——— کسی قوم کی معاشی حالت ہی ترقی و تفوق کا واحد ذریعہ نہیں ہے اور زندگی کا صرف یہی پہلو توجہ کا مستحق نہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی قوم کی حیثیت و اہمیت متعین کرتے وقت جن عوامل کو آج کل مد نظر رکھا جاتا ہے ان میں معاشی حالت کو ممتاز ترین

مقام حاصل ہو گیا ہے۔ (اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہماری رائے میں قوم کو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر معاشی ترقی کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے۔ دراصل یہ معاشی ترقی بھی جیسا کہ ہم بارہا عرض کر چکے ہیں، قوم کی کوششوں اور تعمیری سرگرمیوں کے ثمرات کے ان مظاہر میں سے ہے جو زندگی کے کسی متعین ضابطے کو اپنانے کا نتیجہ ہوتے ہیں) یہی وجہ ہے کہ ان دنوں قومی ترقی کے منصوبوں میں معیشت کو بہت نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر قوم اس شعبے کی طرف خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ معیشت کے متعلق علمی بحثوں اور قوم کے اجتماعی مسائل کے سلسلے کی گفتگوؤں میں آج کل محض نظریاتی اور خیالی (Abstract) تھیوریوں کو مدار بحث بنانے کے بجائے عملی مسائل مثلاً قوم کی مجموعی پیداوار، فی کس آمدنی، صنعتی ترقی کی مختلف صورتوں کے اثرات و عواقب، سرمایہ کی فراہمی، سود کی شرح، قلت و کثرت زر، اقتصادی بحران، دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات، زرمبادلہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل مرکز توجہ بنے ہوئے ہیں۔ زندگی کا معاشی پہلو اس قدر اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ آج کل قوموں کی داخلی زندگی میں بھی اور مختلف سیاسی جماعتوں کے پروگراموں میں یہی شق سب سے اہم سمجھی جاتی ہے۔ عوامی تائید حاصل کرنے کے سلسلے میں ہر جماعت کے معاشی تصورات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ماضی قریب میں مختلف ممالک کے اندر جو انقلابات آئے ہیں، ان میں ہر قوم کی اقتصادی حالت کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ نہ صرف داخلی معاملات میں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس وقت جو نظریاتی اور سیاسی کشمکش ہو رہی ہے اس کی اصلی بنیاد اس وقت کے معاشی تصورات اور پالیسیوں کا اختلاف ہے۔ دنیا میں اس وقت جو دو دھڑے پائے جاتے ہیں ان کے نزاعات کا باعث بھی قومی دولت کی پیداوار اور تقسیم کے سلسلے کے اختلافات ہی ہیں۔ ماضی میں جو صورت بھی ہو یا آئندہ حالات جو شکل اختیار کر جائیں اس سے قطع نظر آج کے حالات کے متعلق اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی قوم کی معاشی حالت اس کی قوت و استحکام میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے اس خیال کی تصدیق قومی معیشت کے معاملات میں مروجہ طرز فکر سے بھی ہوتی ہے۔ آج کل یوں سوچا جاتا ہے کہ قوم کی مجموعی پیداوار کیا ہے۔ اس میں سے

(۱) کس قدر شہریوں کی روزمرہ کی ضروریات کے لیے صرف کیا جائے۔

(۲) کس قدر تعمیر و ترقی کے مختلف منصوبوں کو جامہ عمل پہنانے اور پیداوار میں مزید اضافہ کرنے کے لیے پس انداز کیا جائے۔ اور

(۳) اس کا کس قدر حصہ ملک کے دفاع پر خرچ کیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ پہلے حصے پر عوام کے معیار زندگی کا دار و مدار ہے۔ اگر یہ معیار اونچا ہو گا تو عوام میں کام کرنے کی صلاحیت بڑھے گی اور اطمینان کی زندگی بسر کریں گے اور وہ طبقاتی نزاعات نہ ابھریں گے جو کسی قوم کی توانائیوں کا ایک بہت بڑا حصہ جذب کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی قوم کا معیار زندگی پست ہو گا تو اس میں بے اطمینانی کی کیفیت ابھر آئے گی، قوم کے اندر کشمکش کی مختلف صورتیں پیدا ہو جائیں گی اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کے لیے مطلوبہ وسائل حاصل نہ ہو سکیں گے۔

جہاں تک دوسری شق کا تعلق ہے اس کے سلسلے میں یہ بات متفقہ حیثیت رکھتی ہے کہ قوم کی پیداواری قوت کو موجودہ سطح پر رکھنے کے لیے بھی قومی پیداوار کا ایک خاص حصہ ناگزیر طور پر پس انداز کرنا پڑتا ہے تاکہ اسے سرمایہ کی حیثیت سے پیداواری وسائل کی فراہمی پر صرف کیا جائے لیکن اگر پیداواری قوتوں میں اضافہ مطلوب ہو تو قومی آمدنی کا عام سطح سے زیادہ حصہ پس انداز کرنا ہوتا ہے۔ اس حصے پر قومی تعمیر و ترقی کی سکیموں کو عملی جامہ پہنانے کا انحصار ہوتا ہے اور آج کل کے معاشی و اقتصادی تصورات و نظریات سے واقفیت رکھنے والا کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ قومی آمدنی کا یہ حصہ علم معیشت میں دور حاضر کے اہم ترین مباحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس کی اہمیت صرف قوموں کی داخلی زندگی میں ہی محسوس نہیں کی جا رہی بلکہ مختلف ممالک میں سرمایہ کی درآمد و برآمد بین الاقوامی تعلقات پر دور رس اثرات ڈال رہی ہے اور آج کل کے ماہرین معاشیات نے اس موضوع کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق قرار دیا ہے۔

قومی آمدنی کے تیسرے جزو کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اگرچہ فکری طور پر مادی قوت کو بزرگی اور برتری کا معیار تسلیم نہیں کیا جاتا، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ کسی قوم کا وقار و مرتبہ اور بین الاقوامی تعلقات میں اس کا مقام اس کی فوجی قوت اور دوسروں کو ضرر پہنچانے کی صلاحیت سے ہی متعین ہوتا ہے۔ فوجی قوت کی کمی قوی تر قوموں کی جارحانہ کاروائیوں کے لیے کھلی ہوئی دعوت کی حیثیت رکھی ہے اور بین الاقوامی برادری میں اثر و قوت اور عزت و مرتبہ حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ہے کہ فوجی اعتبار سے آپ ایک مضبوط اور مستحکم قوم ہوں اور نہ صرف یہ کہ اپنا دفاع کر سکیں بلکہ آپ میں دوسروں کو ضرر پہنچانے کی قوت بھی پائی جاتی ہو۔ اگر اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کو ہمارے اصل موضوع سے مناسبت ہوتی تو ہم یہ ثابت کرتے کہ تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور علمی و عقلی ترقیوں کے باوجود آج بھی کس طرح دنیا میں ہر قوم کا مقام و مرتبہ اس کی فوجی قوت کے

نقطہ نظر سے متعین ہوتا ہے۔ اس دور میں کسی ملک کی آبادی کی کثرت و قلت، اس کے شہریوں کی جسمانی قوت اور انفرادی شجاعت و ہمت ہی فوجی طاقت کے لیے فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتی بلکہ صنعتی پیداوار کی استعداد (Industrial Potential) کو اہم ترین مقام حاصل ہو گیا ہے۔ اس ایٹمی دور میں ہر قوم کی قوت و اثر کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس قدر جدید ترین اسلحہ تیار کر سکتی ہے اور اس میں ایسے نئے نئے ہتھیار ایجاد کرنے کی کس حد تک صلاحیت پائی جاتی ہے جن کا اس کے دشمن مقابلہ نہ کر سکیں۔ آج کل کے دور میں اتنے بڑے پیمانے پر اسلحہ تیار کرنا ہوتا ہے اور جنگ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اتنی عظیم پیداواری قوت کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کسی قوم کا صنعتی طور پر نہایت ہی ترقی یافتہ ہونا حد درجہ ضروری ہے۔ حتیٰ کہ اب کسی ملک کی جنگی استعداد (War Potential) کا اندازہ اس کی صنعتی پیداوار کی مقدار سے لگایا جاتا ہے۔

ہم نے قومی زندگی کے سلسلے میں جو ضروریات گنوائی ہیں اور انہیں تین شعبوں میں تقسیم کر کے جو اشارات کئے ہیں ان سے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ان سب ضرورتوں کو پورا کرنا اسی حالت میں ممکن ہے جب کہ قوم کی معاشی حالت اچھی ہو اور قوم کی معاشی حالت کے اچھا ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ ایک تو آپ کی قومی آمدنی زیادہ ہو اور دوسرے اس آمدنی کا انتظام و انصرام کرنے کے لیے صلاحیت کار رکھنے والی قیادت موجود ہو۔ قومی آمدنی کو بڑھانے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے کہ قوم کی افرادی قوت اور مادی ذرائع کو زیادہ سے زیادہ استعمال میں لانے کی کوشش کی جائے۔

۴۔ مردان کار تیاری

دور حاضر میں کسی قوم کی ترقی اور مادی نشوو ارتقاء کی چوتھی اہم ترین علامت اس کے اندر مردان کار کی بہتات ہے۔ آج کل زندگی کے کسی شعبے میں بھی محض عام ذہانت اور سمجھ بوجھ سے کام نہیں چلایا جا سکتا۔ بلکہ ہر شعبے میں خصوصی مہارت (Specialisation) حاصل کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ زندگی کے معاملات اس قدر پیچیدہ ہو چکے اور پیچیدہ تر ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ جو اجتماعی مسائل آج سے ایک صدی قبل نہایت ہی سہل اور آسان دکھائی دیتے تھے اب ان سے شدید الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے کسی پہلو کے نظر انداز ہو جانے سے کسی ایک یا متعدد دوسرے شعبوں میں ضرر رساں رد عمل ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو قوم اور اس کی قیادت ہر وقت ہوشیار اور چوکنی نہ رہے اس کی اجتماعی زندگی میں عدم توازن کی

بیماری پھوٹ پڑتی ہے، اور اس پر انتشار وافتراق کی قوتیں مسلط ہو جاتی ہیں۔ سائنس اور طبعیات سے تعلق رکھنے والے شعبوں، عقلی علوم اور معاشرتی، سیاسی اور معاشی معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اب یکساں طور پر خصوصی مہارت (Specialisation) اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس خصوصی مہارت کے بغیر نہ تو حکومت کے مالی معاملات کو چلایا جا سکتا ہے اور نہ تجارت وصنعت اور خدمت خلق اور رفاہ عامہ کے کاموں کو۔ زندگی کے مختلف شعبے اب آپس میں اس قدر مربوط ہو گئے ہیں اور ہر اجتماعی مسئلے کے اتنے پہلو ہوتے ہیں کہ کسی معمولی سے معمولی کام کو سرانجام دینے کے لیے وسیع معلومات اور کثیر مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ اب مرکزیت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور قریب قریب ہر کام پیمانے پر کیا جاتا ہے، اس لیے ہر قوم کو مختلف قسم کے ماہرین کی ایک بہت بڑی تعداد تیار کرنا ہوتی ہے۔ جزوی مسائل اور ایسے ایسے معمولی معاملات جو بادی النظر میں قومی زندگی کے مجموعی نقشے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ فنی ماہرین کی نگرانی کے محتاج ہوتے ہیں۔ صرف وہی کام فنی مہارت کا تقاضا نہیں کرتے جن کا تعلق علوم طبیعیات سے ہے بلکہ اب سوشل اور سیاسی قسم کے کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں بھی تکنیکی نوعیت کی مہارت ناگزیر ہو گئی ہے۔

ملک کی پیداوار بڑھانے کے لیے زراعت، صنعت، حرفت اور مالیات کے شعبوں میں اونچی سطح کا کام کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب کہ جدید ترین تحقیقی معلومات اور تجربہ یکجا کر دئیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام لمبے عرصے کی منصوبہ بندی اور اچھی صلاحیتیں رکھنے والے شہریوں کی حوصلہ افزائی کا تقاضا کرتا ہے۔ مشاہدے سے ثابت ہے کہ حقیقی اور اونچے درجے کی فنی مہارت محض افراد کی تعلیم وتربیت سے ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے قومی سطح پر بھی ایک خاص استعداد اور فضا پیدا کرنا ہوتی ہے۔ یہ کیفیت شوق، ولولے اور قومی انہماک سے رونما ہوتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ مختلف اقوام کے شہری ایک ہی قسم کی یونیورسٹیوں اور اداروں سے تھیوری کا علم حاصل کرتے ہیں لیکن بعض قوموں کے شہریوں میں زیادہ قوت کار، جدت پسندی اور مہارت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بعض دوسرے ممالک کے شہری ان خصوصیات سے مدت العمر محروم رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اول الذکر اقوام میں قومی حیثیت سے اونچی سطح کی صلاحیت کار پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی اجتماعی فضا کی خوابیدہ استعداد کو بیدار کر دیتی ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ اس وقت دنیا میں ایسے ممالک موجود ہیں جو اپنے ذرائع سے تھوڑا بہت سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں اور دوسری اقوام سے بھی سرمایہ درآمد کر سکتے ہیں، لیکن تکنیکی ماہرین کی کمی کی وجہ سے ان کی زراعت

و تجارت اور صنعت و حرفت میں کوئی ترقی نہیں ہو رہی اور ان کے بہت سی سکیمیں ماہرین کے فقدان کی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ دوسرے ممالک سے ماہرین درآمد کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ کمی چند درجن یا چند سو درآمد شدہ ماہرین سے پوری نہیں ہو سکتی۔ حقیقی ترقی کے لیے قوم کے اندر سے ہر سطح اور استعداد کے ماہرین تیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت ترقی یافتہ ممالک کو بھی ہر سال ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ماہرین پیدا کرنے کی ضرورت لاحق ہو رہی ہے اور حالت یہ ہے کہ بڑی طاقتیں دوسرے معیارات کے علاوہ اپنی اپنی قوت کا موازنہ اس نقطہ نظر سے بھی کرتی ہیں کہ ان میں سے ہر ملک ہر سال ماہرین کی کتنی تعداد تیار کرتا ہے۔ اسی سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ فلاں ملک میں پیداواری قوتوں میں اضافہ کرنے یا انہیں ایک خاص سطح پر رکھنے کی کس قدر استعداد پیدا ہو گئی ہے۔

یہ کام تھوڑے عرصے میں انجام نہیں دیا جا سکتا لہٰذا تکنیکی مہارت (Technical Know) آج کل ایک بہت بڑی قومی دولت کی حیثیت رکھتی ہے اور جو قوم اس شعبے میں سنجیدگی سے کام نہ کر رہی ہو آئندہ کافی عرصے تک کے لیے اس کی ترقی کے کوئی امکانات نہیں ہو سکتے۔

ہماری کیفیت

ہم نے چار عنوانات کے تحت قومی تعمیر و ترقی کے کام کی نوعیت بیان کر دی ہے۔ اس سے قبل ہم حصہ اول میں پاکستان کے حالات کا جائزہ لے کر قوم کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی حالت اور ملک کی موجودہ قیادت کے تاریخی ارتقاء پر بھی روشنی ڈال چکے ہیں۔ ان دونوں مباحث کو پیش نظر رکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اگر قوم و ملک کی تعمیر و ترقی مطلوب ہے تو ہمیں کس پیمانے پر سعی و جہد کرنا ہو گی۔

ہم نے حصہ اول میں قوم کی سیاست و معاشرت کے ارتقاء کا جو تاریخی پس منظر بیان کیا ہے اور اس کے بعد قوم کے سیاسی و معاشرتی حالات میں جن خرابیوں کی نشان دہی کی ہے اس سے صاف طور پر واضح ہے کہ اگرچہ سیاسی پلیٹ فارموں سے اسلام، جمہوریت اور منصفانہ تقسیم دولت کی قسم کے نعرے تو بلند ہو رہے ہیں لیکن فی الحقیقت قوم میں ان مسائل کا صحیح شعور پایا جاتا ہے اور نہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کا کوئی ایسا جامع پروگرام پیش نظر ہے جس پر عمل پیرا ہونے کے لیے قوم آمادہ و تیار ہو۔ قوم میں جزوی اور ہنگامی مسائل کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے، جذباتی پن کا مظاہرہ کرنے، بلند آہنگی سے نعرہ لگانے والے سیاستدانوں اور جماعتوں کے چکمے میں آ جانے اور بیک وقت ایک طرف اسلام اور اپنی قومی روایات سے وابستگی کا اظہار کرنے اور

دوسری طرف سیاسی، معاشرتی اور معاشی سطح پر مغربی تصورات کی اندھادھند تقلید کرنے کی عادات سے صاف طور پر عیاں ہے کہ ہمارے اندر قومی مزاج اور فکر و کردار کے لحاظ سے وہ خصوصیات نہیں پائی جاتیں جو تعمیر و ترقی کے کسی ضابطے اور ہمہ گیر منصوبے کو لے چلنے کے لیے ضروری ہیں۔ قوم سماجی و تمدنی حیثیت سے انتشار کی نذر ہو چکی ہے۔ بعض حدود کے اندر رہتے ہوئے علوم و سیاست اور تجارت و صنعت کے دائروں میں مختلف قوتوں کے درمیان لین دین میں تو کوئی قباحت نہیں ہوتی لیکن سماجی و تمدنی دائرے میں دوسروں کی نقالی کو بالاتفاق غلامانہ ذہنیت کا بدترین مظہر قرار دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں مختلف طبقات اور افراد بود و ماند، نشست و برخاست، لباس اور وضع و قطع، اخلاقی اقدار، مجلسی آداب اور عمرانی رجحانات کے لحاظ سے شدید اختلافات رکھتے ہیں۔ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد، ایک ہی محلے یا برادری کے مختلف خاندانوں اور ایک ہی شہر کے مختلف محلوں میں متضاد و متصادم تہذیبی و تمدنی میلانات دیکھنے میں آرہے ہیں۔ اور حالات اب اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ اس وقت یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ معاشرت، تہذیب و تمدن اور مجلسی آداب کے دائرے میں یہ قوم کس ضابطے اور کن اقدار کی پابند ہے۔ کیا اس معاملے میں یہ اپنی تاریخی روایات کو ملحوظ رکھنا چاہتی ہے یا مغرب کی تمدنی اقدار کو پوری طرح اپنانا چاہتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم یہاں تفصیلات میں نہیں جا سکتے۔ ورنہ ہم تاریخی شواہد سے یہ ثابت کرتے کہ اگرچہ کسی قوم میں سیاسی و اقتصادی دائروں میں اختلافات تو قابل برداشت اور بعض صورتوں میں باعث فلاح ہوتے ہیں، لیکن ہر باعزت و باحمیت قوم اپنی تہذیبی و تمدنی قدروں اور مجلسی آداب کے معاملات میں ہمیشہ متحد الخیال ہوتی ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں آپ سیاسی و اقتصادی پروگراموں کے اختلافات کی بنیاد پر مختلف جماعتوں اور تنظیموں کو باہم دگر کشمکش کرتے ہوئے دیکھیں گے، لیکن تمدن و معاشرت کے میدان میں ان تمام جماعتوں کو آپ ایک ہی روش پر گامزن پائیں گے۔ لیکن ہمارے ہاں جو صورت حال برپا ہے اس کے تحت اس وقت ہمارے قومی مزاج و کردار کی نوعیت کا تعین ہی ناممکن ہے۔

انگریز کی حکمت عملی کے تحت جو قیادت یہاں برسرکار آئی ہے اس کے ارتقاء کی تاریخ ہم ناظرین کے سامنے رکھ چکے ہیں۔ اس کے بعد یہ بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ اس قیادت کے زیر سرکردگی قوم زندگی کے مختلف شعبوں میں کس طرح انحطاط و تنزل اور انتشار و افتراق کی نذر ہو رہی ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل

عرض کر چکے ہیں قیادت کی اصطلاح کااطلاق صرف حکمران سیاسی گروہ پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں وہ گروہ بھی شامل ہیں جو علم و فکر، معاشرت و معیشت اور مذہب و تمدن کے دائروں میں سربراہی کے مقام پر فائز ہیں۔

نیز ہم دور حاصر میں قوموں کے اقتصادی پہلو کی اہمیت پر تبصرہ کر کے یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ کس طرح عوام کی خوشحالی، پیداواری استعداد و صلاحیت کار، نشو وارتقاء اور قومی دفاع کا انحصار کسی ملک کی اقتصادی حالت پر ہوتا ہے۔ ہم پاکستان کے حالات کا ایک مختصر سا تجزیہ کر کے یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ اس معاملے میں بھی ہماری حالت تشویشناک ہے۔ اس شعبے میں ہمارے ہاں منصوبہ بندی کا مکمل فقدان رہا ہے اور قیادت اس سلسلے میں کوئی فکر رکھتی ہے اور نہ نظریات کا کوئی ضابطہ۔

جہاں تک ملک کی اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں تعمیری کام کو عملاً انجام دینے کا سوال ہے اس سلسلے میں ہمارے ہاں ماہرین اور کارکنوں کی شدید کمی ہے اور گزشتہ نو سال کے عرصے میں اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف کوئی قابل ذکر توجہ نہیں دی گئی۔ زراعت و صنعت اور معاشرت و معیشت کے مختلف کاموں کے سلسلے میں غیر ملکی ماہرین پر انحصار کیا جارہا ہے لیکن اس طریقے کی افادیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ باہر سے ماہرین درآمد کر کے اور سرکاری ملازمین اور سیاست دانوں کے وفود کو بیرونی دنیا میں بھیج کر وہاں کے تعمیری منصوبوں کا مطالعہ کروانے پر عوامی خزانے کا کروڑہا روپیہ صرف کرنے کے باوجود کوئی ترقی نہیں ہوئی اور حال ہی میں منصوبہ بندی کمیشن نے پانچ سالہ منصوبہ کا جو مسودہ پیش کیا ہے اس میں ماہرین کے فقدان اور اس کے باعث قومی تعمیر کے منصوبوں میں رکاوٹیں حائل ہونے کا رونا رویا گیا ہے۔

آسان نسخوں کی تلاش بے سود ہے

جب سے انسان نے صفحہ ارض پر متمدن زندگی بسر کرنا شروع کی ہے قوموں اور ملتوں کے اجتماعی نشوونما کے لیے آج تک کوئی آسان نسخہ یا ٹوٹکا وضع نہیں کیا جا سکا۔ اگرچہ ایسے نسخے اور ٹوٹکے تجویز تو کئے جاتے رہے ہیں اور ''سیاسی عطائیوں'' نے ہمیشہ یہ کام کیا ہے لیکن اس قسم کی تمام تجاویز ہمیشہ ہی بے نتیجہ رہی ہیں۔ لہٰذا ہمارے پیش نظر کوئی آسان تجویز پیش کرنا نہیں ہے۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و شرائط متعین کرنے کے لیے ہمیں تاریخ سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اگر تاریخ اقوام و ملل کو بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو نظریات و تاویلات کے سارے اختلافات کے باوجود ایک اصول ساری تاریخ انسانی میں مستقل طور پر کارفرما نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ کسی قوم کے افراد نے کبھی ایک جگہ جمع ہو کر بالاتفاق یہ طے نہیں کیا کہ اب ہمیں فلاں فلاں اصول کو اپنا کر ان ان خطوط پر کام کر کے ترقی کرنا ہے۔ اس کے برعکس قوموں کو نظریات دینے اور ان نظریات کو اپنانے کے لیے افراد میں قوت ایمانی اور جذبہ عمل پیدا کرنا ہمیشہ چند صائب الرائے اور اعلی فکر و کردار رکھنے والے افراد کا کام ہوتا ہے۔ ہمیشہ یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ہر اس قوم کے اندر جس نے تاریخ انسانی میں اپنی تہذیبی و تمدنی ترقی کی وجہ سے کوئی مستقل نشان چھوڑا ہے کچھ ایسے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے قوم کو کچھ نظریات دیئے اور پھر ان نظریات کی تنفیذ کے لیے قوم میں جذبہ عمل پیدا کیا۔ بعض صورتوں میں تو اس کام کی ابتدا کسی ایسے داعی کی غیر معمولی شخصیت کے زیر اثر ہوئی ہے جس کی ٹھوس تعلیمات اور پائدار نظریات کی قوت اس قوم کے تصور کائنات، معیار اقدار اور فکر و عمل کی نہج میں عظیم انقلاب کا باعث ہوئی اور قوم کی ذہنی سربراہی کرنے والے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی ایک اچھی تعداد ان تعلیمات و نظریات کی روشنی میں زندگی کے مسائل کا حل پیش کرنے پر مستعد ہوگئی اور بعض صورتوں میں قوم کا فکری انقلاب کسی ایک شخصیت کی غیر معمولی ذہنی و فکری صلاحیتوں کا مرہون منت نہیں ہوتا بلکہ بعض

تاریخی، اقتصادی یا جغرافیائی حالات قوم میں ترقی و تعمیر کا ایک عام جذبہ اور خواہش پیدا کر دیتے ہیں۔ اور قوم میں ایسی شخصیتیں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں جو فکر و عمل کے میدان میں ایک تدریج کے ساتھ انقلاب پیدا کر دیتی ہیں۔ پہلی صورت کی تائید میں اسلامی تحریکوں کی مثال پیش کر جا سکتی ہے جن کی سربراہی انبیاء علیہم السلام کرتے رہے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی شکل میں نظریات کا جو مجموعہ پیش کیا اس نے نہایت ہی قلیل عرصے میں قوم کے فکر و عمل میں ایک عظیم تغیر برپا کر دیا۔ اور اگرچہ خلافت راشدہ کے بعد سیاسی دائرے میں مسلمانوں پر اسلام کی گرفت ڈھیلی ہو گئی لیکن اسلام نے جو اصول دئیے تھے ان کے زیر اثر صدیوں تک مسلمان دنیا کی علمی و فکری امامت کرتے رہے اور اس کے نتیجے میں انہوں نے سیاسی و تمدنی حیثیت سے بھی اس قدر ترقی کی کہ موجودہ تہذیب مغرب سے قبل تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اگرچہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم اور غیر معمولی شخصیت رکھنے کے باوجود یہ کام خالق کائنات کی تائید ور ہنمائی میں انجام دیا، لیکن مادی نقطہ نظر سے گفتگو کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اس قدر غیر معمولی تھی کہ وہ تنہا ایک ایسے انقلاب کا باعث ہوئی جس کے اثر کے تحت انسانیت اپنے ارتقائی سفر کا ایک بہت ہی اہم موڑ مڑ گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بڑے بڑے مسلمان مفکرین نے مختلف شعبہ ہائے علم میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئیے جو انسان کے فکری ارتقاء میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

اسی طرح کمیونسٹ تحریک مارکس کی ذہنی و فکری کاوشوں کی مرہون منت ہے۔ اگرچہ مارکس کو اس قطعیت کے ساتھ اشتراکی تحریک کا (بلا شرکت غیرے) داعی اول قرار نہیں دیا جا سکتا جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کا داعی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کمیونزم کے جو بنیادی نظریات مختلف مفکرین کی تحریروں میں بکھرے پڑے تھے انہیں مارکس نے ایک باقاعدہ نظام فکر کی شکل دی اور اس کے بعد کمیونزم کے لیے جو کام بھی ہوا، وہ مارکس کے نظریات کی بنیاد پر ہی انجام پایا۔

دوسری صورت کی مثال موجودہ یورپی تہذیب ہے۔ اس تہذیب کی فکری بنیاد کسی ایک شخص نے نہیں بلکہ مختلف اوقات میں متعدد افراد نے رکھی اور اس کو جنم دینے اور بتدریج پروان چڑھانے میں کثیر التعداد شخصیتوں نے حصہ لیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یورپ میں گزشتہ تین چار صدیوں میں علماء و محققین اس کثرت سے پیدا ہوئے کہ اس خطے نے علم کے ہر شعبے میں دنیا کی امامت کا مقام حاصل کر لیا۔ جب یہ کام ایک

حد تک انجام پا گیا تو نہ صرف یہ کہ اس فکر نے یورپ میں ایک نظام کی شکل اختیار کر لی بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے صفحہ ارض کے دور دراز خطوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اس وقت ساری دنیا کی فکری و سیاسی رہنمائی کی باگ ڈور یورپی تہذیب کے علمبرداروں کے ہاتھ میں ہے۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ایک قوم میں دیکھتے ہی دیکھتے کیوں فکری انقلاب رونما ہو جاتا ہے اور وہ مادی حیثیت سے ترقی کی منازل طے کرنے لگتی ہے درآں حالیکہ دنیا کی دوسری اقوام جو ترقی کی آرزوؤں کا اظہار اسی طرح کرتی رہتی ہیں بدستور انحطاط و نامرادی کی پستیوں میں پڑی رہتی ہیں۔ اس سوال کا قطعی جواب نہ آج تک ممکن ہوا ہے اور نہ آئندہ اس بات کی توقع ہے کہ اپنے موجودہ ذرائع علم کے بل پر انسان اس عقدے کو حل کر سکے گا۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کے سلسلے میں اپنی تمام فکری و عملی ترقیوں کے باوجود انسان ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہم اپنی گزارشات کو "کیوں ہوتا ہے" کے بجائے "کیا ہوتا ہے" تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اور صرف یہی بیان کرنے پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں کہ قوموں کی ترقی و تعمیر کی بڑی بڑی شرائط یہ ہیں۔ اور جو اقوام یہ شرائط پوری نہ کریں ان کے ترقی کرنے کا امکان نہیں ہوتا۔

ہم نے قومی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں فکری انقلاب برپا کرنے کے لیے جس طریق کار کا تذکرہ کیا ہے اس سے وہ لوگ لازماً مایوس ہو جائیں گے جو قومی بہبود و فلاح کے لیے آسان نسخوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان کے دل میں فوراً یہ خیال پیدا ہو گا کہ یہ ایک طویل اور کٹھن راستہ ہے۔ فی الحقیقت واقعہ یہی ہے لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے کہ یہ انسانی فطرت کا ایک ابدی اور مستقل قانون ہے کہ آپ انسانی معاشرے میں جو تبدیلی بھی کرنا چاہیں اس کے مناسب حال فکری تغیر برپا کرنا اس تبدیلی کی لازمی شرط ہوتی ہے۔ کیونکہ فکری تغیر ہی سے وہ آمادگی پیدا ہوتی ہے جو کسی بڑے یا چھوٹے کام کو انجام دینے کے لیے ضروری ہے۔ جن لوگوں کے پیش نظر کوئی عظیم مقصد ہو گا انہیں اسی کی سطح پر رہ کر کام کرنا ہو گا اور جن کے پیش نظر محدود اور وقتی مقاصد ہوں گے انہیں انہی مقاصد کے مرتبے کے مطابق فکری تغیر پیدا کرنا ہو گا۔

اس لحاظ سے ہم پاکستان میں کام کرنے والے کسی گروہ یا جماعت سے اس زاویہ نگاہ سے کوئی تعرض یا اختلاف نہیں کرنا چاہتے کہ وہ زندگی کی تعمیر کے کسی ہمہ گیر مقصد کو اپنائے یا اجتماعی زندگی کے کسی ایک شعبے میں کام کرے۔ ہماری گزارش صرف یہ ہے کہ آپ جو کام بھی کرنا چاہیں اس کے متعلق نہ تو خود فریبی میں گرفتار ہوں اور نہ خلق خدا کو دھوکے میں مبتلا کرنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ اس ملک کی زندگی کے نقشے کو

یکسر بدل دینا چاہتے ہیں اور ایک بہت بڑی تحریک اور نظام فکر و عمل کی علمبرداری کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس دعویٰ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھئے اور اگر زندگی کی موجودہ بنیادوں سے تعرض کئے بغیر محض مادی نقطہ نگاہ سے معاشرے کے کسی ایک یا متعدد شعبوں میں اصلاح کا کام کرنا چاہتے ہیں تو پھر بھی اس کام کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کیجیے ورنہ یاد رکھئے کہ ایک طرف تو آپ کی تمام قیل و قال اور سعی وجہد بے کار ثابت ہوگی اور آپ اصلاح و تعمیر کے سلسلے میں معمولی سے معمولی نتائج بھی پیدا نہ کر سکیں گے اور دوسری طرف دنیا آپ کو یا تو منافق قرار دینے پر مجبور ہو گی اور یا پھر احمقوں میں شمار کرے گی۔ اور ان الزامات سے بچنے کے لیے حیلہ سازیاں اور یک رخے منطقی دلائل آپ کے لیے قطعاً مفید ثابت نہ ہوں گے۔ حیلہ سازیاں اور یک رخے منطقی دلائل صرف اندھی عقیدت میں گرفتار افراد کے لیے کام دے سکتے ہیں ـــــ اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتے ـــــ لیکن غیر جانبدار مورخ جو کھوٹے کو کھرے سے الگ کرنے کے معاملے میں ہمیشہ بے رحم ثابت ہوا ہے حیلے اور منطق کے ان پردوں کو لازماً چاک کر دے گا۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں قیام نظام، دستور کی اہمیت اور اصلاح و تغیر کی جو شرائط و علامات بیان کی ہیں اب ہم ان کی روشنی میں پاکستان میں کام کرنے والے مختلف عناصر کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں گے اور ان کی کامیابی کے امکانات پر روشنی ڈالیں گے۔

پاکستان میں اصولی تحریکوں کے امکانات

پاکستان میں اس وقت دو نظاموں کے قیام کے لیے جدوجہد کی جارہی ہے۔ ایک اسلام اور دوسرے کمیونزم۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اسے برپا کرنے کا دعویٰ بڑی بلند آہنگی سے کیا جارہا ہے حتیٰ کہ نئے دستور میں اسے زندگی کے ضابطے کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے۔ کمیونزم پاکستان میں باقاعدہ طور پر ایک منظّم تحریک کی شکل تو اختیار نہیں کرسکی لیکن اس کے باوجود اس کے لیے مختلف طریقوں سے کام ہورہا ہے۔ ہم پاکستان میں بحالات موجودہ ان دونوں نظریہ ہائے حیات کے امکانات پر الگ الگ گفتگو کریں گے۔

اسلام

جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی عرض کرچکے ہیں برعظیم ہندوپاکستان کے مسلمان عوام نے پاکستان کے مطالبے کی حمایت ہی اس وجہ سے کی تھی کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے اس خطے میں اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے برپا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک واقعہ ہے کہ حصول پاکستان کی تحریک کو اس انداز سے چلایا ہی نہ گیا تھا جس کے نتیجے میں اسلامی نظام ظاہر ہوتا اور کوئی ایسا شخص جو کسی نظریہ زندگی کے نفاذ کی اصولی شرائط کا ابتدائی سا علم بھی رکھتا ہو حصول پاکستان کی جدوجہد کے انداز سے یہ توقع نہ رکھ سکتا تھا کہ اس کے نتیجے کے طور پر پاکستان میں اسلام برپا ہوجائے گا۔ بعض حضرات اس قسم کے استدلال پر بگڑ جاتے ہیں اور اسے پاکستان کے تخیل اور اس کے حصول کی جدوجہد کی مخالفت پر محمول کرنے لگتے ہیں۔ لیکن چونکہ پاکستان کے مطالبے کے حسن وقبح کے تجزیے سے ہمارے موضوع کو کوئی تعلق نہیں اس لیے ہم یہاں کسی ایسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم اس سے قبل بھی مختصراً یہ عرض کرچکے ہیں کہ تقسیم سے قبل کے حالات میں مسلمانوں کے قومی وجود کو محفوظ کرنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ تھا۔ لیکن ہماری اس کتاب کا موضوع یہ نہیں ہے کہ برعظیم ہندوپاکستان میں مسلمانوں کے قومی بقاء کی کیا شکل تھی۔ اس کے برعکس اس وقت ہم یہ گفتگو کر رہے ہیں کہ پاکستان کی تحریک کے نتیجے میں اسلام ایک نظام حیات کی حیثیت سے برپا ہوسکتا تھا یا نہیں۔ ہمارا

دعویٰ یہ ہے کہ تحریک پاکستان کو شروع سے اس نیت کے ساتھ چلایا ہی نہ گیا تھا اور اگر اسلام یا کسی دوسرے نظام کے قیام کی شرائط سے عدم واقفیت کی وجہ سے بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں اسلام برپا ہوگا تو یہ ان کی سادہ لوحی اور خوش فہمی تھی اور ایسی خوش فہمیوں سے حقیقت اور قانون قدرت نہیں بدل سکتے۔ قیام پاکستان کے بعد اسلام کو برپا کرنے کے لیے کسی ابتدائی قدم کا بھی نہ اٹھنا اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ یہ تحریک اسلام کے لیے نہ تھی۔ اگر یہ تحریک اسلام کو برپا کرنے کی خاطر چلائی جاتی تو اس کے نتیجے میں اس طرح اسلام آتا جس طرح کسی اصول کی داعی جماعت کے برسر اقتدار آنے پر وہ اصول لازماً برپا ہوتا ہے۔ لہٰذا اب ہماری گفتگو صرف اس پہلو تک محدود رہے گی کہ اس وقت پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کے نتیجہ خیز ثابت ہونے کے کیا امکانات ہیں۔

اس میں تو شک نہیں کہ پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اسلام کو برپا کرنا چاہتی ہے، لیکن اس چاہنے کی کیفیت یہ ہے کہ فکر و عمل کے دائروں میں اجتماعی حیثیت سے قوم کا اسلامی نظریات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ فکری طور پر قوم کے تعلیم یافتہ طبقے کے اذہان پر مغربی فلسفہ زندگی غالب آ چکا ہے۔ جن درسگاہوں میں اس طبقے کے ذہن و فکر کی تعمیر ہوئی ہے ان کا نظام تعلیم مغربی طرز تعلیم کا ہی چربہ ہے اور وہاں وہی علوم پڑھائے جاتے ہیں جو مغرب کے مادہ پرستانہ تصور حیات کی تائید اور اس کی روشنی میں مرتب و مدون کئے گئے ہیں۔ ان حالات میں اگر ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا ذہن مغربی افکار کے سانچے میں نہ ڈھلا ہوتا تو یہ بہت بڑا معجزہ اور حیرت انگیز واقعہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک فی صد بھی ایسے افراد نہیں ملتے جو اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی سہی، اسلام کا ایک نظام زندگی کی حیثیت سے کوئی واضح تصور رکھتے ہوں اور بحالات موجودہ اس کی توقع کی بھی کیسے جا سکتی ہے اور پھر صرف اسلام سے لاعلمی ہی نہیں پائی جاتی بلکہ اس طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی عظیم اکثریت کو سرے سے اس بات پر ہی اطمینان حاصل نہیں ہے کہ اسلام دور حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ اس طبقے کے فعال اور صاحب الرائے افراد تو عملاً اپنے اپنے حلقہ اثر میں اسلام کو فرد اور خدا کے درمیان ایک پرائیوٹ تعلق کا ضابطہ قرار دیتے ہیں اور اسے زندگی کے نظام کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔

اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے اندر آج سے صدیوں پہلے لکھے ہوئے لٹریچر کے ماہرین تو خاصی تعداد میں مل جائیں گے لیکن زندگی کے موجودہ مسائل کا نہ تو بڑے پیمانہ پر اسلامی نقطہ نظر سے حل پیش کیا گیا

ہے اور نہ اس پہلو سے تحقیق و مطالعہ کا کوئی خاص کام ہو سکا ہے۔ مسلمان عوام میں اسلام کو برپا کرنے کی جذباتی طور پر جو امنگ پائی جاتی ہے اس کے نتیجے میں دور حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں اسلام کے سیاسی نظریات کی تشریح کرنے کی کچھ کوششیں کی گئی ہیں ــــــ اور یہ بجائے خود قابل تحسین ہیں ــــــ لیکن یہ کام ابھی بالکل ابتدائی مرحلے پر ہے۔ ہم نے اس کتاب کے حصہ دوم میں قیام نظام کے لیے انقلاب فکر کا جو تصور پیش کیا ہے اور مثالوں سے جس پیمانے پر فکری کام کرنے کی ضرورت ظاہر کی ہے۔ اس کی روشنی میں موجودہ کام قیام نظام کی ابتداء کرنے کے لیے کافی نہیں چہ جائیکہ اسے قیام نظام کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کافی قرار دے جائے یا اس سے یہ توقع وابستہ کی جائے کہ اس سے انقلاب فکر کا وہ مرحلہ طے ہو جائے گا جو قیام نظام کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ قیام نظام کے لیے تو زندگی کے ایک ایک جزو کے متعلق اپنے مخصوص نظریات پیش کرنے ہوتے ہیں اور جب تک یہ نظریات فکر کی دنیا میں غلبہ حاصل نہ کر لیں پرانے نظام کو اکھاڑ پھینکنے اور نیا نظام قائم کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہوتا۔ اسلام کو برپا کرنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود پاکستان میں حالت یہ ہے کہ فکر و اخلاق، سیرت و کردار اور طرز معاشرت تک کی حیثیت سے صرف یہی نہیں کہ ہم اسلام کو اپنا نہیں رہے بلکہ الٹا ہم اس کے خلاف سمت میں بڑھ رہے ہیں۔ کوئی اسے حکمران طبقے کا قصور قرار دے یا دور غلامی میں غیر ملکی حکمرانوں کی پالیسی کا نتیجہ، ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ ہمارا دعویٰ صرف یہ ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہم نے اسلام کی طرف قدم نہیں بڑھایا بلکہ ہم اس سے اور دور چلے گئے ہیں اور چلے جا رہے ہیں۔ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے کہ اس ملک میں مختلف سیاسی مسلکوں سے تعلق رکھنے والی جماعتیں اور افراد اپنے اپنے مصالح کے تحت مختلف اوقات میں متضاد باتیں کرتے ہیں۔ اور وہی لوگ جو حکمران طبقے کے خلاف بات کرتے وقت یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں کہ قوم اسلام سے دور جا رہی ہے، جب اپنی خدمات گنوانے پر آتے ہیں تو یہ ثابت کرنے کے لیے بھی اپنے استدلال کا سارا زور صرف کر دیتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام آنے والا ہے اور اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہاں سیاسی، اخلاقی، فکری، معاشرتی غرضیکہ کسی حیثیت سے بھی اسلام کے لیے زمین ہموار نہیں ہوئی۔ سیاسی دائرے میں حالات پہلے سے بہت خراب ہو گئے ہیں، اور حکمران طبقے کی کشمکش اقتدار نے جہاں ایوان حکومت و سیاست سے دیانت وامانت کی تمام قدروں کو نکال باہر کیا ہے وہیں عوام کو انتخابات میں ناجائز کارروائیاں کرنے کی اس قدر ٹریننگ دے دی ہے کہ اس ملک میں منعقد ہونے والا ہر

انتخاب گزشتہ انتخاب سے زیادہ بھیانک مناظر پیش کرتا ہے اور بدیانتیوں کے وہ وہ جوہر دکھائے جاتے ہیں جن سے انسان حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ اخلاق باختگی کا یہ عالم ہے کہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے ایک ایک شعبے کو بد اخلاقی گھن کی طرح کھائے چلی جا رہی ہے۔ عمال حکومت اور تجارت پیشہ طبقہ دونوں جس دیانت کا مظاہرہ کر رہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہر کام کرتے وقت اخلاقی قدروں کو پامال کرنا ہماری فطرت ثانیہ بنتی جا رہی ہے۔ اور دیانتیوں کی بعض صورتیں تو ہمارے ہاں اب عملاً بالکل مباح قرار پا گئی ہیں۔ ہماری جو نئی پود سکولوں اور کالجوں میں تربیت پا رہی ہے اس کی حالت کے تصور سے ہر سلیم الفطرت انسان لرز جاتا ہے۔ فکری طور پر مغرب کے مادہ پرستانہ تصورات ہمارے اذہان و قلوب کی گہرائیوں میں اترتے چلے جا رہے ہیں۔ جہاں تک ہماری معاشرت کا تعلق ہے ہمارے رہن سہن، انداز نشست و برخاست اور ظاہر و باطن پر مغربی رنگ زیادہ غالب آتا جا رہا ہے اور معاشرے میں مرد اور عورت کے باہمی تعلق اور مقام کی نوعیت پر جو تغیر رونما ہو رہا ہے اس نے ہماری سوسائٹی میں ایک خوفناک انتشار کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ان حالات میں جو شخص قوم کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہاں اسلام آ رہا ہے اور قوم اسلام کے انتظار میں آنکھیں فرش راہ کئے ہوئے ہے وہ یا تو ہمارے اجتماعی رجحانات اور اسلام سے ناواقف ہے اور یا پھر اپنی کسی سیاسی مصلحت کے پیش نظر جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے اور اگر کسی کی یہ آرزو ہو کہ ایسا نہ ہونا چاہئے تھا تو ہم اس آرزو کی قدر کرتے ہیں لیکن آرزوئیں اس حقیقت کو نہیں بدل سکتیں کہ دنیا میں آج تک جو نظام بھی قائم ہوئے ہیں ان کی بنیاد ہمیشہ قوموں کی فکری رہنمائی کرنے والے طبقے کے تصورات پر ہی رکھی گئی ہے۔ اولاد آدم کی یہ ایک ایسی مستقل سنت ہے جسے دور حاضر کی جمہوریت بھی نہیں بدل سکی۔ محض عوامی مطالبات پر، جو عوامی جذبات کے سہارے اٹھائے جائیں، آج تک کوئی نظام قائم نہیں ہو سکا۔ محض عوامی جذبات کے سہارے پر کسی تحریک کو چلانے سے نراج (Anarchy) تو آ سکتا ہے لیکن کوئی باقاعدہ نظام برپا نہیں ہو سکتا۔ کسی نظام کے لیے وہ عوامی تائید تو جس کی پشت پر ٹھوس فکر اور اس فکر کو لے کر چلنے والا ایک مضبوط تعلیم یافتہ طبقہ موجود ہو مفید نتائج پیدا کر سکتی ہے لیکن جس نظام کو برپا کرنے کی جدوجہد محض عوامی جذبات کے بل پر کی جائے اس کے قیام کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔ پاکستان میں یہ صورت ہے کہ یہاں کے عوام اسلام چاہتے ہیں لیکن محض جذباتی طور پر۔ یہ ایک عجیب مضحکہ خیز پوزیشن ہے کہ جب ہمارا کوئی عوامی اجتماع اسلام کے حق میں ''فلک شگاف نعرے'' لگا کر

منتشر ہوتا ہے تو اس کا ایک ایک فرد ـــــــ الا ماشاءاللہ ـــــــ اپنی عملی زندگی میں ایک ایک قدم پر اسلام کی اخلاقی قدروں کو پامال کرتا ہے۔ اگر اس قسم کی عوامی تائید سے کوئی نظام برپا ہو سکتا تو غالباً صفحہ ارض پر آج کوئی خطہ یا ملک ایسا نہ ہوتا جہاں زندگی کے کسی نہ کسی اصول کی کارفرمائی نہ ہوتی۔ اور پھر اس عوامی تائید سے گزشتہ تیرہ سو سال میں اسلام کبھی بھی محروم نہیں ہوا لیکن اس کے باوجود مسلمان خلافت راشدہ کے بعد اسلامی نظام کبھی بھی برپا نہ کر سکے۔ تاریخ میں ایسے واقعات بھی موجود ہیں ـــــــ اور ان میں جناب عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے ـــــــ کہ جب حسن اتفاق سے کوئی خدا ترس اور اسلام شناس حکمران برسر اقتدار آ گیا جو اسلام کے اصولوں کو نافذ کرنے کے معاملے میں پوری طرح مخلص تھا لیکن اس قسم کے افراد کو کبھی بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ معاشرے نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

اس وقت پاکستان کی تمام ایسی جماعتیں جو اسلامی نظام کے قیام کو اپنا واحد نصب العین بتاتی ہیں اس کوشش میں منہمک ہیں کہ عوامی دباؤ سے حکمرانوں کو اسلامی اصولوں کو اپنانے پر مجبور کیا جائے۔ اس سے زیادہ سطحی اور مصنوعی انداز فکر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہی تصور کارفرما ہے تو بحالات موجودہ اس ملک میں اس بات کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا کہ اسلام یہاں ایک نظام کی حیثیت سے برپا ہو سکے۔ یہ پوزیشن نہایت ہی مضحکہ خیز ہے کہ ایک طرف تو ہمارے دینی بزرگ موجودہ حکمران طبقہ کو دین سے بے تعلق اور اسلام سے منحرف قرار دیتے ہیں اور تقریر اور تحریر کے ذریعے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ اپنی نجی اور عوامی زندگی میں رات دن خلاف اسلام حرکات کے مرتکب ہو رہے ہیں لیکن دوسری طرف انہی لوگوں سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اسلام کو اس ملک کے نظام کے طور پر اپنائیں۔ حالانکہ ساری انسانی تاریخ میں چشم فلک نے آج تک ایک ایسا واقعہ بھی نہیں دیکھا کہ کوئی گروہ یا طبقہ کسی ایسے نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہو جس پر وہ خود بصمیم قلب ایمان نہ رکھتا ہو اور جس کی خاطر اس نے قربانیاں نہ پیش کی ہوں۔ یہ کام مجبوری اور دباؤ کے تحت انجام ہی نہیں پا سکتا بلکہ اس کے لیے پختہ ایمان و عقیدہ اور قلب و ذہن کی مکمل آمادگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کام کو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اسے اپنا مقصد زندگی بنائیں اور اپنی تمام دوسری دلچسپیوں کو خیرباد کہہ کر اس کام کو اپنی جملہ توجہات کا مرکز قرار دے دیں۔ جس طرح دنیا کے دوسرے کام مثلاً انجنیئرنگ اور ڈاکٹری وغیرہ کے لیے ماہرانہ استعداد پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور کوئی شخص محض اکلیدس کے چند قاعدے یا طب کے چند نسخے

سیکھ کر ایک انجنیئر اور طبیب کے فرائض اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا، اسی طرح جب تک کسی جماعت یا حکمران گروہ کے تصورات اور مزاج میں کسی نظام کے اصول اچھی طرح رچ بس نہ جائیں اس کے لیے چند عوامی نعروں کے سہارے یا محض ووٹ حاصل کرنے کے لالچ کی وجہ سے اس نظام کو قائم کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوتا۔ اس بیسویں صدی میں جب کہ انسانی شعور واحساس کی اہمیت کم از کم سیاسی سطح پر مسلم اہمیت رکھتی ہے، یہ عجیب وغریب واقعہ صرف ہمارے ملک ہی کے اندر دیکھنے میں آرہا ہے کہ ہماری دینی جماعتیں اسلام کے لیے کوئی قابل ذکر مثبت کوششیں کرنے اور فکری انقلاب کے لیے تگ ودو کرنے کے بجائے دوسروں سے یہ مطالبہ کرنے پر اپنا سارا زور اور وسائل صرف کر رہی ہیں کہ وہ اسلام کو برپا کریں۔ حالانکہ دنیا انقلاب اور اصلاح وتعمیر کے کام کے سلسلے میں آج تک صرف ایک ہی طریق کار سے آشنا ہوئی ہے اور ہر فکر وخیال کی حامی جماعتیں اور شخصیتیں (بشمول انبیاء) ہمیشہ اس طریق کار پر عمل پیرا رہی ہیں کہ وہ مثبت طور پر اپنے نظریات پیش کریں۔ قائم شدہ نظام پر تنقید کریں، تعلیم یافتہ اور سوسائٹی میں اثر رکھنے والے طبقے کے نظریات اور انداز فکر میں انقلاب پیدا کریں، عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کریں کہ زندگی کے مسائل کو ان کے اصول ہی بہتر طور پر حل کر سکتے ہیں اور پھر موزوں ومناسب وقت پر خود جماعتی حیثیت سے برسر اقتدار آکر اس نظام کو ان کارکنوں کی سعی وجہد سے قائم کریں جنہوں نے اس نظام کے قیام کو اپنا مقصد زندگی بنا رکھا ہو۔ یہ جماعتیں دوسری جماعتوں پر اپنے اصول نہیں ٹھونسا کرتیں۔ آج تک یہ نظارہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا کہ ایک اشتراکی جماعت اپنی ساری قوت اور توجہ کسی سرمایہ دارانہ جمہوریت کی حامی برسر اقتدار جماعت پر یہ دباؤ ڈالنے میں صرف کر دے کہ وہ اشتراکیت کے اصولوں کو ملک میں رائج کرے۔ جمہوری ممالک میں بھی اجتماعی زندگی کو اپنے اصولوں کے مطابق ڈھالنے کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ ہر جماعت عوام کے سامنے اپنے پلیٹ فارم سے اپنے نظریات پیش کرتی ہے، دوسروں کے نظریات اور اعمال پر تنقید کرتی ہے اور پھر اپنے نظریات اور پروگرام کے نام پر لوگوں سے ووٹ حاصل کرتی ہے۔ کسی جماعت کی ہوش مند قیادت نے یہ طریقہ کبھی اختیار نہیں کیا کہ اپنے اصولوں اور نظریات کی اشاعت کے لیے مثبت کوشش کرنے کے بجائے بعض نعروں کے نام پر منعقد ہونے والے جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے برسر اقتدار جماعت پر ایسے اصول کو اپنانے اور نافذ کرنے کے لیے دباؤ ڈالے جن اصولوں پر وہ جماعت نہ ایمان رکھتی ہو، نہ اس کے اندر انہیں عملی جامہ پہنانے کی استعداد موجود ہو اور نہ وہ ان اصولوں کو قابل عمل اور دور حاضر کے تقاضوں کے لیے موزوں تصور کرتی ہو۔ دنیا میں معمولی

سے معمولی کام قلب و ذہن کی پوری آمادگی کے بغیر انجام نہیں دیئے جا سکتے لیکن ہماری دینی جماعتیں اس آمادگی کے بغیر اسلامی نظام جیسا عظیم کام کروانا چاہتی ہیں۔ع

بسوز عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجی است

اس نقطہ نظر اور انداز کار کی نامعقولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آج تک حکمران طبقے کے کسی فرد یا صوبائی یا مرکزی وزارت کے کسی ترجمان نے جب کبھی بھی کسی اجتماعی مسئلے کے ضمن میں کسی اسلامی اصول کی وضاحت کی ہے تو اس ملک کے دینی عناصر نے عام طور پر بالاتفاق اس سے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ان حالات میں یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ یہی طبقہ زندگی کے اہم سیاسی، اقصادی اور معاشرتی معاملات پر اسلام کو منطبق کرے گا اور ہمارے دینی حلقے اس پر مطمئن ہو جائیں گے یا اسے صحیح اسلامی نظام کے مترادف قرار دیں گے۔

ہماری دینی جماعتوں کے پروگرام کا دوسرا جزو یہ ہے کہ چونکہ عوام اسلام چاہتے ہیں اس لیے انتخابات کے ذریعے اسلام پسند لوگوں کو مجالس قانون ساز میں بھجوانے کی کوشش کی جائے۔ عام خیال میں تو یہ انداز فکر درست اور معقول معلوم ہوتا ہے لیکن بحالات موجودہ عمل کی دنیا میں اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ ہم اس کتاب کے آغاز میں پاکستان میں بسنے والی قوم کے گزشتہ ڈیڑھ دو صدی کے سیاسی اور معاشرتی ارتقاء کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لے کر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ہمارے معاشرے پر ایک خاص طبقہ جو زندگی میں مفاد پرستی کے علاوہ کسی دوسرے جذبے سے آج تک متاثر نہیں ہوا پوری طرح مسلط ہو چکا ہے۔ انگریز کی نگرانی سے آزاد ہو کر یہ طبقہ جس طرح کھیل کھیلا ہے وہ ایک جانی بوجھی داستان ہے۔اگرچہ دور غلامی میں اس طبقے کے ابھرنے کی ذمہ داری غیر ملکی آقاؤں پر ڈالی جاتی تھی اور اس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد تحریک پاکستان کی مقبولیت سے قبل عوام کا سامنا نہیں کر سکتے تھے، لیکن آزادی کے بعد عام انتخابات میں ہمارے عوام نے حصول پاکستان کی کوششوں کے صلے میں انہی لوگوں کو مجالس قانون ساز کے لیے منتخب کیا اور آج یہ لوگ ''عوامی تائید'' کے دعوے کے ساتھ مسند اقتدار پر قابض ہیں۔ یہ ایک عجیب سی صورت ہے کہ اگرچہ اب عوام اس طبقے کی بدکرداریوں کی وجہ سے اس سے بہت متنفر اور نالاں ہو چکے ہیں، لیکن اب بھی انتخابات میں ووٹ اسی طبقے کے افراد کو ملتے ہیں۔ یہ تضاد بظاہر تو حیران کن ہے لیکن اگر سوچا جائے تو بات بالکل صاف ہے۔ جلسہ ہائے عام کے نعرے جذبات کے تحت لگائے جاتے ہیں اور ووٹ قومی وملی

فلاح و بہبود یا نظریات کے پیش نظر نہیں بلکہ اپنے مفادات اور اصل رجحانات اور مصالح کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ اور فی الحقیقت موجودہ حکمران طبقے اور قوم میں سیاسی رجحانات، کردار و عمل اور اخلاقی اقدار کے لحاظ سے کامل یکجہتی پائی جاتی ہے اور قوم انتخابات کے موقعہ پر وہی نمائندے منتخب کرتی ہے جو اس کے فکر و اخلاق کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ انتخابات کا نتیجہ اس سے مختلف ہو ہی نہیں سکتا جو اب ظاہر ہو رہا ہے۔ دور حاضر کی گزشتہ دو صدی کی جمہوری روایات یہ بتاتی ہیں کہ ہر ملک میں انتخابات کے ذریعے وہی لوگ ابھرتے ہیں جو قوم کے مزاج کی صحیح ترجمانی کرتے ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ معاشرتی اور معاشی حیثیت سے تو ایک طبقہ غالب ہو لیکن سیاسی حیثیت سے کچھ دوسری ہی قسم کے افراد کو ابھرنے کا موقع مل جائے۔ ہم یہ نظریہ بلا خوف تردید پیش کر سکتے ہیں کہ جب تک معاشرتی حیثیت سے اس قوم کی رہنمائی اس طبقے کے ہاتھ میں ہے جس کے ارتقاء کا تجزیہ ہم نے حصہ اول میں کیا ہے، تب تک کوئی ایسی جماعت یا تحریک اس ملک میں نہیں پنپ سکتی جس کے اصول اس طبقے کے مفادات سے ٹکراتے ہوں۔ تغیر و انقلاب کی اس کے سوا کیا صورت ہو سکتی ہے کہ عوام کی سیاسی و اخلاقی قدریں بدل دی جائیں اور سیاسی و انتخابی قدریں بدلنے کی اس کے سوا کیا شکل ہے کہ آپ اس ملک میں جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اس کے تقاضوں کے مطابق ایسا فکری انقلاب رونما ہو جو معاشرے میں پائے جانے والے ہر طبقے کو اس کی ذہنی سطح کے مطابق متاثر کر سکے۔ موجودہ قیادت تبھی اپنے مقام سے معزول کی جا سکتی ہے جبکہ اس کے متبعین (یعنی عوام ہی) عمل کی دنیا میں اس سے برات کا اظہار کریں۔

اب ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ عوام کسی مرحلے پر موجودہ قیادت سے اس قدر بیزار ہو جائیں اور جذباتی ہی سہی اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی کم از کم اس سطح پر پہنچ جائے کہ افراد رائے دیتے وقت اپنے ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ دیں اور ایسے لوگوں کو منتخب کرنے پر آمادہ ہو جائیں جو اسلام چاہتے ہوں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کی مشینری کو چلانے کے لیے آپ وہ موزوں کل پرزے کہاں سے لائیں گے جن کی تیاری پر آپ معمولی سے معمولی توجہ بھی صرف نہیں کر رہے۔ کوئی نظام ہوا میں قائم نہیں ہوا کرتا اس کے لیے فکر و عمل کی مضبوط بنیادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخر کس معجزے کے ذریعے ایسی قیادت خود بخود وجود میں آ جائے گی جو اپنے اندر فکری، سیاسی، معاشی اور معاشرتی دائروں میں اس قدر ٹھوس کام کرنے کی استعداد رکھتی ہو گی کہ اس سے ایک نظام قائم ہو جائے۔ ممکن ہے بعض حضرات کا نظریہ ہو کہ اگر ہم انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آ کر محض چند افراد پر مشتمل وزارت بنا لیں تو اسلامی نظام قائم ہو سکے گا لیکن اول تو موجودہ حالات میں اس قسم کے

خیالات پالنا اپنے آپ کو بیوقوف بنانے کے مترداف ہے اور دوسرے بغرض محال ان حضرات کو مسند وزارت پر جلوہ افروز ہونے کا موقع میسر آ بھی جائے تو کیا ایک ملک کے نظام کی پوری مشینری چند وزراء کے سہارے چلائی جاسکتی ہے۔ آپ خیالی دنیا میں یہ فرض کر لیجیے کہ اس ملک کی باگ ڈور چند ایسے وزراء کے ہاتھوں میں سونپ دی جاتی ہے جو اسلام چاہتے ہیں (اگرچہ اسلامی نظام کو قائم کرنے کی فکری واخلاقی استعداد رکھنے والے افراد ابھی اس ملک کی سیاسی زندگی میں ظاہر نہیں ہوئے اور جن دینی رہنماؤں کی تحریریں یا خیالات اب تک سامنے آئے ہیں یا ان میں سے جو لوگ سیاسی طور پر متحرک نظر آتے ہیں، ان کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ دور حاضر کی عظیم نظریاتی کش مکش میں کسی نئے نظام کو لے کر چلنے کے لیے جس فکری و عملی صلاحیت واستعداد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں پائی جاتی ہے۔ چند ایسے پر خلوص افراد کو مسحور کر لینا جو کسی نظام کی پہنائیوں اور دور حاضر کے مسائل کو سمجھنا تو کجا ان کی پیچیدگیوں کا کوئی ابتدائی تصور بھی نہ رکھتے ہوں تو آسان ہے لیکن ایک نظام کو برپا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ایک دوسری چیز ہے، لیکن محکموں کے تمام سربراہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو چلانے کے ذمہ دار، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے علماء اور پروفیسر، تجارت وصنعت کو چلانے والے افراد غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے نہ تو اس اسلام کے اصولوں کا شعور رکھتے ہیں اور نہ اس پر ایک نظام زندگی کی حیثیت سے ان کا ایمان ہے۔ غور کیجیے کہ آیا اس حالت میں ان وزراء حضرات کے ایک حکم یا ہدایت کو بھی اسلام کی روح کے مطابق نافذ کیا جاسکے گا؟ ایسے انداز فکر سے ہوا میں تو قلعے تعمیر ہو سکتے ہیں لیکن زمین پر ایک رائی برابر تغیر بھی برپا نہیں کیا جاسکتا۔

اور پھر اس مفروضے کے بعد کہ قوم اسلام پسند نمائندوں کو منتخب کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسے نمائندے کہاں سے آئیں گے۔ نئے دستور کے تحت مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے ارکان کی مجموعی تعداد نو صد سے زائد ہوگی۔ ہم تو موجودہ حالات میں انتخابات کے ذریعے اسلامی نظام قائم کرنے کا دعویٰ کرنے والے حضرات سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ پانچ صد ایسے افراد بھی قوم کے سامنے پیش کر سکتے ہیں جن میں ایک اسلامی حکومت کی مقنّنہ اور انتظامیہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی فکری و عملی صلاحیتیں پائی جاتی ہوں [۲]۔ اور ان میں ایسے افراد کی ایک معتد بہ تعداد بھی شامل ہو جو دور حاضر کے تمام پیچیدہ اجتماعی مسائل سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اسلام کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور پھر اسلام کے اصولوں کو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حکمت کے ساتھ منطبق بھی کر سکتے ہوں۔

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات اپنے طرز عمل کے برعکس یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ ہم بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں کہ محض انتخابات کے ذریعے اسلام برپا نہ ہو سکے گا اور ہم فکری انقلاب کے لیے کوشاں ہیں۔ لیکن ہم یہ گزارش کریں گے کہ اسلامی نظام چاہنے والی مختلف جماعتوں نے اس وقت فی الحقیقت جو طریق کار اختیار کر رکھا ہے، اپنی تمام صلاحیتیوں اور وسائل کو وہ جس طرح خالص سیاسی سرگرمیوں میں کھپا رہی ہیں اور اسلامی دستور کی تدوین کے سلسلے میں بھی جس طرح انہوں نے جوڑ توڑ کی سیاست سے پوری طرح فائدہ اٹھایا ہے اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اصل کام تو سیاسی ہو رہا ہے لیکن محض ایک نظریاتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انقلاب فکر کے فلسفے کو زبانی طور پر درست تسلیم کیا جا رہا ہے۔

حالیہ واقعات میں حکمران گروہ اور دینی جماعتوں نے ترتیب دستور کے کام کی تکمیل کو اسلام کے نقطہ نظر سے ایک نہایت ہی اہم واقعہ قرار دیا ہے اور چونکہ اس کے راہنما اصولوں میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ یہاں اسلامی قدروں کو نافذ کیا جائے گا اور دستور کے اصل متن میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہ کی جا سکے گی (اگرچہ اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو پرپیچ طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کے پیش نظر نہیں کہا جا سکتا کہ بالآخر اس شق کا کیا حشر ہوگا) اس لیے دستور کو ''اسلامی دستور'' کے نام سے پکارا جا رہا ہے۔ ہم یہاں اس کشمکش کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتے جس کے نتیجے میں یہ دستور وجود میں آیا ہے بلکہ صرف یہی بات کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ دستور نہایت ہی مصنوعی طریق پر بنا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ یہ کسی نظریے اور اصول پر مخلصانہ ایمان کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض حکمرانوں کے اس کھٹکے کا مرہون منت ہے کہ اگر دستور میں اسلام کا پیوند نہ لگایا گیا تو عین ممکن ہے عوام میں وہ جماعتیں زیادہ مقبول ہو جائیں جو اسلام کا نعرہ لگا رہی ہیں۔ دوسرے خود حکمران گروہ چونکہ مختلف دھڑوں میں تقسیم ہے اس لیے وزارتی دھڑے کو یہ اندیشہ تھا کہ مخالف دھڑا اپنے آپ کو اسلامی نظام یا دستور کا حامی و موید ظاہر کرنے لگے گا، اور اس طرح اول الذکر کو میدان سیاست میں شکست دینے کے لیے اس کے ہاتھ میں ایک موثر ہتھیار آ جائے گا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگرچہ محض جذبات کے بل پر تعمیر کا کوئی باقاعدہ کام تو نہیں کیا جا سکتا لیکن جس ملک کی ساری سیاست کش مکش اقتدار کے محور پر گھومتی ہو اس میں سیاست دانوں کے مختلف دھڑوں کو اٹھانے اور گرانے میں عوامی جذبات بعض صورتوں میں نہایت ہی اہم کردار کر جاتے ہیں۔ اگرچہ ایسے معاشرے میں خالص اصولی تحریکوں کے لیے حقیقی عوامی تائید حاصل کرنا تو بہت مشکل ہوتا ہے لیکن حکمران طبقے کے مختلف دھڑے

انہی اصولوں کو اپنی کش مکش اقتدار کے دوران استعمال کر سکتے ہیں۔ جو اصول محض اس قسم کے منفی جذبے کے تحت دستور میں شامل کئے جائیں گے ان کے نفاذ کے امکانات کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔

ہم ناظرین سے گزارش کریں گے کہ وہ ایک بار پھر ان مباحث کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیں جو ہم نے دستور کی حیثیت اور کسی ملک کے نظام سے اس کے تعلق کے سلسلے میں حصہ دوم میں کئے تھے۔ ان مباحث میں ہم نے یہ واضح کیا تھا کہ

ا۔ دستور محض کسی ملک یا ادارے کے انتظامی ڈھانچے کے نقشے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ب۔ دستور میں وہ قوت نافذہ نہیں ہوتی جس کے باعث وہ مقاصد جنہیں ذہن میں رکھ کر اسے مرتب کیا گیا ہو لازماً حاصل ہو جائیں۔

ج۔ دستور سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے کا انحصار اس قیادت کی صلاحیت کار، دیانت و امانت اور راست بازی پر ہے جو اسے چلا رہی ہو۔ وہ اگر معروف دستوری روایات و اخلاقیات کی پابندی کرے گی تو دستور سے اچھے نتائج نکلیں گے ورنہ بہترین سے بہترین دستور بھی کاغذ کے ایک بیکار پرزے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اچھی قیادت اسی صورت میں ابھر سکتی ہے جبکہ ملک میں ایک بیدار رائے عامہ اور ایک مضبوط تعلیم یافتہ طبقہ موجود ہو۔

اس کے علاوہ ہم نے واضح مثالیں دے کر یہ ثابت کیا تھا کہ

(د) فی الحقیقت قیام نظام یا تعمیر و ترقی کی کسی سکیم کی تنفیذ کے ایک خاص مرحلے پر موزوں دستور خود بخود آتا ہے اور اس کے لیے کوئی خصوصی جدوجہد نہیں کرنا پڑتی جس طرح اصولوں کے کسی خاص ضابطے کو اپنانے سے زندگی کے تمام شعبے اس کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اسی طرح دستور بھی ناگزیر طور پر اس ضابطے کے مطابق مرتب کیا جاتا ہے۔

اگر یہ باتیں ذہن نشین ہو چکی ہوں گی تو ہمارے ناظرین کے لیے یہ بات سمجھنا چنداں مشکل نہ ہو گا کہ اگر اس دستور کو ایک اچھا اسلامی یا جمہوری دستور تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ایک بیدار رائے عامہ، مضبوط تعلیم یافتہ طبقے اور باصلاحیت قیادت کے فقدان کی وجہ سے اس سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اصولوں اور نظریات پر ایمان اور انہیں ایک اجتماعی ضابطے کی حیثیت سے نافذ کرنے کا تعلق ذہنی و قلبی آمادگی سے ہے۔ جس طرح ایک فرد کو قانون کے زور سے اخلاق و دیانت کی اعلیٰ قدروں سے آراستہ نہیں کیا

جاسکتا، اس طرح کسی قوم یا حکمران طبقے سے ایسے ضابطہ زندگی پر محض قانون ودستور کے دباؤ کے تحت عمل نہیں کرایا جاسکتا جس کے نفاذ کے تقاضے کوئی قوم اپنے قلب وذہن کی پوری آمادگی کے ساتھ ازخود پورے نہ کرے۔ اس وقت دنیا کے متعدد مسلمان ممالک کے دساتیر میں قانون سازی کے اسلامی شریعت کے تابع ہونے کی شق موجود ہے اور اس سے پہلے بھی اکثر و بیشتر مسلمان ممالک کے حکمران اس اصول کو تسلیم کرتے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان ممالک کی اجتماعی زندگی پر اسلامی نظام کا ہلکے سے ہلکا پرتو بھی نہیں پڑا۔

اس اصولی بات کی وضاحت کے بعد ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس کی یہاں گنجایش ہے کہ اس دستور میں اسلامی یا جمہوری نقطہ نظر سے کیا کیا خامیاں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ملک میں پائے جانے والے بہت سے دینی وسیاسی عناصر نے اپنی اپنی صوابدید اور مصالح کے تحت اسے اسلامی یا جمہوری دستور قرار دیا ہے، لیکن انہی عناصر نے اپنی تنقیدات کے ذریعے اس دستور میں ایسی ایسی خامیوں کی نشاندہی کی ہے جن سے انسان حیران وششدر رہ جاتا ہے کہ اس کے بعد بھی اس دستور کو اسلامی یا جمہوری قرار دیا جاسکتا ہے۔

کمیونزم

اسلام کے برعکس کمیونزم کے امکانات پر ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے گفتگو کرنا پڑے گی۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ دور حاضر میں اسلام کے اصولوں کی تنفیذ کا موقعہ نہیں آیا لیکن کمیونزم اس وقت عملاً دنیا کے متعدد ممالک پر چھا چکا ہے اور اب صرف تصورات میں نہیں بلکہ عمل کی دنیا میں یہ ایک قائم شدہ نظام کی حیثیت سے موجود ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک نظریاتی ہی نہیں بلکہ سیاسی وبین الاقوامی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں اس ملک میں کمیونزم نے ابھی کسی منظّم تحریک کی شکل اختیار نہیں کی لیکن اس کے باوجود یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہاں کمیونزم کے لیے کام کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یا اس ملک میں آئندہ کمیونزم کے ابھرنے کی کوئی گنجایش ہی موجود نہیں۔ یہ نظریہ بالکل خام خیالی کے ہم معنی ہوگا۔ کمیونزم اب مختلف ممالک میں محض کمیونسٹ جماعتوں کی سعی وجہد کا محتاج نہیں رہا، بلکہ اب ایک عالمی تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے اور اس کے نظریات عالمی نظریات کا مستقل جزو بن چکے ہیں۔ زندگی کے جس پہلو کے متعلق جو لٹریچر بھی شائع کیا جائے گا، چاہے عام پبلک کی افادیت کے لیے ہو یا تعلیم گاہوں اور مدرسوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس میں کمیونسٹ نظریات کو لازماً جگہ دینا پڑے گی۔ اب ان نظریات کی

اشاعت و تبلیغ صرف کسی ملک کی کمیونسٹ پارٹی کی کوششوں پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ سرمایہ دار ممالک کمیونزم کے خلاف جو لٹریچر شائع کر رہے ہیں اس میں انہیں ناگزیر طور پر کمیونزم کے متعلق اس قدر معلومات دینا پڑتی ہیں کہ یہ لٹریچر بجائے خود کمیونزم کے تعارف کا ایک بہت بڑا ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔ کمیونزم کے بعض نظریات نے ایسے نعروں کی شکل اختیار کر لی ہے جو دنیا کی آبادی کی عظیم اکثریت کے لیے اپنے اندر بہت زیادہ جاذبیت رکھتے ہیں اور چاہے ان پر کمیونزم کا لیبل لگا ہوا یا نہ ہو، وہ نعرے عوام میں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کمیونزم کے مخالف ممالک میں بھی، خصوصیت کے ساتھ اقتصادی معاملات کے سلسلے میں ایسے ایسے اقدامات کئے جا رہے ہیں جن کا باعث کمیونزم کے نفوذ کا خطرہ ہے۔ اگرچہ ایسے اقدامات سے بعض ممالک نے فوری طور پر خالص کمیونزم کے نفوذ کے عمل کو روک لیا ہے، لیکن اس سے کمیونزم کی ساکھ میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔ اور یہ بات طے ہو گئی ہے کہ بحالات موجودہ یہ ملک مدافعت کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور کمیونزم ان پر تابڑتوڑ حملے کر رہا ہے۔ اگر کسی غیر متوقع واقعہ سے حالات کا رخ نہ بدل جائے تو عام طور پر اس قسم کی لڑائی کا فیصلہ جس فریق کے حق میں ہوا کرتا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

اگرچہ روس میں ۱۹۱۷ء کے کمیونسٹ انقلاب سے قبل بہت سا فکری و سیاسی کام لیا گیا تھا اور اس کی شدید ضرورت بھی تھی لیکن اب کمیونزم کے نظریات اس قدر نمایاں ہو گئے ہیں اور دنیا ان سے اس قدر وسیع پیمانے پر متعارف ہو چکی ہے کہ بعض اوقات غیر متوقع طور پر حالات کے معمولی سے الٹ پھیر سے بعض ممالک اس کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ روس کے بعد مختلف ممالک میں کمیونزم نے نہایت ہی عجیب عجیب طریقوں سے نفوذ کیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے ممالک جو جنگ عظیم دوم سے قبل یا اس کے دوران نظام جمہوریت یا سرمایہ داری کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے اب کمیونسٹ دنیا کا جزو بن چکے ہیں۔ [۴] اس نقطہ نظر سے اب اس بات کو بعید از قیاس قرار نہیں دیا جا سکتا کہ آج جس ملک میں کمیونزم منظّم تحریک کی حیثیت نہیں رکھتی وہ کل بین الاقوامی حالات ہی کے ردوبدل کے تحت اس کی لپیٹ میں آ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کے حق میں اب بین الاقوامی اور عالمی سطح پر فکری کام اس قدر وسیع پیمانے پر ہو چکا ہے کہ اب مختلف ممالک میں قومی سطح پر اس کے لیے منظّم جماعتوں کے ذریعے کام کرنا اس قدر ضروری نہیں رہا جس قدر دوسرے نظریات کے لیے۔ دوسرے اب ہر ملک کے حالات کے مطابق دنیا میں مختلف جماعتیں ایسے ایسے نعروں اور لیبلوں کے ساتھ کام

کر رہی ہیں کہ انہیں قانونی طور پر تو کمیونسٹ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اگر کسی نہ کسی طرح اقتدار ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے، تو وہ بعض اوقات مجبوریوں کے تحت اور بعض اوقات بطیّب خاطر ماسکو ہی کے زیر اثر چلی جاتی ہیں۔ جہاں تک فکری انقلاب کا تعلق ہے اس کی کسر ایک آمرانہ اور جابرانہ (Totalitarian) نظام کے ذریعے پوری کر لی جاتی ہے۔ جب یہ نظام آ جاتا ہے تو ہر ملک میں تعلیم یافتہ طبقے میں سے ایسے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد مل جایا کرتی ہے جو کمیونزم سے پورا پورا تعارف رکھتے ہیں۔ اگرچہ پہلے یہ لوگ کمیونسٹ یا کسی کمیونسٹ نما پارٹی سے متعلق نہیں ہوتے۔ اس بات کو مبالغہ آمیز قرار نہیں دیا جا سکتا کہ یہ نظریہ اب دنیا میں اس قدر تعارف پیدا کر چکا ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں اس وقت یہ کیفیت نہیں ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ لوگ اس سے پوری طرح بے خبر ہوں یا وہاں کے عوام اس کے موٹے موٹے اصولوں اور نعروں سے متعارف نہ ہوں۔ اب بین الاقوامی نقطہ نظر سے کمیونزم کی مثال ایسی ہے جیسے افراد کے معاملے میں کسی نئے دین یا نظریے کی ہوتی ہے۔ جب کوئی نظریہ ابھی نیا نیا پیش کیا جا رہا ہو تو اس کے لیے ایک ایک فرد سے رابطہ پیدا کر کے تبلیغ کرنا ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ باقاعدہ ایک نظام اور قوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس کے متبعین کی تعداد بڑھ جاتی ہے وہ زندگی کے بہت سے معاملات پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے ہر جگہ اور زندگی کے ہر مسئلے کے ضمن میں زیر بحث لایا جاتا ہے تو اس کے مخاطب افراد نہیں بلکہ گروہ، جمعیتیں اور اقوام ہوتی ہیں، اور لوگ اس میں جوق در جوق داخل ہوتے ہیں۔ کمیونزم اب قوموں کے معاملے میں اس مرحلے میں داخل ہو چکا ہے اور اب دیکھتے ہی دیکھتے پورے پورے ملک اور پوری پوری قومیں اس کے حلقہ اثر میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ہم نے سطور بالا میں کمیونزم کا وہ روشن پہلو پیش کیا ہے جس سے دنیا کے چند ایسے ترقی یافتہ اور متمول ممالک کو چھوڑ کر جنہوں نے قومی پیداوار کی فروانی کی بدولت تقسیم دولت کا مناسب انتظام بھی کیا ہے اور ان کے نچلے معاشی طبقے کو بھی اونچا معیار زندگی میسر ہے دنیا کے بقیہ تمام پسماندہ ممالک ہر وقت متاثر ہو سکتے ہیں۔ اور کسی ملک کے باشندوں کو یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ چونکہ ان کے درمیان کوئی منظّم کمیونسٹ تحریک نہیں چل رہی، اس لیے اسے کمیونزم سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ در حقیقت اس پہلو کو مد نظر رکھ کر ہم نے یہاں کمیونزم کے امکانات پر گفتگو کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا کا کوئی ملک بھی کمیونزم کے پیدا کردہ عالمی مسائل سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

لیکن اگر کمیونزم کی اس عالمی حیثیت و قوت کے پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دوسرے بہت سے ممالک کے مقابلے میں یہاں کمیونزم کے نفوذ کے امکانات بہت کم ہیں۔ اور اگر بین الاقوامی حالات کے کسی غیر متوقع الٹ پھیر سے کوئی حادثہ پیش نہ آجائے تو کمیونزم کے لیے پاکستان میں اس وقت اس وسیع پیمانے پر کام نہیں ہو رہا جس سے مستقبل قریب میں اس نظریے کے غلبے کی پیشین گوئی کی جا سکے۔ کمیونزم کے خلاف یہاں جو سب سے اہم عامل کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت ہے اور کوئی مسلمان قوم چاہے اسلام سے جس قدر بھی دور ہو اس کے ذہن میں یہ تصور بہت مضبوط جڑیں رکھتا ہے کہ وہ ایک نظریہ حیات رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ احساس بھی موجود رہتا ہے کہ ہماری بدحالی کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اسلام ہمارے مسائل کو حل نہیں کر سکتا بلکہ اس کی وجہ اسلام سے ہماری اپنی رو گردانی ہے۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ خیال غلط ہے یا درست، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس تصور کے ہوتے ہوئے دوسرے معاشروں کے مقابلے میں ایک مسلمان قوم کے لیے کسی دوسرے ضابطہ زندگی کی تلاش میں نکلنا ذرا زیادہ مشکل ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کی اسلام سے جذباتی وابستگی ہی وہ واحد عامل ہے جو یہاں کمیونزم کے طوفان کے آگے اس وقت بند باندھے ہوئے ہے۔ بیرونی اقتصادی امدادیں یا دوسرے ممالک سے معاہدات نظریاتی طوفانوں کے آگے ہمیشہ تنکوں کی طرح بہہ جاتے رہے ہیں، جیسا کہ ماضی قریب میں چین میں ہو چکا ہے اور آئندہ بھی یہ کوئی کام نہ دے سکیں گے۔ لیکن یہاں ہم متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ مسئلے کا یہ پہلو ایک عامل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس پر مناسب حد سے زیادہ انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بند جب تک کہ اسے طوفان کی شدت کے مطابق زیادہ۔ سے زیادہ مضبوط نہ کیا جاتا رہے بالآخر طوفان کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر منہدم ہو جاتا ہے۔ مسلمان گزشتہ تین چار صدیوں سے اسی ایک بند کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے ہیں لیکن اب اس میں شگاف رونما ہو رہے ہیں اور اس کا زیادہ عرصے تک اپنی جگہ پر قائم رہنا مشکل نظر آ رہا ہے۔ کوئی قوم اپنے مثبت نظریات کو اپنائے بغیر غیر معین عرصہ کے لیے بیرونی نظریاتی حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور جو فکری انتشار مسلمانوں میں رونما ہو رہا اگر اس کا قلع قمع نہ کیا گیا اور اسلام کے اصولوں کو مثبت طور پر نہ اپنایا گیا تو کمیونزم یا کسی دوسرے غیر اسلامی ازم کی یلغار کو ہمیشہ کے لیے نہ روکا جا سکے گا۔

جہاں تک خالصتاً پاکستان کی داخلی سیاست کا تعلق ہے یہاں بعض عناصر اور جماعتوں نے جزوی طور پر کمیونزم کے اصولوں اور طریق کار کو اپنایا ہوا ہے۔ ان میں کردار کی وہ پختگی نہیں پائی جاتی جو کسی نظریے کو

اپنانے کے بعد ایثار اور قربانی پر آمادہ کر سکتی ہے اس لیے یہ عناصر کھلم کھلا کمیو نزم کو لے چلنے کا تو بل بوتا نہیں رکھتے البتہ کمیو نزم کی عالمی ساکھ سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہوں نے کچھ ایسے نعرے اپنا رکھے ہیں جو کمیونسٹ جماعتوں کے نعروں کے مشابہ ہیں۔ اور یہ لوگ توڑ پھوڑ کے انہی طریقوں کو اختیار کرنا چاہتے ہیں جن سے متعدد ممالک میں کمیو نزم کے لیے راستہ ہموار ہوا ہے۔ گویا حصول اقتدار اور نمایاں ہونے کی خاطر چھوٹے راستے تو اختیار کیے جا رہے ہیں لیکن علی الاعلان اصول اور نظریے کو اپنانے کی ہمت نہیں ہے اس لحاظ سے اس ملک کی سیاسیات میں خالص کمیو نزم کوئی مستقل عامل کی حیثیت نہیں رکھتا اور اس ملک میں ہونے والے موجودہ کام کے زور پر اس کے ابھرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا جب تک کہ کوئی خاص خارجی عامل اثر انداز ہو کر حالات کا رخ نہ موڑ دے جیسا کہ مشرقی یورپ کے ممالک میں ہوا۔

حواشی

۱۔ اس سے اس لٹریچر کی تحقیر مقصود نہیں ہے۔ اس کے بر عکس ہماری رائے یہ ہے کہ ہر قوم اور ملت کے اسلاف کی علمی کاوشیں اُس کے لیے ایک نہایت ہی مفید اور قابل احترام سرمایہ ہوتی ہیں۔ ہر دور کا لٹریچر کسی قوم یا ملت کے فکری ارتقا کے سلسلے کی اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں بعض حضرات نے پرانے لٹریچر کو دریا بُرد کر دینے کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق ہم یہی عرض کر سکتے ہیں کہ وہ ملی حیثیت سے احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور انھیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ہر دور کی علمی کاوشیں انسانی فکر کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ امر باعثِ حیرانی ہے کہ یورپ کے علماء محققین تو آج سے ہزاروں سال قبل کے زمانے کے حالات اور علمی و فکری رجحانات کا علم حاصل کرنے کے لیے طبقات الارض کی خاک چھان رہے ہیں لیکن ہمارے ہاں عجیب علمی ذوق پرورش پا رہا ہے کہ اپنے ہی اسلاف کی فکری کاوشوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

۲۔ یاد رہے کہ ایک دینی رہنما نے ایک دفعہ اسلامی حکومت کے کارکنوں کے معیار پر گفتگو کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا تھا کہ موجودہ نظام کے ہائی کورٹ کے جج اسلامی نظام کی عدالتوں کے چپراسی بھی نہ بنائے جا سکیں گے۔

۳۔ جماعت اسلامی کے امیر نے ایک مرحلے پر اس دستور کے متعلق ایک بیان میں یہاں تک بھی کہہ دیا کہ یہ نہ اسلامی ہے اور نہ جمہوری۔

۴۔ جنگِ عظیم دوم کے بعد جو ممالک کمیونزم کے حلقے میں داخل ہوئے ہیں، ان کی آبادی پچھتر (۷۵) کروڑ یعنی کرہ ارض کی مجموعی آبادی کا ایک تہائی ہے۔ جنگ کے دوران چین کے بعض شمالی مشرقی علاقوں کو مستثنا کرکے یہ سب ممالک غیر کمیونسٹ نظاموں کے تحت تھے۔

انتشار کی وبا

چونکہ اجتماعی ترقی کے کسی اصولی پروگرام کو سامنے رکھ کر تعمیر فکر و سیرت کا کوئی کام باقاعدہ طور پر نہیں ہو رہا اس لیے اس وقت پاکستان میں ان تمام عناصر کی توجہات جو یہاں کے اجتماعی و سیاسی معاملات میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس کشمکش اقتدار پر مرکوز ہیں جو اس ملک میں برپا ہے۔ جو لوگ برسر اقتدار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مختلف دھڑے تو براہ راست اس کش مکش میں حصہ لے رہے ہیں چاہے ان میں سے کوئی دھڑا ایوان حکومت پر قابض ہو یا نہ ہو، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو اپنے مجلسی مرتبے (Social Status) کے لحاظ سے اس طبقے میں شامل نہیں ہیں اور اس کشمکش اقتدار میں عملاً حصہ لینے کے لیے ان کے پاس وسائل بھی موجود نہیں اپنی سیاست کو اس کش مکش کے نقطہ نظر سے چلاتے ہیں اور اصلاح حال کے لیے انتخابات پر ہی جو کشمکش اقتدار کی دستوری شکل ہے ——— اگرچہ یہ ایک صحت مند شکل بھی ہو سکتی ہے اور غیر صحت مند بھی ——— بھروسہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ انتخابات میں حصہ لے کر جماعتی سطح پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش بجائے خود معیوب چیز نہیں ہے لیکن ہم یہاں جو کچھ عرض کر رہے ہیں اسے صحیح طور پر سمجھنے اور اس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے قومی تعمیر و ترقی کے ان بنیادی خطوط کو پیش نظر رکھنا چاہئے جن کی وضاحت ہم نے گزشتہ صفحات میں کی ہے۔ ہمارے نزدیک قوم میں تعمیر و ترقی کے بنیادی اصولوں اور ان پر عمل پیرا ہو کر اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے طریق اور انداز کا کوئی تصور پیش کئے بغیر انتخابات میں حصہ لینا محض کش مکش اقتدار کے ہم معنی ہے۔ جب حالت یہ ہو کہ قوم کو زندگی کے کسی نظریے کا شعور نہ ہو، معاشی، معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے قوم نے ایک ایسے طبقے کی بالفعل قیادت قبول کر رکھی ہو جو مفاد پرستی کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا، قوم کی حالت ایسی ہو کہ وہ انتخابات میں دیانت و امانت کی قدروں کو بالکلیہ نظر انداز کر دیتی ہو اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ قوم میں ایسے عناصر موجود ہی نہ ہوں جن پر اعتماد کیا جا سکے کہ وہ کسی نظام کو قائم کرنے کی فکری و عملی صلاحیتیں رکھتے ہوں تو ان حالات میں آخر منطق کے کس اصول کے تحت یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ انتخابات کے ذریعے ایسی قیادت بروئے کار آ جائے گی جو اس ملک میں تعمیر و ترقی کا کوئی پروگرام لے کر چل

سکے۔ اس وجہ سے وہ لوگ بھی جو صلاحیت کار سے قطع نظر کسی نظام کو لے کر چلنے کا داعیہ رکھتے ہیں عملاً کشمکش اقتدار کی کان نمک کا ہی حصہ بن رہے ہیں اور اپنی تمام قوتوں کو ملک کے موجودہ طرز سیاست ہی کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت اس ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں پیش آمدہ مسائل کا صحیح شعور پیدا کرنے اور کسی نظریہ زندگی کو اس کی جملہ تفصیلات کے ساتھ اس کے ذہن نشین کرانے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی۔ ہر عنصر نے اس سیاسی کھیل تماشے میں کوئی نہ کوئی کردار اپنے ذمے لے رکھا ہے اور اس طرح کسی عنصر میں بھی اس ملک میں چھائی ہوئی سیاسی فضا کے مہلک جراثیم سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ معمولی معمولی مصالح بیان کر کے ہر جماعت اور سیاسی گروہ دوسروں سے جوڑ توڑ کرنے میں مصروف ہے اور اس طرح ہر موقع پر ہر گروہ منطق کے زور سے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے فلاں فلاں معاملے میں دوسرے سے جو مصالحت کی ہے اس میں یہ یہ قومی فوائد ملحوظ تھے۔ حالانکہ اکثر و بیشتر مواقع پر صورت یہ ہوتی ہے کہ سیاسی گٹھ جوڑ کرتے وقت قومی و ملکی مفاد کا خیال ذہن و قلب کے کسی گوشے میں بھی موجود نہیں ہوتا اور بعد کے حالات بھی یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ اس سیاسی ناطے سے کوئی تعمیری نتیجہ پیدا کرنے کی سرے سے کوئی خواہش ہی نہ پائی جاتی تھی۔

اگر کسی کام کو انجام دینے کے لیے مقصد کے تعین کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی مقام پر پہنچنے کے لیے راستے کا جاننا ناگزیر ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اس ملک کے اندر ہلکے سے ہلکے پیمانے پر بھی قومی تعمیر و ترقی کا کوئی کام نہ کیا جا سکے گا۔ ہم گزشتہ ابواب میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ اجتماعی تعمیر کے لیے کسی نہ کسی نظریے کو اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے اور تعمیر کے پروگرام کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے اس نظریے کا واضح شعور اور اس پر عمل پیرا ہونے کے طریق کا واضح تصور ذہنوں میں موجود ہونا چاہئے۔ ان شرائط کی عدم موجودگی میں قومی سطح پر کوئی کام انجام نہیں پا سکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہ اس وقت قوم کے سامنے کوئی مقصد موجود ہے اور نہ کسی مقصد کے حصول کے لیے وہ کسی سوچے سمجھے ہوئے راستے پر چل رہی ہے۔ ان حالات میں حصول اقتدار کو واحد مقصد قرار دینے والی مختلف جماعتوں کی کش مکش سے تعمیری نتائج برآمد ہونے کی توقع رکھنا انتہا درجے کی سادہ لوحی ہے۔

نئے دستور کی تکمیل پر یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ قوم کا مقصد متعین ہو گیا۔ یہ ایک ایسا قانونی انداز تکلم ہے جس کا عملی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ دنیا میں اس وقت کوئی ایسی قوم موجود نہ ہو گی جس کے رہنما حکمران

اور عوام کسی سیاسی واخلاقی ضابطے سے اپنی وابستگی کا اظہار نہ کرتے ہوں۔ مثلاً دور حاضر میں ہر قوم اور جماعت یہ دعویٰ کرتی ہے اور ہر دستور بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مطمع نظر ایک ایسا نظم حکومت قائم کرنا ہے جس کی بنیاد عوامی تائید وحمایت اور جس کا مقصد عوامی فلاح وبہبود ہو لیکن اس کے باوجود ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر کہیں بھی معقول قسم کا ایسا جمہوری نظام قائم نہیں ہے جس کا اصل مقصد فلاح عامہ ہو۔ اسی طرح بہت سے دوسرے مقاصد کا اظہار بھی کیا جاتا ہے لیکن ان کے حصول کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جاتی۔ ان سب خام خیالیوں اور کھوکھلے دعاوی کو مقصد کے تعین سے تعبیر کر دینا الفاظ کا نہایت ہی غلط استعمال ہے۔ جب ہم کسی قوم کے متعلق یہ کہیں گے کہ اس کا مقصد یا منزل کا تعین ہو گیا تو اس کا ہمیشہ یہ مطلب ہو گا کہ اس قوم نے اپنے اندر فکری و عملی طور پر اس مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی آمادگی اور صلاحیت پیدا کر لی ہے۔ اور اب وہ اس راستے پر چل پڑے گی۔ لیکن اگر کسی قوم نے اعلان کردہ مقصد کے مطابق اپنے انداز فکر و عمل میں کوئی تغیر برپا نہ کیا ہو اور سیاسی الٹ پھیر سے اس کے حکمران محض دستور میں کوئی مقصد متعین کر لیں تو اسے قومی مقصد کے تعین سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی ان الفاظ کے استعمال پر اصرار کرے تو وہ اپنے فعل کا مختار ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے وہ منطقی نتائج نہ نکل سکیں گے جو واقعتاً کسی مقصد کے تعین کے بعد نکلا کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص حج پر جانے کا ارادہ ظاہر کرے لیکن نہ تو وہ پاسپورٹ کی درخواست دے نہ زاد راہ مہیا کرے، نہ جہاز پر اپنی جگہ مخصوص کرائے بلکہ اس کے برعکس وہ ایام حج کے دوران اپنی یہاں کی مصروفیات کے پروگرام وضع کرتا پھرے۔ اب آپ بے شک اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اس شخص کے دعوے کے مطابق یہ کہہ دیں کہ فلاں شخص نے حج پر جانے کا ارادہ کر لیا ہے، لیکن ایک صاحب ہوش اور حقیقت بین آدمی اس کے حج پر جانے کے ارادے کو کوئی وقعت نہ دے گا۔ یہی حالت دستوری طور پر اعلان کردہ قومی مقصد کی ہوتی ہے۔ سیاسی حالات و مصالح کے تحت اگر کوئی حکمران طبقہ دستوری طور پر کسی قومی مقصد کا تعین کر بھی لے تو جب تک قوم کے مجموعی حالات اور قیادت کے طرز عمل میں تغیر نہ آئے یہ تعین مقصد کوئی نتائج پیدا نہیں کر سکتا اور فی الحقیقت ان حالات میں یہ کہا بھی نہیں جا سکتا کہ منزل کا تعین ہو گیا۔ اس وقت دیانت وامانت کی قدروں کا معمولی سا پاس رکھنے والا کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قوم کا مجموعی طرز عمل یا حکمران طبقے کا فکر و کردار کسی حیثیت سے بھی اس مقصد سے ہم آہنگ ہے جس کا دستور میں اعلان کیا گیا ہے۔ اگر موجودہ حکمران گروہ محض اتفاق سے برسر اقتدار آ گیا ہوتا لیکن قوم کا فکر و شعور اور سیرت و

کرداراس مقصد کے مطابق ہوتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ انتخابات کے ذریعے موجودہ قیادت کو ہٹا کر ایسی قیادت ابھاری جائے گی جو اس مقصد کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ لیکن اگر قوم بھی ایسی ہی ہو جس طرح کا موجودہ حکمران طبقہ ہے تو آخر ان حالات میں دستور کی ایک شق کی بنیاد پر تغیر واصلاح کا کیا امکان ہو سکتا ہے۔

اس وقت قوم میں فکری یکسوئی کی وہ کم از کم شرائط بھی نہیں پائی جاتیں جو کسی اجتماعی مقصد کو اپنانے کے لیے ضروری ہوتی ہیں بلکہ اس کے برعکس فکری و سیاسی اور معاشرتی سطح پر انتشار کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس کیفیت کو ایسے اختلاف سے تعبیر کریں جو ہر ایسے گروہ یا قوم میں پایا جاتا ہے جو فکری طور پر بیدار اور اصلاح کے نئے نئے راستے تلاش کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک اختلاف اور انتشار میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ٹھوس بنیادوں پر غور و تفکر اور تعمیری سرگرمیوں میں اپنے اپنے ڈھنگ اور نظریے کے مطابق منہمک رہنے سے جو متعدد آراء سامنے آتی ہیں وہ واقعتاً اختلاف کی حیثیت رکھتی ہیں اور تعمیر و ترقی کے کام میں مانع نہیں ہوتیں۔اس سے قوم کے اندر سوچنے کی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور اپنے اپنے عمل کے لیے کسی نہ کسی ٹھوس نظریے کو اپنانے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔اس حالت میں جو جماعت جس شعبے میں جس حیثیت سے کام کرتی ہے اس سے تعمیری نتائج ہی نکلتے ہیں چاہے آپ اس تعمیر کے بنیادی خطوط سے اختلاف کریں یا اتفاق لیکن اس کیفیت کو جو آوارہ فکری اور محض سیاست بازی سے رونما ہو، جہاں کسی نظریے اور ٹھوس فکر کے بغیر مختلف عناصر سرگرم عمل نظر آئیں اور اگرچہ کچھ اصولوں کا نام تو لیا جائے لیکن ہر فعل انفرادی اور گروہی مفاد کی روشنی میں انجام پائے، انتشار سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔اس کیفیت کی موجودگی میں اصلاح و تعمیر کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں انتشار کی یہی کیفیت پائی جاتی ہے اور اسے نظریاتی اختلاف سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ فی الحقیقت یہی کیفیت اس صورت حال کی ذمہ دار ہے جس کا ایک مجمل سا خاکہ ہم نے پچھلے صفحات میں کھینچا ہے۔

محض انتخابی پروگرام سے تعمیر نہ ہو سکے گی

ہماری رائے میں اس صورت حال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس ملک میں ایسی سیاسی سرگرمیوں کو جن کا مقصد وحید حصول اقتدار ہوتا ہے، قومی تعمیر و ترقی کی مساعی کے ہم معنی قرار دیا جاتا ہے۔ اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ جن ممالک کی تقلید و اتباع میں یہاں نیابتی طرز حکومت قائم ہوا ہے ان کی زندگی کے بنیادی اصول طے پا چکے ہیں۔ وہاں اس وقت اجتماعی زندگی کی اساسات کو وضع کرنے یا قوم میں ان کا شعور پیدا کرنے کا مرحلہ در پیش نہیں ہے بلکہ وہاں صرف طے شدہ اساسی اصولوں کے تحت زندگی کے نظام کو چلانے کا سوال ہے۔ چنانچہ ایسے بنیادی قومی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جن پر قریب قریب سب سیاسی عناصر کا اتفاق ہے مختلف جماعتیں اپنا اپنا پروگرام پیش کرتی ہیں اور عوام کی اکثریت جس پروگرام کی حمایت کرتی ہے وہی برسر اقتدار آجاتی ہے۔ ہمارے ہاں سیاسیات میں دلچسپی لینے والے عناصر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ شاید اس ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے سعی وجہد کرنے کی بھی یہی ایک صورت ہے کہ اپنے آپ کو عوام کے سامنے انتخاب کے لیے پیش کیا جائے اور عوام جس جماعت کے حق میں رائے دے دیں، وہی حکومت پر قابض ہو جائے۔ اس غلط فہمی کو جتنی جلدی ذہنوں سے نکال دیا جائے اتنا ہی مفید ہے۔ اس وقت کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ انتخابات کے نقطہ نظر سے جزوی اور تفصیلی مسائل کا حل پیش کیا جائے۔ بلکہ حالات کی مناسبت کے اعتبار سے اس وقت جس نوعیت کے کام کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ قوم کو اجتماعی تعمیر و اصلاح کے کسی ضابطے کے اصولوں سے روشناس کرایا جائے۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر سب جماعتیں انتخابات میں حصہ لینا چھوڑ دیں تو اس ملک کے نظم کو کون چلائے گا۔ اور اگر اچھے لوگ میدان سیاست سے ہٹ جائیں تو یہ سارا نظام برے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے گا۔ ایسے سادہ لوح معترضین سے ہم یہی عرض کریں گے کہ معاشرے کی موجودہ حالت میں یہاں اقتدار پر پہلے ہی نااہل عناصر کی اجارہ داری ہے۔ اور حکمران حلقوں میں قومی تعمیر کا صحیح جذبہ رکھنے والے لوگ آج تک راہ نہیں پا سکے اور جب تک بنیادی اصلاح کا کام نہ ہوگا یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ ایسے لوگ یہاں کبھی بھی برسر اقتدار آسکیں گے۔ اس لیے ایک ایسے طریق کار کے ذریعے قیادت اور نظام کو بدلنے کی کوشش کرنا

جس سے نہ تو گزشتہ دس سالوں میں اچھے نتائج نکل سکے ہیں اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے محض تضیع اوقات نہیں تو اور کیا ہے۔ اگر قوم میں فکری و اخلاقی انقلاب برپا کئے بغیر محض انتخابات کے ذریعے اچھی قیادت بروئے کار آسکتی اور اس ملک میں تعمیر و ترقی کے کام کی ابتدا کا کوئی امکان ہوتا تو ہمیں اس طریق کار پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ ہم اصولی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لینے کی مخالفت نہیں کر رہے۔ ہمارا موقف صرف یہ ہے کہ جو لوگ یہ اصول تسلیم کرتے ہیں کہ قومی تعمیر و ترقی کے لیے کسی نہ کسی ضابطہ زندگی کو اپنانا ضروری ہے ان کے لیے تربیت کار کے لحاظ سے اس وقت انتخابات میں حصہ لینے کا نہیں بلکہ اس ضابطہ زندگی کو قوم کے ذہن و قلب کی گہرائیوں میں اتارنے کا کام اصل اہمیت رکھتا ہے۔ جس وقت انتخابات کا مرحلہ آئے گا قوم اور معاشرہ خود بخود اچھے عناصر کو ابھار لائے گا۔

دوسری بات جو ہم اس سلسلے میں واضح کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ اگر انقلاب فکر کی کوششوں کی ضرورت پر زور دیا جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایسی کوششیں کرنے والے قوم کی اجتماعی زندگی سے کٹ جاتے ہیں اور میدان سیاست میں نااہل و بددیانت عناصر کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس اصل صورت یہ ہوتی ہے کہ انقلاب فکر کی مہم کے دوران ہی زندگی کی موجودہ حالت پر تنقید و تبصرہ جاری رہتا ہے۔ لیکن جن جماعتوں کے پیش نظر قومی تعمیر کا کوئی نصب العین ہو وہ فکر کے دائرے میں ضروری ابتدائی کام کرنے سے قبل اپنی ساری کوششیں اس تبصرہ و تنقید اور انتخابات کی نذر نہیں کر دیتیں بلکہ اپنے کام کے تقاضوں کے مطابق جدوجہد کے ہر مرحلے اپنی توجہات کو موزوں و مناسب تناسب سے مختلف شعبوں کے درمیان تقسیم کرتی ہیں۔

اس بات پر ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ جو حضرات قوم کے غم میں رات دن گھلے جا رہے ہیں اور ان کا یہ تاثر اور رجحان فکر بہت شدت اختیار کر چکا ہے کہ انہیں میدان سیاست و انتخاب میں خود اتر کر نااہل عناصر کے عزائم کے راستے میں موثر رکاوٹ ڈالنی چاہئے اور خود برسر اقتدار آکر ہی اس ملک کے دکھوں کا علاج کرنا چاہیے۔ ان سے ہم گزارش کریں گے کہ وہ عارضی طور پر کچھ عرصہ کے لیے ملک و قوم کی پریشانیوں کو برداشت کر لیں اور وہ کام کریں جس کے بغیر اصل مقصد کا حصول ناممکن ہے۔ کسی خرابی کے مستقل علاج کی خاطر اگر آغاز علاج میں بیماری کی اصل جڑ کی طرف متوجہ ہونے کی خاطر کچھ تکلیف برداشت کر لی جائے تو یہ حکمت کے خلاف نہیں بلکہ اس کا عین تقاضا ہے۔ کوئی شخص بھی محض اس وجہ سے اپنے مکان کا

قابل رہائش حصہ بنیادوں کی تعمیر کے بغیر نہ بنائے گا کہ اسے چونکہ فوری طور پر سائے کی ضرورت ہے اس لیے اگر وہ بنیادوں پر وقت صرف کرے گا تو اس دوران میں اسے عمارت کے استعمال سے محرومی کی زحمت گوارا کرنا ہوگی۔ اور اگر کوئی عمارت بنانی ہے تو بنیادیں لازماً تعمیر کرنا ہوں گی اور جو وقت بنیادوں کی تعمیر میں صرف کیا جائے گا اس کے دوران اسے زحمت بھی برداشت کرنا ہوگی اور اس غیر محسوس کام پر جو ہر سطح بین شخص کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل بھی رہے گا اپنی صلاحیتوں اور وسائل کا ایک اہم حصہ صرف بھی کرنا ہوگا۔

اس مسئلے کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا کی ساری تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سیاست ہمیشہ فکر کے تابع رہی ہے۔ جو لوگ فکر کے دائرے میں کام کرتے ہیں فی الحقیقت سیاست اور اجتماعی فکر انہی کی مساعی سے رنگ پکڑتے ہیں۔ آج تک تمام سیاسی و اجتماعی تغیرات فکری انقلابات ہی کے مرہون منت رہے ہیں۔ اگرچہ یہودی مفکر کارل مارکس نے جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کا جو نظریہ پیش کیا ہے اس کی رو سے فکری تغیرات اقتصادی حالات اور پیداواری طریقوں میں ردوبدل کے تابع قرار دیئے گئے ہیں اور دور حاضر میں قریب قریب نصف دنیا اس طرز فکر پر ایمان رکھتی ہے۔ لیکن یہاں کسی فلسفیانہ بحث میں پڑے بغیر ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ مارکس کے متبعین بھی اس انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہتے کہ اقتصادی تغیرات خود بخود فکری انقلاب لے آئیں گے بلکہ مختلف قومی اور بین الاقوامی اشتراکی تنظیمیں گزشتہ ایک صدی سے اپنے تصورات کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں اور اگرچہ بہت سے ممالک میں اقتصادی و سیاسی حالات نے بھی ان کے لیے راستہ ہموار کیا ہے لیکن فکری کام سے وہ کبھی بے نیاز نہیں ہو سکے۔ اسی طرح جمہوری ممالک میں بھی یہ منظر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ پہلے کسی جماعت نے انتخاب جیتے ہوں اور اس کے بعد اس نے اجتماعی زندگی میں تغیرات پیدا کرنے کے لیے فکر میں انقلاب برپا کیا ہو۔ اس لحاظ سے ان لوگوں کو جو اس ملک میں ٹھوس بنیادوں پر تعمیر کا کوئی کام کرنا چاہتے ہیں یہ اطمینان رکھنا چاہئے کہ اگر قوم میں کوئی فکری تغیر رونما ہوا تو اس تغیر میں اس قدر قوت ہوگی کہ قوم کے معاملات کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں سے لازماً چھن جائے گی جو قومی تعمیر و ترقی کے کام کو انجام دینے کی اہلیت نہیں رکھتے اور وہ لوگ برسر اقتدار آجائیں گے جو نئے فکر کے تقاضوں کو پورا کر سکیں یہ اور بات ہے کہ اس اقتدار سے اس وقت انقلاب فکر کا کام کرنے والے محروم رہیں اور ان کے نظریات کو عمل کا جامہ پہنانے کا کام ان کی آئندہ نسلیں کریں۔

دو متبادل راستے

گویا ان لوگوں کے لیے جو اس ملک میں قومی تعمیر کا کوئی ٹھوس کام انجام دینے کا دعویٰ کرتے ہیں دو ہی راستے ممکن ہیں اور ان میں سے ایک کو ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

کام کی پہلی شکل یہ ہے کہ آپ سیاسیات میں منہمک رہیں اور انتخابات میں اپنی تمام تر قوتیں کھپا کر بر سر اقتدار آنے کی کوشش کریں۔ لیکن اول تو آپ کو اپنے اعلان کردہ اصولوں سے جزوی سی وابستگی کی صورت میں بھی انتخابی جدوجہد میں مکمل ہزیمت اٹھانا پڑے گی۔ کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، موجودہ فکر اور معاشرتی حالات کے تحت بر سر اقتدار قیادت کو معزول کرنا ممکن نہیں اور اگر بفرض محال آپ ہیر پھیر کے راستوں یا چند نعروں کے بل پر بر سر اقتدار آ بھی جائیں تو اس سے تعمیر و ترقی کے کسی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس طریق کار سے کبھی بھی اپنی اعلان کردہ منزل پر نہ پہنچ سکیں گے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے لیے تو نااہل عناصر کے اقتدار کو بادل ناخواستہ برداشت کیا جائے، لیکن اپنے اوقات اور صلاحیتوں کا بیشتر حصہ انقلاب فکر کی کوششوں کی نذر کر دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں قدرت کے اٹل قانون کے تحت ایک ایسا موقعہ خود بخود آ جائے گا——چاہے یہ ایک طویل عرصے کے بعد ہی آئے——جبکہ قوم کے نظریات موجودہ نظام اور اسے چلانے والی قیادت کا ساتھ نہ دے سکیں گے اور انقلاب ناگزیر ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ شخص اور جماعت جو کسی اصول اور نظریہ زندگی پر مخلصانہ ایمان رکھتی ہو دوسرا راستہ ہی اختیار کرے گی۔ کسی نظریے اور اصول حیات کے لیے کام کرتے ہوئے آج تک ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جا سکی اور کوئی اصولی جماعت بھی، بشرطیکہ اس نے اپنے اعلان کردہ اصولوں کو خلوص کے ساتھ اپنایا ہو، نتائج کے ظہور کے معاملے میں اس قدر بے چین نہیں ہو سکتی کہ اپنے اصل طریق کار ہی کو جو اس کے اصولوں اور مقاصد سے مناسبت رکھتا ہو خیر باد کہہ دے۔ اجتماعی تغیرات ہمیشہ تدریج کے ساتھ رونما ہوتے ہیں اور ان تغیرات کو کسی ضابطے کا پابند بنانا حد درجہ پتہ مادی کا کام ہوتا ہے۔

کام انجام کیسے پائے

در حقیقت اس سوال کا جواب سابقہ صفحات کی گزارشات میں پھیلا ہوا ہے جہاں ہم نے مختلف النوع تحریکوں کی تاسیس وارتقاء کا تجزیہ کر کے یہ بتایا ہے کہ تعمیر وترقی کے کام کی شرائط کیا ہیں۔ نیز اس تجزیے کے نتائج کی روشنی میں ہم پاکستان کے حالات کے بعض اہم پہلوؤں پر گفتگو کر کے قومی تعمیر کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ اگر اس ملک میں تعمیر وترقی کا کام ہونا ہے تو لامحالہ ہمیں بھی اسی نوعیت کا کام کرنا ہوگا جو مختلف قوموں کو آج تک اپنی نشو وارتقاء کے لیے کرنا پڑا ہے۔ معجزے کی توقع عبث ہے اور چھوٹے راستے (Short Cuts) بھی عام طور پر مایوسی پر ہی منتج ہوا کرتے ہیں۔

تاریخ اقوام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم میں ترقی وارتقاء کی حقیقی خواہش کی یہ لازمی علامت ہوتی ہے کہ اس کے پڑھے لکھے طبقے میں سے ایسے لوگ ظاہر ہوں جو ہر شعبے میں تعمیری کام کریں۔ یہ ایک ایسا عمل ہوتا ہے جو از خود (Spontaneously) ظاہر ہوتا ہے۔ اور کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ قوم کا اجتماعی ضمیر افراد کو کام پر اکساتا اور مجبور کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے افراد کو خارجی دباؤ سے مجبور نہیں کیا جاتا۔ بعض اوقات تو یہ صورت ہوتی ہے کہ کوئی ایک یا چند نہایت ہی غیر معمولی شخصیتیں اپنے افکار کی قوت سے قوم کو اس قدر متاثر کر دیتی ہیں کہ اس میں تحقیق ومطالعہ اور تسخیر عناصر اور عملی کاوش کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس طرح ساری قوم میں تغیر وترقی کے کام کے لیے سازگار فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جبکہ یہ کام ایک تنظیم کی زیر سرکردگی کیا گیا۔ لیکن ایسی مثالیں بہت ہی کم ہیں اور زیادہ تر دور حاضر ہی میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کام اسی تنظیم کے دائرے کے اندر محدود رہے بلکہ وہ تنظیم قوم کے تمام طبقات کو اس طرح متاثر کر دیتی ہے کہ مختلف افراد اور ادارے اپنے طور پر علم وعمل کے شعبوں میں تعمیری کام کا آغاز کر دیتے ہیں۔ جوں جوں قوم کا فکر اور اس کے رجحانات متاثر ہوتے جاتے ہیں اسی نسبت سے اخلاقی وسیاسی قدریں بھی تغیر پذیر ہوتی جاتی ہیں۔ اور جس طرح خزاں رسیدہ درختوں اور پودوں کی کونپلیں بہار کی آمد کی خبر دے دیتی ہیں اسی طرح زندگی کے تمام شعبوں میں ایسے تغیرات رونما ہونا شروع ہو جاتے ہیں جو کسی بڑے انقلاب کا مژدہ جانفزا سنا دیتے ہیں۔ اس وقت کسی کو یہ باور کرانے کے لیے

کہ یہاں ایک غیر معمولی تبدیلی آنے والی ہے منطق واستدلال کی قوتیں صرف نہیں کرناپڑتیں۔ نہ نعروں کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ مطالبات اور عوامی دباؤ کے مصنوعی طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ عوام اور قیادت میں کامل یک رنگی پائی جاتی ہے اور جزوی اختلافات کے باوجود، جو انسانی فطرت کا خاصہ ہیں، قوم کا اجتماعی ضمیر تعمیر کی بنیادوں پر مطمئن ہو جاتاہے۔

جب کسی قوم کے اندر فکر و خیال کے میدان میں جدت پسندی اور تعمیر و ترقی کے کام میں انہاک و مستعدی کے آثار رونماہوتے ہیں تواس کا نتیجہ لازماً یہ نہیں ہوتا کہ ہر شخص فکر و عمل کے دائروں میں اونچی سطح کا کام کر رہاہوتاہے۔ نہیں، بلکہ صورت یہ ہوتی ہے کہ مختلف افراد اور جماعتیں اپنی اپنی صوابدید کے مطابق مختلف حلقوں میں مختلف طرز پر کام کرتی رہتی ہیں۔ بعض لوگ دوررس نتائج کے نقطہ نظر سے ٹھوس کام کرتے ہیں اور بعض دوسرے عناصر وقتی اور ہنگامی کاموں مثلاً حصول اقتدار کی جدوجہد میں منہمک رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ ساری قوم اور اجتماعی زندگی کے معاملات سے دلچسپی رکھنے والے تمام عناصر محض سیاسی قسم کی سرگرمیوں کو ہی اپنی تمام تر توجہات کا مرکز نہیں بناتے بلکہ اس کے برعکس تعلیم یافتہ طبقے کاایک اچھاخاصاحصہ فکر کے دائرے میں تعمیری کام کرتاہے اور ایسے افراد کی بھی کمی نہیں ہوتی جو دوررس نتائج کے نقطہ نظر سے کام کرتے ہیں اس لیے قوم کے اعصاب پر ہر وقت ہنگامہ آرائی کے جذبات ہی نہیں چھائے رہتے بلکہ اس کے ذہن کو ٹھوس کام کرنے والے عناصر کی سرگرمیاں بھی متاثر کرتی رہتی ہیں۔ یہ اثرات چونکہ زیادہ ٹھوس اور پائیدار ہوتے ہیں، لہٰذاایک تدریج کے ساتھ اصلاح و تعمیر کے رجحانات کو زیادہ سے زیادہ تقویت حاصل ہوتی جاتی ہے اور بالاخر رجحانات ہنگامی دلچسپیوں پراس قدر غالب آجاتے ہیں کہ تخریب پسند اور ناکارہ عناصر خود بخود قیادت کے منصب سے محروم ہوناشروع ہو جاتے ہیں۔ قوم کا ہر طبقہ اپنی ذہنی سطح کے مطابق صحت مند فکر قبول کرتاجاتاہے اور بنیادی اجتماعی مقاصد کے لحاظ سے فکر و عمل کی وہ یکجہتی پیداہو جاتی ہے جو کسی قوم کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان میں ایسے عناصر کا فقدان ہے جو دوررس نتائج کے نقطہ نظر سے کام کرنے پر ہی اپنی صلاحیتوں کو کھپانے کے لیے تیار ہوں۔ یہاں جو شخصیت عوام میں کچھ تعارف پیدا کر لیتی ہے اور جو جماعت تھوڑی بہت مقبولیت حاصل کر لیتی ہے، اس کے ذہن پر یہ خیال مسلط ہو جاتاہے کہ اسے اب اقتدار حاصل کرکے قوم کی فلاح کی صورت پیدا کرنی چاہئے۔ یہاں لیڈری اور حصول اقتدار کی خواہش کا بھوت

اعصاب پر اس طرح سوار ہو چکا ہے کہ ہنگامی قسم کی سر گرمیوں کو ہی قوم و ملک اور دین واسلام کی خدمت کا بہترین مظہر تصور کیا جارہا ہے۔ حالانکہ قوموں کی تعمیر کا انحصار سیاست سے کہیں زیادہ فکری کاوشوں اور اخلاقی تربیت پر ہوتا ہے۔

تعمیر و ترقی کے کام کا جو تصور ہم نے پیش کیا ہے اس کے انجام دینے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ قوم کی فکری وذہنی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کرے۔ اور جو لوگ اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں، وہ ہنگامہ آرائی کے بجائے ٹھوس قسم کے تعمیری کاموں کی طرف توجہ دیں۔ اگر اس قسم کا کام کرنے والے لوگ فراہم نہ ہوں گے تو قومی اصلاح و تعمیر کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ فی الحقیقت ترقی پذیر اور روبہ تنزل قوموں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر اقوام میں تعمیری کام کرنے والے افراد مہیا ہو جاتے ہیں اور آخر الذکر میں ایسے عناصر دستیاب نہیں ہو سکتے۔

ہمارے ہاں کی سیاسی زندگی پر جو فضا چھائی ہوئی ہے اس کے متعلق ہم گزشتہ صفحات میں اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ عملی دائرے میں ہم معمولی سے معمولی پیمانے پر بھی کوئی کام انجام نہیں دے رہے۔ ہم یہاں یہ رائے نہیں دینا چاہتے کہ یہ کام فلاں فلاں نظریات کے مطابق کیا جائے۔ ہماری شکایت صرف یہ ہے کہ نظریات کی نوعیت سے قطع نظر ہمارے ہاں فکری کام سرے سے ہو ہی نہیں رہا۔ گزشتہ دس سال کے عرصے میں کسی ایک شعبہ علم میں بھی ہم کوئی تحقیقی کام نہیں کر سکے اور نہ اس وقت تک ہمارے اندر مستقبل قریب میں اس نوعیت کا کام کرنے کے میلانات ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کسی قوم کی فکری تعمیر کا کام آج تک سیاست دانوں نے نہیں کیا۔ سیاست دانوں نے روبہ ترقی اقوام کے اندر کسی مقصد کے حصول کے لیے قربانی کا جذبہ پیدا کرنے اور کسی خاص نظریے کی تنفیذ کے لیے قوم کو عمل پر آمادہ کرنے کی قسم کے کام تو کئے ہیں، لیکن قومی مقاصد کے تعین اور قومی امنگوں کے خطوط کو اجاگر کرنے کا کام ہمیشہ اہل طبقات ہی نے انجام دیا ہے۔ گزشتہ چند صدیوں میں یورپ کے ممالک نے بدلتے ہوئے حالات اور اجتماعی زندگی کے نت نئے تقاضوں سے عہدہ برآمد ہونے کے لیے اپنے فکر و عمل کے مختلف گوشوں میں متعدد بار تبدیلیاں کی ہیں اور اس خطے کے مختلف ممالک کو کئی قسم کے انقلابات سے دوچار ہونا پڑا ہے لیکن اس سلسلے کا فکری و عملی کام جسے ہر تبدیلی اور تغیر کی اصلی علت کی حیثیت حاصل رہی ہے کبھی بھی سیاست دانوں کے ہاتھوں انجام نہیں پایا۔ سیاسی زاویہ ہائے نگاہ اور اجتماعی انداز ہائے کار ہمیشہ علمی تحقیقات

کے نتائج کے تابع رہے ہیں اور اول الذکر کام ہمیشہ غیر سیاسی لوگوں ہی نے انجام دیا ہے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں علمی حلقوں پر مکمل مردنی چھائی ہوئی ہے۔ مغرب نے کائنات کے مادہ پرستانہ تصور کو تو اپنایا تھا لیکن اس تصور سے افراد کے سینوں میں جذبہ قربانی اور بے لوث قومی خدمت کی امنگ کو سرد نہ پڑنے دیا گیا بلکہ اس آگ کو اور بھڑکا دیا گیا لیکن ہمارے ہاں مغرب کی نقالی نے کچھ اس قسم کے مادہ پرستانہ رجحانات پیدا کر دئیے ہیں جن سے اعلیٰ جذبات تو ختم ہو رہے ہیں البتہ انفرادی و راجتماعی سطح پر ایسے غلط اور بے کار تصورات پیدا ہو گئے ہیں جس سے ہم میں سے ہر شخص گھٹیا قسم کے مادی فوائد کو اپنی زندگی کا اصل مطمح نظر سمجھنے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں سیاست میں حصہ لینے والے عناصر حصول اقتدار کی جدوجہد کو خدمت قوم کا مظہر قرار دیتے ہیں وہیں علمی شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی اپنی فکری کاوشوں کو اس کام تک محدود رکھتے ہیں جس کی منڈی میں مانگ ہو اور جس سے کچھ مالی فوائد حاصل ہو سکیں۔ گویا ہر شعبے میں تجارتی ذہن چھایا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے رجحانات کے ساتھ اجتماعی فلاح و بہبود کا کام انجام نہیں پا سکتا۔ یہ کام تو قوم کے بہترین فرزندوں کے خون پسینے کا تقاضا کرتا ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان میں تعمیر و ترقی کے کام کی ابتداء اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لیے ایسے افراد اور کارکن ظاہر ہونا شروع ہوں جو خالصتاً خدمت اور اصول پرستی کے جذبے کے تحت اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو صرف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جس نسبت سے ایسے افراد ظاہر ہوں گے اسی نسبت سے قوم میں تعمیر و ترقی کی صلاحیت پیدا ہو گی اور اگر ایسے افراد نہ ابھریں تو گویا قوم میں ترقی کرنے اور نشوونما پانے کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہے چاہے جذباتی تقاریر اور بیانات کے ذریعے ہمارے لیڈر حضرات کتنے ہی دعوے کرتے رہیں اور قوم کی طرف کتنی ہی خیالی خوبیاں منسوب کرتے رہیں۔

قومی تعمیر و ترقی کے کام کے سلسلے میں یہ نقطہ نظر معلوم کر کے بہت سے لوگوں کے چہروں پر مایوسی اور بے ہمتی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں، اور ان کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ اس طرح تو عمریں گزر جائیں گی تب جا کر کہیں ہماری آئندہ نسلوں کو نتائج دیکھنا نصیب ہوں گے۔ سیاست دان حضرات عوام کو یہ باور کرانا شروع کرتے ہیں کہ فلاں فلاں اہم مسئلہ تو اس وقت در پیش ہے اور اس ملک اور قوم کی قسمت اور اس کے مستقبل کا فیصلہ تو اب ہو رہا ہے۔ اگر ہم انقلاب فکر کی مہم میں لگے رہے تو اس مسئلے کا فیصلہ ہمارے مفاد کے خلاف ہو جائے گا اور ہمارے لیے کئی گنا زیادہ مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اجتماعی معاملات میں ہمیں ایسے

لوگوں کے انداز فکر پر حیرانی محسوس ہوتی ہے جو اپنے انفرادی معاملات میں تو ایک فرد کی زندگی کی میعاد کے مطابق ہی نہیں بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کے آرام و راحت اور ضروریات کے نقطہ نظر سے بھی بہت ہی لمبے عرصے کے لیے سوچتے ہیں اور اس کے لیے اکثر اوقات فوری فوائد کو نظر انداز کر دیتے ہیں، لیکن اجتماعی معاملات اور تعمیر معاشرہ کے سلسلے میں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہ بات آپ کے مشاہدے میں ہر روز آتی ہے کہ جب ایک فرد کوئی ملازمت اختیار کرنے لگتا ہے تو وہ یہ معمولی سا حساب پورے غور و فکر کے ساتھ لگاتا ہے کہ آج سے پچّیس تیس سال بعد اس کی تنخواہ کا گریڈ کہاں تک پہنچے گا، یہ تنخواہ اسے اس وقت کی ضروریات کے مطابق کس حد تک کفایت کر سکے گی اور اسے کس قدر پنشن مل سکے گی۔ اور پھر کوئی تجارت شروع کرتے وقت پورے سکون اور تحمل کے ساتھ سوچے گا کہ ایک طویل عرصے پر پھیلی ہوئی محنت و مشقت کے ساتھ اس کام کے نشو و نما پانے کے یہ یہ امکانات ہیں۔ اس کے علاوہ ہم انفرادی زندگیوں میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ساری ساری عمر کی کمائی سے رہائش کے لیے ایک عمارت بنائی جاتی ہے اور افراد خاندان اس کے لے بڑی بڑی مشکلات برداشت کرتے اور اپنی بہت سی فوری ضروریات سے دستکش ہو جاتے ہیں لیکن قومی معاملات میں ان لوگوں کا دل کسی لمبی عرصے کے پروگرام پر مطمئن ہونے کے لے تیار نہیں ہوتا۔

اس وقت دنیا میں ایک قوم بھی ایسی موجود نہ ہوگی جس کے رہنما اور شہری ترقی وارتقاء کی خواہش و آرزو کا اظہار نہ کرتے ہوں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود قوموں کی اکثریت تنزل وانحطاط کی پستی میں گری ہوئی ہے، اور بعض دوسری اقوام ترقی کے نصف النہار پر پہنچ چکی ہیں اور اس وقت بقیہ دنیا کی قیادت و سیادت کے مقام پر فائز ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اول الذکر اقوام خواہش کا اظہار کرتی ہیں اور ثانی الذکر اس کے ساتھ عمل بھی کرتی ہیں۔

ہم یہاں کسی خاص نظریہ زندگی کی ترجمانی کئے بغیر اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ سر دست یہاں ایک بات کی اشد ضرورت ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ اس ملک کی اجتماعی زندگی کے سلسلے میں جس حیثیت سے بھی کوئی کام کر رہے ہیں وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں ان اصولوں کو کسی نہ کسی حد تک ملحوظ رکھیں جن سے وابستگی کا وہ زبان سے دعویٰ کرتے ہیں یا جو اس دائرے میں کام کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر کوئی جماعت موجودہ طرز زندگی میں انقلاب برپا کر کے کسی خاص ضابطہ حیات کے نفاذ کو اپنا نصب العین قرار دیتی ہے تو اسے اس ضابطے کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر وہی طریق کار اختیار کرنا چاہیئے جو ان اصولوں کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔ اگر

کوئی جماعت پارلیمانی طرز سیاست کی قائل ہے اور اس کے خیال میں اصلاح کی یہی ایک صورت ہے کہ انتخابات کے ذریعے اقتدار حاصل کر کے کام کیا جائے تو اسے چاہئے کہ وہ پارلیمانی سیاسیات کے معروف اصولوں اور انداز کار سے انحراف نہ کرے۔ جو لوگ یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں کام کرتے ہیں انہیں چاہئے کہ مادی فوائد کو ہی اپنی تمام سرگرمیوں کا اصل مدعا قرار نہ دیں بلکہ اپنے اوقات کا کچھ نہ کچھ حصہ قوم کی فکری اصلاح کے لیے بھی وقف کریں۔ جو ادارے سماجی دائرے میں کام کر رہے ہیں وہ بھی دیانت وامانت کی ان قدروں کو لازماً مد نظر رکھیں جن کے بغیر ایسے کام خوش اسلوبی سے انجام نہیں دیئے جا سکتے۔ اسی طرح حکومت کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں میں بھی کچھ ایسے لوگ سامنے آنے چاہئیں جو اخلاقی قدروں کو نہ صرف خود ملحوظ رکھیں بلکہ اپنے اپنے حلقے کے اندر ان کے حق میں ایک ایسی فضا اور رائے پیدا کرنے کی کوشش کریں جس کے تحت بددیانتی اس طرح کھلم کھلا ممکن نہ رہے جس طرح اس وقت اس کا صدور ہو رہا ہے۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں اصولوں سے وابستگی کا کچھ نہ کچھ اظہار ہونا چاہئے۔ اور آغاز کار کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ جو لوگ اجتماعی فلاح کی خاطر کوئی نہ کوئی کام کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ اپنے اپنے حلقے میں ان اصولوں کی خود پابندی کریں جو ان کے کام کے انجام پانے کی لازمی شرائط کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمارے قومی کردار کے موجودہ معیار کے پیش نظر یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی کہ ایسے لوگ ایک بڑی تعداد میں دستیاب ہو سکیں گے لیکن ہر شعبہ زندگی میں چند افراد بھی اپنے اپنے طور پر اس کام کی ابتدا کر دیں تو خلوص اور بلند کرداری میں اس قدر قوت ہوتی ہے کہ اس سے نمایاں نتائج نکل سکیں۔ مثلاً اگر سیاسی میدان میں کام کرنے والوں میں سے فی الحال ایسے افراد نہ بھی دستیاب ہو سکیں تو علمی مذاق رکھنے والے افراد ہی قومی تعمیر کے نقطہ نظر سے کچھ تحقیقی کام شروع کر دیں اور پڑھے لکھے طبقے (Intelligentsia) میں اجتماعی مسائل پر سوچنے کی عادت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ مثال کے طور پر اقتصادیات کا شعبہ ہے۔ ہم موجودہ زندگی میں اقتصادیات کی اہمیت پر گزشتہ صفحات میں اظہار رائے کر چکے ہیں۔ ہمارے ہاں بعض اوقات معاشی پالیسیوں کے سلسلے میں ایسے ایسے خیالات پیش کئے جاتے ہیں اور حکومت کے ذمہ داروں کی طرف سے ان پالیسیوں کی تائید میں ایسے ایسے نظریات سامنے لائے جاتے ہیں جو اٹھارویں صدی میں تو کسی نہ کسی حد تک درجہ قبولیت حاصل کر سکتے تھے لیکن آج کے دور میں ان کے مضحکہ خیز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

عوام اور پڑھے لکھے لوگوں کو قومی معیشت کی ترقی کے سلسلے میں کچھ ایسے ایسے چکمے دیئے جاتے ہیں جو واقعتاً حیران کن ہیں۔ اب اگر علم اقتصادیات سے مس رکھنے والے حضرات ملکی سیاسیات میں الجھے بغیر مروجہ اقتصادی نظریات سے متعلق معلومات فراہم کریں اور اگر جدت فکر کا ثبوت نہ بھی دیں تو کم از کم ہمارے حالات کے ضمن میں جدید ترین فکر ہی کی تشریح وتوضیح کر دیں تو بدراہ سیاست دانوں کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ مضحکہ خیز قسم کے اقتصادی تصورات سے قوم کو مطمئن کر سکیں۔ اسی طرح دوسرے شعبوں میں کام کی ابتدا کی جاسکتی ہے اور یہ توقع ہو سکتی ہے کہ بتدریج قوم کے اندر اس طرح تعمیر فکر ہو جائے کہ ناکارہ عناصر کے لیے دن بدن زیادہ مشکلات پیدا ہوتی چلی جائیں اور معقول لوگوں کو بھی مختلف شعبوں میں راہ پانے کا موقع مل سکے۔

اس سلسلے میں کسی نظم کے تحت کام کرنے کے طریق کار کی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں ہوتا۔ مختلف اقوام نے مختلف طریقوں سے ترقی کی ہے۔ ہمارا مدعا صرف وہ بنیادی اصول بیان کرنا تھا جو تعمیر و ترقی کے ہر کام میں کار فرما نظر آتے ہیں۔ عمل کی شکلوں کو حالات اور وہ نظریات جو تعمیر کے سلسلے میں پیش نظر ہوں، متعین کیا کرتے ہیں۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ مغربی تہذیب وارتقاء کا عمل گزشتہ چار پانچ صدیوں پر پھیلا ہوا ہے اس کی ابتداء پندرھویں اور سولہویں صدی میں تحاریک اصلاح (Reformation) اور نشاۃ ثانیہ (Renaissance) سے ہوئی۔ ان دونوں تحریکوں نے قائم شدہ فکر کی جڑوں کو ہلانے کا کام کیا۔ اور اس کے بعد علوم طبعی میں مختلف انکشافات اور علوم فلسفہ میں تحقیق و مطالعہ کے ذریعے زندگی کا وہ مادہ پرستانہ نقطہ نظر ظاہر ہوا جس نے مخصوص خطوط پر اقتصادی حالات کے ارتقاء کے ساتھ مل کر وہ معاشرہ پیدا کیا جسے آج ہم مغربی تہذیب کے نام سے پکارتے ہیں۔ مغرب میں یہ کام تدریج وارتقاء کے ایک خاص عمل کے تحت ہوا اور کسی خاص تنظیم کی سعی وجہد کو اس کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ زندگی کا مادہ پرستا تصور تحقیق و مطالعہ کے زیر اثر آپ سے آپ (Spontaneously) وجود میں آیا۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ فکری اور عملی سطح پر اس دور میں مغربی اقوام نے بے پناہ قوت و توانائی کا ثبوت فراہم کیا ہے اور علم و عمل کے میدان میں انہوں نے وہ کام انجام دیا ہے جس کی نظیر تاریخ انسانی میں کم ہی ملتی ہے۔ ان کی مادی ترقی اور نشوونما محض موہوم آرزوؤں اور تمناؤں کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ اس کے لیے نہایت ہی وسیع پیمانے پر کام کیا گیا ہے۔

لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ قومی تعمیر و ترقی کے کام کے لیے ہر حال میں صدیوں کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ تعمیر و ترقی کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں ایک قوم یکسوئی کے ساتھ محنت کر کے تھوڑے ہی عرصے میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی اور عزت کا مقام حاصل کر سکتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے روس چالیس سال کی مدت میں ایک خاص نظام زندگی کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ترقی کے اتنے مدارج طے کر گیا ہے کہ آج وہ دنیا کی دو عظیم ترین طاقتوں میں شمار ہوتا ہے۔ باقی رہ گیا ایک ایسی شاندار تہذیب کو جنم دینا جو بقیہ دنیا کو بھی متاثر کر سکے تو اس کے لیے بلاشبہ زیادہ مدت چاہئے۔ ہم نے مغرب کی جو مثال دی ہے اس کا تعلق ایک پوری کی پوری تہذیب کو عالم وجود میں لانے سے ہے اور اس کے لیے واقعتاً ایک طویل عرصے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مغرب میں گزشتہ چند صدیوں کے اندر ایک طرف تو کائناتی تصورات، انسان کی تخلیق اور انجام کے متعلق نظریات اور اخلاقی قدروں اور حق و انصاف کے معیارات بدل گئے اور دوسری طرف زندگی کے ڈھنگ اور تمدن و معاشرت کے نقشے میں عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ اس تہذیب نے اس قدر ترقی کی ہے کہ اس وقت ساری دنیا اس کی لپیٹ میں ہے۔ سچ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کا سیل بے پناہ ایسی ایسی تہذیبی قدروں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا ہے جو صدیوں سے قائم تھیں اور بڑے بڑے سیاسی انقلابات بھی ان کو متاثر نہ کر سکے تھے۔ یہاں ہم اس صورت حال کی اصلی علت کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی ایک ہمہ گیر تہذیب کو جنم دینا انسانی تاریخ کے نہایت ہی نادر واقعات میں سے ہے اور اس پیمانے پر کسی کام کا بیڑا اٹھانا عظیم ہمت کا تقاضا کرتا ہے اور نتائج کے متعلق اس کے بعد بھی پیشگی طور پر کوئی رائے دینا ممکن نہیں ہوتا۔ ہم سر دست اپنے معاشرے سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ مستقبل قریب میں کسی ایسی جوابی تہذیب کو جنم دے گا جو مغربی تہذیب پر غالب آ جائے گی اور اس کے اثرات کو یکسر زائل کر دے گی۔ کوئی قوم اس قسم کا کارنامہ اسی وقت انجام دے سکتی ہے جبکہ اس کے اندر ہمہ جہتی نشو و نما پانے اور ترقی کرنے کی بے پناہ اور غیر معمولی قوت پیدا ہو جائے اور وہ زندگی کے تمام شعبوں میں دنیا کی امامت کرنے کی استعداد پیدا کر لے۔ قعر مذلت میں گری ہوئی ایک قوم کے کرنے کے سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس پستی کے گڑھے سے نکلے اور کم از کم باعزت و باوقار قوموں میں شمار ہو سکے۔ غیر معمولی تہذیبی ارتقاء اور دنیا کی سیاسی و علمی امامت کا مقام حاصل کرنے کے لیے اسی وقت سوچا جا سکتا ہے جبکہ انفرادی و اجتماعی سطح پر قومی صلاحیتیں اس قدر بیدار ہو جائیں اور قوم اس طرح ہمہ جہتی

ترقی کرنے لگے کہ دوسری اقوام کی تخلیقی سرگرمیاں اس کے مقابلے میں ماند پڑ جائیں۔اور پھر اس بات کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ جن قوموں نے کسی نہ کسی دور میں غیر معمولی ترقی کی ہے اور ان کی تہذیب و تمدن تاریخ کے صفحات پر اپنا مستقل نقش چھوڑ گئے ہیں انہوں نے یہ کارنامہ کسی متعین منصوبے کے تحت انجام نہیں دیا جسے سفر تعمیر کے آغاز ہی سے اس کی تمام تفاصیل کے ساتھ مرتب کر لیا گیا ہو۔ بلکہ تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانے اور محنت و مشقت کرنے سے ان اقوام میں ابھرنے اور پھلنے پھولنے کا اس قدر جذبہ پیدا ہو گیا اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں اس قدر بیدار ہو گئیں کہ ان اقوام سے وہ کارہائے نمایاں انجام پائے جن سے وہ اقوام عالمی تاریخ میں عزت و شرف کے بلند ترین مقام کی مستحق قرار پا گئیں۔ مثلاً مغربی تہذیب کے عروج و ارتقاء کے دور کا آغاز تو چار پانچ صدی پہلے ہوا لیکن سترھویں اور اٹھارھویں صدی کا کوئی بڑے سے بڑا فلسفی یا قوموں کا نبض شناس بھی مغربی تہذیب کی اس ترقی و استیلاء کے متعلق پیشگوئی نہ کر سکا جو اس تہذیب نے انیسویں اور بیسویں صدی میں حاصل کی ہے۔اس میں شک نہیں کہ اٹھارھویں صدی ہی میں مغربی علماء کا نقطہ نظر اپنے مستقبل کے متعلق بہت رجائیانہ ہو گیا تھا لیکن یہ رجائیت صرف اس بات تک محدود تھی کہ فلسفہ اور علوم طبعی نے ترقی کی جو نئی راہیں کھول دی تھیں اس سے مغربی مفکرین میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ایک طرف رجعت پسندانہ مذہبی تصورات اور کلیسائی نظام کی سربراہی ختم کر کے اور دوسری طرف عقلیت کا سکہ قائم کرنے کے بعد اس پر اسرار کائنات کے بہت سے رازہائے سربستہ معلوم ہونے سے وہ حقیقت کے اس قدر قریب پہنچ گئے ہیں کہ اب انسان کے لیے وہ سنہری دور آیا ہی چاہتا ہے جس کا خواب اس نے ہر دور اور ہر زمانے میں دیکھا ہے یورپ کے علماء اٹھارھویں صدی میں یقیناً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ علم طبعیات میں نیوٹن کی کاوشوں، فلسفہ کے میدان میں لاک کی نقطہ وریوں اور اقتصادیات کے دائرے میں ایڈم سمتھ کے منظّم و مربوط فکر نے انسان کے لیے ادراک حقیقت اور جنت ارضی کے قیام کے لیے راستہ ہموار کر دیا ہے۔ لیکن اس سارے رجائیانہ انداز فکر کے باوجود کوئی ایک شخص بھی آیندہ کے حالات کے متعلق یقینی طور پر کوئی پیشگوئی نہ کر سکتا تھا اور نہ کسی نے علم وسیاست کے میدان میں اس ترقی واستیلاء کے حصول کے لیے کوئی پروگرام وضع کیا جو یورپ کو انیسویں اور بیسویں صدی میں حاصل ہوا۔ فی الحقیقت یہ ترقی و استیلاء تو اس صلاحیت کا ثمرہ تھا جو صدیوں کی محنت سے یورپ کی اقوام نے اپنے اندر پیدا کی تھی۔

ہمارا نہ یہ مدعا ہے کہ ہمیں آج ہی سے ایک ایسی شاندار تہذیب بروئے کار لانے کے منصوبے اپنے سامنے رکھ لینے چاہئیں جو ساری دنیا پر چھا جائے اور نہ ہمیں ایک ایسے خیالی اور مثالی نظام (UTOPIA) کو اپنانے پر اصرار ہے جو انتہائی درجے کی محنت اور تخلیقی قوتوں کا تقاضا کرے اور جو قومی عروج و ترقی کی آخری منزل کی حیثیت رکھتا ہو۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں جو مثالیں دی ہیں ان سے ہمارا یہ مقصد بھی نہ تھا کہ جن جن تہذیبوں، تحریکوں یا سیاسی و اقتصادی نظاموں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے ان کی نقالی کی جائے اور ابھی سے اس نوعیت کے نتائج پیدا کرنے پر کمر ہمت باندھ لی جائے جو ان نظاموں کے قیام سے برآمد ہوئے۔ ہم نے جو مثالیں دی ہیں ان سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ دنیا میں اجتماعی سطح پر جو نتائج بھی نکلتے ہیں ان کا انحصار قوم کی شعوری حالت پر ہوتا ہے۔ جس قسم کے اصولوں اور نظریات کو کوئی قوم قبول کرے گی اس کے مطابق وہ اپنی زندگی کو ڈھال لے گی۔ اس کے لیے ہم نے شاندار تہذیبوں کا تذکرہ بھی کیا اور سیاسی اور اقتصادی نظاموں کی مثالیں بھی عرض کیں اور اس طرح ہم نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ جس معیار اور سطح کا کام کرنا چاہیں اور جس درجے و تغیر کا انقلاب بھی آپ کے پیش نظر ہو آپ کو اس کے لیے علمی و فکری کام لازماً کرنا ہوگا۔ جس قوم میں زندگی کے متعلق اس حیثیت سے کوئی نظریہ بھی نہ پایا جاتا ہو کہ وہ اس پر شعوری ایمان رکھتی ہو اور اس پر عمل پیرا ہونے پر بھی آمادہ ہو اس سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ تعمیر و ترقی کا کوئی با قاعدہ کام کر سکے گی۔ لہٰذا ہمارے لیے بھی اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہر وہ عنصر جو یہاں قومی تعمیر و اصلاح کے لیے کوشش کرنے کا کوئی دعویٰ رکھتا ہے اپنے نظریات پیش کرے اور ان نظریات کو محض نعروں کی شکل میں اپنانے کی بجائے قوم کے ذہن و قلب کی گہرائیوں میں اتارنے کی کوشش کرے۔ نیز اپنے سیاسی طرز عمل اور انداز کار کو بھی ان نظریات کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرے۔ اگرچہ اس سے اختلافات پیدا ہوں گے اور قوم کے سواد اعظم کو کسی ایک ضابطہ زندگی کے اصولوں پر جمانے کے لیے علم و فکر کے دائرے میں خاصی کش مکش ہو گی، لہٰذا جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکے ہیں ان اختلافات کی نوعیت اس انتشار سے بالکل مختلف ہو گی جو اس وقت ہم پر مسلط ہے۔ ٹھوس نظریات کی بنیاد پر رونما ہونے والا اختلاف کسی قوم کے لیے کبھی بھی باعث نقصان ثابت نہیں ہوتا۔

ضمیمے

ا۔ جماعتِ اسلامی سے استعفیٰ

سعید ملک

۲۔ ملک سعید احمد کے الزامات اور انکشافِ حقیقت
(جماعتِ اسلامی کی طرف سے استعفے کا جواب)

میاں طفیل محمد

۳۔ جماعتِ اسلامی میں قیادت کا مقام

سید ابوالاعلیٰ مودودی

جماعت اسلامی سے استعفیٰ

جناب سعید ملک نے ۵ جنوری ۱۹۵۷ء کو الفسٹن ہوٹل لاہور میں ایک پریس کانفرنس منعقد کر کے جماعت اسلامی کی رکنیت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔ان کے استعفے کا متن اور (اس وقت) جماعت اسلامی کے قیم میاں طفیل محمد کا تفصیلی جواب، جماعت اسلامی کے ترجمان ''ایشیا'' کی ۱۷ جنوری ۱۹۵۷ء کی اشاعت سے شکریے کے ساتھ نقل کیے جارہے ہیں۔ ''ایشیا'' نے ملک صاحب کے استعفے پر ''قلابازی اور اس کی توجیہ'' کی سرخی جمائی تھی۔

مکرمی امیر جماعت اسلامی پاکستان

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

جماعت اسلامی کے ساتھ اپنی چھ سالہ وابستگی کے دوران مجھے جو تجربات ہوئے ہیں اور مختلف ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے اندر سے حالات کا مطالعہ کرنے کا جو موقعہ ملا ہے اس کی بنا پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کی سرکردگی میں جماعت کے اندر ایک ایسا گروہ پیدا ہو چکا ہے جس نے نہ تو جماعت کو اس کے اصل طریق کار پر قائم رہنے دیا ہے اور نہ جماعت کو اس جمہوری اور شورائی طریقے پر چلایا جارہا ہے جس کی پابندی اسلام اور اپنے دستور کی رو سے ہم پر واجب ہے۔ میرے عدم اطمینان کی تفصیلی وجوہ آپ کو معلوم ہیں تاہم میں صرف دو بنیادی باتوں کی طرف اشارہ کروں گا۔

جماعتی لٹریچر میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ اسلامی تحریک کو چلانے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ مخاطب آبادی میں اسلام کے اصولوں کا شعور اور ان پر چلنے کا شدید داعیہ پیدا کر دیا جائے تاکہ ایک مرحلے پر پہنچ کر وہ آبادی فطری طور پر اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے اپنا لے۔ یہ بات کھول کھول کر کہہ دی گئی تھی

کہ یہ کام محض سیاسی ہنگاموں سے ہوگا اور نہ صرف انتخابات کے ذریعے حصول اقتدار کی کوششوں سے۔ لیکن ابھی قوم میں اسلامی اصولوں کا ابتدائی تصور بھی پیدا نہ ہوا تھا اور اس نے اسلامی اصول اخلاق و سیاست کو اختیار کرنے پر معمولی سی آمادگی کا اظہار بھی نہ کیا تھا کہ آپ نے بنیادی کام سے صرف نظر کر کے تحریک کو پوری طرح سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں الجھا دیا حتیٰ کہ اسلامی نظام کی حیثیت ہمارے ہاں محض ایک نعرے کی رہ گئی۔

جماعتی معاملات کی انجام دہی میں امیر از روئے دستور و روایات مرکزی شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہے لیکن آپ نے ہمیشہ مرکزی شوریٰ کے فیصلوں کی خلاف ورزی کی ہے اور احتجاج کے باوجود اپنی روش پر بضد رہے ہیں۔ جماعت کی تاریخ میں یوں تو اس کی بے شمار مثالیں ہیں لیکن ان میں سے چند ایک نمایاں یہ ہیں۔

کشمیر کے متعلق شوریٰ کا فیصلہ تھا کہ مجاہدین کی مدد کی جائے اور اس سلسلے میں جماعت نے عوام سے ان کی اعانت کے لیے ایک بڑی رقم جمع بھی کی لیکن آپ نے شوریٰ کے فیصلے کے خلاف ایک ایسی بات کہہ ڈالی جس سے جماعت ایک عظیم ابتلا میں گرفتار ہو گئی۔ نیز وہ رقم بھی مجاہدین تک نہ پہنچی اسی طرح جماعت کی اگرچہ یہ حتمی رائے تھی کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جائے لیکن اس کے باوجود شوریٰ کا یہی فیصلہ تھا کہ اس مسئلے کو دستوری مہم سے وابستہ کیا جائے۔ لیکن آپ نے بطور خود نویں نکتے کا اضافہ کر دیا اور شوریٰ سے مشورہ کیے بغیر ان جماعتوں سے اشتراک عمل شروع کر دیا جن کے متعلق شوریٰ اور آپ کی قطعی رائے تھی کہ وہ اس مسئلے کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ دستور جماعت کی خلاف ورزی اور شورائی اور جمہوری قدروں کو کچلنے اور فسطائی رجحانات پیدا کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ اگرچہ دستور جماعت کے مطابق اس جماعت میں ارکان اختیارات کا منبع ہیں اور دستور کی دفعہ ۸۱ کی رو سے ارکان کے کل پاکستان اجلاس میں ہر رکن کو اعتراض اور تنقید کی پوری آزادی ہے۔ لیکن آپ نے کراچی کے نومبر ء کے اجتماع میں تمام اعتراضات اور تجاویز کو پیش ہونے سے روک دیا حالانکہ اس کا نہ آپ کو اختیار تھا اور نہ مرکزی شوریٰ کو۔ اس قسم کی مثالیں صرف بدترین فسطائی جماعتوں کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان کے حکمرانوں پر تنقید کرتے ہوئے آپ قومی زندگی میں آزادی رائے اور تنقید و محاسبے کا جو حق اپنے پبلک بیانات اور تحریروں کے ذریعے مانگتے رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

فسطائی ہتھکنڈوں کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ جماعت کی قیادت میں بڑھتے ہوئے اختلافات اور جماعت میں عام بے چینی کے پیش نظر ایک سال قبل شوریٰ نے ایک جائزہ کمیٹی تشکیل دی تھی جماعتی سرکلر کے

ذریعے یہ اعلان کیا گیا کہ اس کمیٹی کی رپورٹ سامنے آنے کے بعد کل پاکستان اجتماع ارکان منعقد کیا جائے گا۔ لیکن جب یہ رپورٹ آگئی تو یہ اجتماع منسوخ کر دیا گیا۔ اس رپورٹ کے بارے میں ارکان جماعت سے غیر معمولی اخفا برتا جا رہا ہے۔ مرکزی شوریٰ نے پندرہ روز کی بحث کے بعد بالاتفاق اس رپورٹ کی بنیاد پر ایک قرار داد کے ذریعے جماعت کی پالیسی کو بدلتے ہوئے انتخابات کی مہم سے دست کش ہو کر انقلاب فکر اور تعمیر معاشرہ کے کاموں پر اپنی توجہات کو مرکوز کر دینے کا فیصلہ کیا ہے لیکن شوریٰ کے اجلاس کے بعد پچھلے ہی ہفتے آپ نے جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان کے نام جن میں تین اس جماعت کے کل پاکستان امیر بھی رہ چکے ہیں خطوط کے ذریعے ان کے سارے کام کو ایک سازش قرار دیتے ہوئے ان سے مرکزی شوریٰ سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کر ڈالا حالانکہ دستور میں اس کی کوئی گنجایش نہیں ہے اور نہ کسی جمہوری جماعت میں ایسی حرکت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان ارکان کی شوریٰ نے جو آپ کی اندھا دھند پیروی کرتے ہیں آپ کے گروہ کے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر جماعتی آداب و روایات کو پامال کرتے ہوئے شوریٰ کی اس متفقہ قرار داد کے خلاف ایک زبردست مہم شروع کر دی ہے اس کے علاوہ اس شوریٰ کے اجلاس میں ایک اونچی سطح کی کمیٹی بنا دی گئی تھی جس کو میرے اعتراضات کی تحقیق کرنا تھی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ بھی امیر جماعت کی حیثیت سے اس کمیٹی کے فیصلوں کے پابند ہوں گے لیکن ابھی اس تحقیقات کا آغاز ہی ہوا تھا کہ آپ نے ایک طرف اس کمیٹی کے صدر پر جائزہ کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے سازش کا الزام لگا دیا اور دوسری طرف کسی معقول وجہ اور مجھ سے کوئی جواب طلب کیے بغیر اچانک میرے حقوق رکنیت کو معطل کر دیا۔ ان اقدامات پر جماعت کے اونچے حلقوں میں اس وقت حیرانی اور غم و افسوس کی جو فضا چھائی ہوئی ہے وہ آپ جانتے ہیں۔

میری یہ قطعی رائے ہے کہ اب اس جماعت میں آپ نے اصلاح حال کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں۔ میں نے گزشتہ پانچ چھ سال میں ہر طریقے سے یہ کوشش کی ہے کہ آپ دستور جماعت کی پابندی کریں اس کے لیے شوریٰ میں بھی بارہا تنقید و محاسبہ کیا ہے۔ جماعت میں شورائی نظام کو اس کی صحیح روح کے ساتھ چلنے اور ہنگامہ آرائیوں سے بچتے ہوئے، جماعت کے اصل تعمیری اور فکری کام کی طرف توجہ دینے، جماعت کے اصل مسائل سے ارکان جماعت میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے شوریٰ سے لے کر اجتماع ارکان تک میں تجاویز پیش کیں لیکن آپ نے ہمیشہ ان سب کوششوں کو بے اثر بنانے کی سعی کی ہے۔ اب جب کہ آپ کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی ہیں، جائزہ کمیٹی نے آپ کی منشاء کے خلاف رپورٹ دے دی ہے، شوریٰ میں آپ کو

شکست ہو گئی اور ہنگامہ آرائیوں اور سر دست انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ ہو چکا ہے، نیز میرے تمام اعتراضات کے لیے شوریٰ نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنادی ہے جس کے ذریعے معاملات کے کھل کر سامنے آجانے کا امکان پیدا ہو گیا ہے، آپ نے جماعت کے اندر اپنے خاص اثرات کے ذریعے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے جس میں صحت مند طریق پر کام کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ میں چونکہ اس قسم کی فضا میں اپنی قوتیں اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، اس لیے میں جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہونے پر مجبور ہوں۔

میری اب بھی یہی رائے ہے کہ جماعت کے جمہور صحیح خطوط پر کام کرنا چاہتے ہیں۔ جائزہ کمیٹی کے سامنے دو سو سے زیادہ ارکان نے رائے دی ہے ان میں سے ۸۰ فیصدی سے زائد نے اپنی اپنی معلومات کی حد تک جماعت کی پالیسی اور اخلاقی حالت پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ تو ممکن ہے کہ اصل مسائل کو اخفا میں رکھ کر یا جذبات کو اپیل کر کے اور "اسلام خطرے میں" کا الارم بجا کر اب بھی آپ جماعت کے سادہ دل ارکان کو علاقائی اجتماعات میں خاموش کرادیں لیکن میں چیلنج کرتا ہوں کہ آپ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کو ارکان اور پبلک کے سامنے لائیں۔ ارکان کا کل پاکستان اجتماع بلا کر تمام مسائل ان کے سامنے رکھیں اور پھر دیکھیں کہ ارکان کے احساسات کیا ہیں۔

والسلام

سعید ملک

ملک سعید احمد کے الزامات اور انکشاف حقیقت

میاں طفیل محمد قیم جماعت اسلامی

کل ۵ جنوری ۱۹۵۷ء کو مسٹر سعید ملک نے ایک پریس کانفرنس میں جماعت کی رکنیت سے اپنا استعفا پیش کیا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ملک صاحب جنہوں نے جماعت کے مقررہ قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی نہ کرنے کا دوسروں کو الزام دیا ہے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جماعت کے ضابطے کے خلاف بھی اور دنیا بھر کے معروف طریقے کے خلاف بھی اپنا استعفا جماعت کو بھیجنے سے پہلے پریس کانفرنس میں پیش کیا۔ ان کا باقاعدہ استعفا آج ۶ جنوری تک مرکز میں موصول نہیں ہوا۔ جماعت کی پچھلی پندرہ سال کی تاریخ میں بہت سے اصحاب جماعت کی رکنیت سے مستعفی بھی ہوتے رہے ہیں اور خارج بھی کیے جاتے رہے ہیں، جن میں سے بعض مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے اور جماعت کے مختلف عہدوں پر بھی رہ چکے تھے، لیکن مسٹر سعید ملک سے پہلے کسی شخص نے بھی آج تک جماعت کے خلاف یا جماعت کے عہدیداروں کے خلاف پریس میں پراپیگنڈا کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے جماعت سے الگ ہونے کے باوجود جماعت کے ساتھ ہمدردی اور اتفاق کا تعلق برقرار رکھا۔ اور اس کی تو کوئی مثال نہیں ہے کہ کوئی شخص کھلم کھلا جماعت کی مخالفت پر اتر آئے۔

ملک سعید صاحب نے اپنے بیان میں مختلف سوالات کے جوابات دیتے ہوئے جو الزامات لگائے ہیں ان کی حقیقت ذیل میں نمبروار بیان کی جاتی ہے۔

سیاسی ہنگامہ آرائیاں

ا۔ وہ کہتے ہیں کہ ''جماعت کے لٹریچر میں اسلامی تحریک کو چلانے کا جو طریقہ بیان کیا گیا تھا جماعت اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کی خلاف ورزی کر کے تحریک کو پوری طرح سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں الجھا دیا''۔۔۔۔۔ملک صاحب جن چیزوں کو سیاسی ہنگامہ آرائیاں تعبیر کرتے ہیں ان کی ابتداء ۴۸ء کے آغاز میں ہوئی تھی جب کہ جماعت اسلامی نے اسلامی دستور کے لیے جدوجہد شروع کی۔ اس جدوجہد پر تقریباً دو سال گزر چکے تھے۔ جماعت ملک صاحب کے بقول اپنے لٹریچر میں پیش کردہ طریقے سے ہٹ کر سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں پوری طرح الجھ چکی تھی، حتیٰ کہ ستمبر ۴۹ء میں پنجاب کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ بھی کر چکی تھی، اس وقت ملک صاحب ۱۹۵۰ء کی ابتداء میں جماعت اسلامی میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد وہ جماعت اسلامی حلقہ راولپنڈی کے امیر بنائے گئے۔ پھر اسی سال وہ مجلسی شوریٰ کے رکن بنے۔ یہ سب کچھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر بندی سے رہائی (مئی ۱۹۵۰ء) سے پہلے ہو چکا تھا۔ پھر ملک صاحب نے خود انتخابات پنجاب میں جماعت کے ساتھ حصہ لیا اور وہ راولپنڈی شہر کے انتخابی حلقہ سے پنچائتی نمائندے کی حیثیت سے کھڑے ہوئے اس وقت سے ۵۵ء تک ملک صاحب برابر جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ میں شریک رہے ہیں اور وہ تمام سیاسی ہنگامہ آرائیاں جو اس دوران میں جماعت نے کی ہیں ان کی ذمہ داری میں سب کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ملک صاحب پر یہ کس وقت منکشف ہوا کہ جماعت اپنے لٹریچر میں پیش کردہ طریقے سے ہٹ کر سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں الجھ گئی ہے اور اگر یہ بات منکشف ہوئی تھی تو مارچ ۱۹۵۳ء سے اپریل ۵۵ء تک جب کہ مولانا مودودی صاحب جیل میں تھے اور ملک صاحب جماعت کے ذمہ دار ترین عہدوں پر تھے اور ان کے بقول جماعت کی اکثریت ان کی ہم خیال تھی تو انہوں نے جماعت کی اس روش کو بدلنے کی کیوں نہ کوشش فرمائی؟ یہ بات ایک لطیفے سے کم نہیں ہے کہ اب پریس کانفرنس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ملک صاحب کہتے ہیں کہ ان کو جماعت کی پالیسی سے اختلاف انتخابات پنجاب کے موقع پر ہوا تھا اگر یہ واقعی کوئی سنجیدہ اور ایماندارانہ اختلاف تھا تو انہوں نے جماعت کی انتخابی جدوجہد میں شرکت ہی نہیں کی بلکہ خود ایک پنچائیت کے نمائندے کی حیثیت سے کھڑا ہونا کیسے قبول فرما لیا؟

شوریٰ کے فیصلوں کی خلاف ورزی

۲۔ ملک صاحب نے مولانا سید ابوالا علیٰ مودودی صاحب پر یہ الزام لگایا ہے کہ "وہ جماعت کے دستور اور اس کی روایات کے خلاف مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں اور احتجاج کے باوجود اپنی روش پر بضد رہے ہیں"۔

اس کی نمایاں ترین مثالیں جو انہوں نے دی ہیں ان میں پہلی مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ کشمیر کے متعلق مجلس شوریٰ نے مجاہدین کی امداد کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیے عوام سے ایک بڑی رقم جمع کی تھی لیکن مولانا مودودی صاحب نے شوریٰ کے فیصلے کے خلاف ایک ایسی بات کہہ ڈالی جس سے جماعت ایک عظیم ابتلا میں گرفتار ہو گئی اور یہ رقم بھی مجاہدین تک نہ پہنچی"——یہ سب کچھ جو ملک صاحب نے بیان کیا ہے بالکل خلاف واقع ہے، مجلس شوریٰ کا کوئی فیصلہ کشمیر کے معاملے میں ستمبر ۱۹۴۸ء سے پہلے کا موجود نہیں ہے اور جس بات کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ مولانا مودودی صاحب نے وہ بات کہہ کر جماعت کو عظیم ابتلا میں ڈال دیا وہ مئی ۱۹۴۸ء میں کہی گئی تھی۔ اس لیے اس کے مجلس شوریٰ کے کسی فیصلے کے خلاف ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر مجلس شوریٰ نے جہاد کشمیر کے لیے کام کرنے کا فیصلہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں کیا جس کے تقریباً پندرہ روز بعد مولانا مودودی صاحب نظر بند کر دیے گئے اور اس کے بعد جناب عبدالجبار غازی صاحب کے دور امارت میں کشمیر فنڈ جمع کرنا شروع کیا گیا۔ اس فنڈ میں جملہ ۱۹۸۸۳ روپے ۲ آنے ۹ پائی جمع ہوئے اس کے علاوہ مجاہدین کی امداد کے لیے مختلف قسم کے ضروری سامان (مثلاً کپڑے، دوائیں وغیرہ) بھی جمع ہوئے۔ یہ سامان اور ۴۵۴۷ روپے پانچ آنے چھ پائی مجاہدین اور مہاجرین کشمیر کی امداد و اعانت پر خرچ ہو گئے۔ مگر جنوری ۱۹۴۹ء میں جب کشمیر کی جنگ بند ہو گئی اور اقوام متحدہ نے وہاں استصواب کرانے کا فیصلہ کیا تو جماعت نے یہ طے کیا کہ باقی ۱۵۳۳۵ روپے ۱۳ آنے ۳ پائی کی جو رقم بچتی ہے وہ اس غرض کے لیے محفوظ رکھی جائے کہ کشمیر میں آیندہ استصواب یا جہاد جو صورت بھی پیش آئے اس میں اسے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ یہ رقم آج بھی کشمیر فنڈ ہی کے کھاتے میں موجود ہے اور اسے کسی دوسرے حساب میں منتقل نہیں کیا گیا ہے۔

جماعت اپنے موجودات کے لحاظ سے اس پوزیشن میں ہے کہ کشمیر میں جہاد یا استصواب جو صورت بھی پیش آئے اس کے لیے وہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر کام شروع کر سکتی ہے۔

اس کے علاوہ ملک صاحب کو خوب معلوم ہے کہ ۱۹۵۳ء کے مارشل لا کے زمانے میں جماعت کے حسابات کا تفصیلی جائزہ خود حکومت کے افسران نے لیا اور ناظم مالیات کو قلعے لے جا کر جو تفتیش کی گئی اس میں کشمیر فنڈ کے معاملہ کی بھی وضاحت کرائی گئی اور اضطرابات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں بھی اس فنڈ کے بارے میں سوال ہوا اور خود ملک صاحب ہی نے اس کی وضاحت کی تھی۔

قادیانی مسئلہ

دوسری مثال انہوں نے یہ دی ہے کہ جماعت قادیانوں کو اقلیت قرار دینے کے بارے میں تو حتمی رائے رکھتی تھی لیکن شوریٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ اسے دستوری مہم کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔ مولانا مودودی صاحب نے اس کے خلاف دستوری مہم کے آٹھ نکات میں بطور خود نویں نکتہ کا اضافہ کر دیا اور شوریٰ سے مشورہ کیے بغیر ان جماعتوں سے اشتراک عمل شروع کر دیا جن کے متعلق شوریٰ کی اور مولانا مودودی صاحب کی اپنی رائے یہ تھی کہ وہ اس مسئلے کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ جولائی ۵۲ء کی مجلس شوریٰ میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دینا چاہیے لیکن ایسے وقت میں جبکہ اسلامی دستور کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی قوم کی توجہات کو کسی دوسری طرف پھیرنا اور دو الگ الگ مطالبوں کے لیے جدوجہد کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ قادیانیوں کے مسئلہ کو دستور ہی کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن مجلس شوریٰ کی اس خواہش کے خلاف جب ملک میں قادیانیوں کے متعلق ایک زبردست ایجی ٹیشن اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ایسی ہنگامی صورت اختیار کرنی شروع کر دی جس سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ قوم کی توجہ دستور کے مسئلہ سے اگر ہٹ نہ جائے گی تو بہت بڑی حد تک بٹ ضرور جائے گی تو امیر جماعت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے ۳ اگست ۱۹۵۲ء کو جماعت کے ان اہل الرائے کی جو لاہور میں موجود تھے، ایک مجلس مشاورت منعقد کی اور اس میں یہ فیصلہ کیا کہ قادیانی مسئلے کو دستور کے مسئلے کا ایک جزو بنانے کے لیے مطالبہ دستور کے آٹھ نکات میں نویں نکتے کا اضافہ کیا جائے تاکہ لوگ یہ محسوس کریں کہ ایک ہی مطالبے کے ذریعے یہ دونوں مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔ اسی زمانے میں اسی طرح کی ایک مجلس مشاورت میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب میں جو مجلس عمل قادیانی مسئلہ کے متعلق بنی ہے اس میں حصہ لے کر اس امر کی کوشش کی جائے کہ یہ ایجی ٹیشن غیر آئینی راستوں کی طرف جا کر ایسے ہنگاموں کا موجب نہ بن جائے جس سے اسلامی دستور کے متعلق ساری

کوششوں کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ یہ دونوں فیصلے جیسا کہ میں ابھی اوپر بیان کر چکا ہوں امیر جماعت نے خود نہیں کیے تھے بلکہ مجلس مشاورت نے کیے تھے اور مجلس شوریٰ کی غیر موجودگی میں پیش آیندہ اہم مسائل کے فیصلے اس طرح کی مجلس مشاورت میں کرنا جماعت کے مقررہ ضابطے کے خلاف نہیں ہے۔ جون ۱۹۴۶ء میں مجلس شوریٰ امیر جماعت کو اس امر کا باقاعدہ مجاز کر چکی تھی کہ اگر ساری مجلس شوریٰ سے رائے لینا ممکن نہ ہو تو وہ جماعت کے جن لوگوں سے بھی بروقت رائے لے سکتا ہو ان سے مشورہ کر کے کوئی بڑا قدم اٹھا سکتا ہے پھر اسی فیصلے کی مجوزہ دستور جماعت نے جو ۲۶ اگست ۱۹۵۲ء سے نافذ ہوا ہے دفعہ ۲۱ کے تحت ان الفاظ میں توثیق کی ہے کہ ''جو معاملات پوری جماعت سے متعلق ہوں ان میں اگر کوئی ضروری قدم اٹھانے کی ضرورت پیش آجائے اور پوری مجلس شوریٰ سے رائے لینا ممکن نہ ہو تو امیر مجلس شوریٰ کے جن ارکان سے بھی بروقت رائے لے سکتا ہو ان سے مشورہ کر کے قدم اٹھا سکتا ہے۔ پھر اس دفعہ کے تحت مجلس شوریٰ نے لاہور کے لیے ایک باقاعدہ مجلس مشاورت مقرر کر دی تاکہ جب امیر جماعت لاہور میں ہو اور کوئی اہم مسئلہ پیش آجائے تو اس مجلس کے مشورے سے اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ کوئی مثال اس امر کی نہیں دی جاسکتی کہ مولانا مودودی صاحب نے اپنے پورے زمانہ امارت میں کبھی جماعت کے اس مقرر ضابطے کی خلاف ورزی کی ہو۔

اعتراض و تنقید کا حق

۴۔ تیسری مثال انہوں نے یہ دی ہے کہ ''جماعت کے دستور کی دفعہ ۸۱ کی رو سے جماعت کے کل پاکستان اجتماع میں ہر رکن کو اعتراض اور تنقید کی پوری آزادی ہے لیکن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے نومبر ۱۹۵۵ء کے اجتماع کراچی میں تمام اعتراضات اور تجاویز کو پیش ہونے سے روک دیا''——اس سلسلے میں ان کو یہ بھی اعتراض ہے کہ ان کے جو اعتراضات اور ان کی جو تجویزیں تھیں وہ بھی روک دی گئیں۔ لیکن دستور کی جس دفعہ کا حوالہ وہ دیتے ہیں اس میں حق اعتراض و تنقید کے ساتھ یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس حق کو استعمال کرنے والا حدود شرعیہ اور حدود اخلاق سے تجاوز نہ کرے اور کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جو جماعت کے لیے نقصان دہ ہو۔ اس شرط کے مطابق جو اعتراضات مختلف لوگوں کے متعلق پیش کیے گئے تھے ان کو تحقیق کے بغیر اجتماع عام میں لے آنا حدود شرعیہ اور حدود اخلاق دونوں کے خلاف تھا۔ اس لیے مولانا مودودی صاحب نے نہیں بلکہ مجلس شوریٰ نے تحقیق کی خاطر ان کو روکنے کا فیصلہ کیا اسی طرح جو تجاویز روکی

گئیں وہ ایسی تھیں کہ اگر ارکان کے اجتماع عام میں وہ پیش کی جاتیں تو ان پر بحث اور ان کا فیصلہ کرنے میں کم از کم ۵۔۴ روز صرف ہوتے اور کراچی جیسے مقام پر ایک ہزار ارکان کے چار پانچ روز کیمپ میں رہنے سے جماعت ہزاروں روپے کی زیر بار ہو جاتی اور جماعت کے لیے نقصان دہ ہوتا۔ اس لیے امیر جماعت نے نہیں بلکہ مجلس شوریٰ نے ان کو اس غرض کے لیے روکا تھا کہ پہلے خود مجلس شوریٰ ان کے بارے میں غور اور بحث کر لے اور پھر اگر کوئی تجویز ایسی وزنی ہو کہ وہ اجتماع ارکان ہی میں زیر بحث لائی جائے تو پھر آیندہ اجتماع ارکان میں پیش کی جائے۔

جائزہ کمیٹی

۵۔ فسطائی ہتھکنڈوں کی تازہ ترین مثال ملک صاحب نے یہ دی ہے کہ ''جماعت کی قیادت میں بڑھتے ہوئے اختلافات اور ارکان جماعت میں عام بے چینی کے پیش نظر مجلس شوریٰ نے ایک سال قبل ایک جائزہ کمیٹی تشکیل دی تھی اور جماعتی سرکلر کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اس کمیٹی کی رپورٹ سامنے آنے کے بعد کل پاکستان اجتماع ارکان منعقد کیا جائے گا لیکن جب یہ رپورٹ آگئی تو یہ اجتماع منسوخ کر دیا گیا اور اب اس رپورٹ کے بارے میں ارکان سے غیر معمولی اخفا برتا جارہا ہے۔''——یہ جو کچھ ملک صاحب نے بیان کیا ہے بالکل خلاف واقعہ ہے۔ مجلس شوریٰ نے دسمبر ۱۹۵۵ء میں جائزہ کمیٹی کے نام سے ایک کمیٹی اس غرض کے لیے مقرر کی تھی کہ جماعت کی پالیسی کے متعلق جتنی تجاویز اجتماع عام میں پیش کرنے کے لیے آئی تھیں ان پر غور کرنے اور جماعت کے کام کا جائزہ لینے کے بعد مجلس شوریٰ کے سامنے اپنی سفارشات پیش کرے تاکہ مجلس شوریٰ ان کی روشنی میں غور کر کے یہ فیصلہ کر سکے کہ جماعت کی پالیسی میں کسی تغیر کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اس کمیٹی کے ایک رکن خود ملک سعید صاحب تھے۔ اور اسے فروری ۱۹۵۶ء تک اپنی رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن اس کمیٹی نے آخر وقت تک اپنا کام شروع بھی نہیں کیا۔ پھر مارچ ۵۶ء میں مجلس شوریٰ نے جائزہ کمیٹی کی دوبارہ تشکیل کی اور اس کے حدود کار یہ متعین کیے کہ ''جماعت کی پالیسی نظم اور حالات کے متعلق جو اعتراضات اور شکایات اور تجاویز سالانہ اجتماع کے موقع پر موصول ہوئی تھیں ان کے بھیجنے والوں سے گفتگو کر کے یہ تحقیق کریں کہ ان کے اعتراضات اور شکایات کی بنیاد کیا ہے اور وہ اصلاح کے لیے ایجابی صورت میں کیا تجاویز پیش کرتے ہیں۔ نیز جماعت کے ارکان میں اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی پالیسی طریق کار اور حالات کے بارے میں کوئی تبدیلی چاہتے ہیں تو ان سے تحقیق کریں کہ وہ کیا تبدیلی

چاہتے ہیں''اس کمیٹی کو اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کرنے کے ساتھ یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مجلس شوریٰ کو یہ بتائے کہ شکایات واعتراضات میں کون کون سی باتیں بجا ہیں اور ان کو دور کرنے کی کیا تدابیر ہیں۔ یہ کمیٹی مجلس شوریٰ ہی نے مقرر کی تھی اور اس کی رپورٹ مجلس شوریٰ ہی کے سامنے آئی تھی۔ ارکان کے اجتماع عام میں اسے پیش کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ کسی سرکلر میں اس کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد کل پاکستان اجتماع ارکان منعقد کیا جائے گا بلکہ اس کے برعکس ۲۱ اگست ۱۹۵۶ء کے سرکلر میں کہا گیا ہے کہ ستمبر کے آخر تک جائزہ کمیٹی اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ اکتوبر میں مجلس شوریٰ اس پر غور کر کے اپنے آخری فیصلے کرے گی اور مغربی پاکستان میں ۴ حلقہ وار اجتماعات منعقد کیے جائیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اجتماع ارکان میں اس رپورٹ کو پیش کرنے کا کب فیصلہ کیا گیا۔ اور نہ ہی کسی ایسے جماعتی ضابطے سے واقف ہوں کہ جو رپورٹ مجلس شوریٰ کے سامنے اس کی مقرر کردہ کوئی کمیٹی پیش کرے اسے شوریٰ کے باہر کے ارکان جماعت سے مخفی رکھنا قابل اعتراض ہے۔ یہ فیصلہ بھی امیر جماعت کا نہیں بلکہ مجلس شوریٰ کا تھا کہ یہ رپورٹ بصیغہ راز رکھی جائے۔ لیکن ملک سعید صاحب خود اپنے بیان میں فرمارہے ہیں کہ جائزہ کمیٹی کے روبرو ۲۰۰ سے زائد ارکان نے رائے دی اور ان میں سے ۸۰ فیصد سے زائد نے جماعت کی پالیسی اور اخلاقی حالت سے عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ معلوم نہیں کہ ان کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے۔

جماعت اسلامی اور انتخابات

۶۔ اسی سلسلے میں ملک صاحب نے فرمایا ہے کہ ''مرکزی شوریٰ نے ۱۵ روز کی بحث کے بعد بالاتفاق اس رپورٹ کی بنیاد پر ایک قرارداد کے ذریعے جماعت کی پالیسی کو بدلتے ہوئے، انتخاب کی مہم سے دست کش ہو کر انقلاب فکر اور تعمیر معاشرہ کے کام پر اپنی توجہات کو مرکوز کر دینے کا فیصلہ کیا ہے''۔۔۔۔۔۔۔ آگے چل کر وہ پھر امیر جماعت کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جائزہ کمیٹی نے آپ کے منشاء کے خلاف رپورٹ دے دی ہے۔ شوریٰ میں آپ کو شکست ہو گئی ہے اور ہنگامہ آرائیوں اور سر دست انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ ہو چکا ہے''۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ ابھی حال ہی میں مجلس شوریٰ نے انتخابات میں سر دست حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن مولانا مودودی انتخاب میں حصہ لینا چاہتے ہیں''۔ واقعہ یہ ہے کہ مجلس شوریٰ نے پالیسی میں کوئی تغیر نہیں کیا ہے بلکہ جماعت کے اس لائحہ عمل کی توثیق کی ہے جو ۱۹۵۱ء کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں پیش کیا گیا تھا اور ملک صاحب کے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ جماعت نے اپنے اصول و مسلک یا

بنیادی پالیسی سے کوئی انحراف کیاہے اس کے ساتھ اس نے انتخابات کے بارے میں صرف یہ فیصلہ کیاہے کہ کسی انتخابی مہم کے لیے کام کرنا سر دست قبل از وقت ہے۔ اس میں یہ مضمون کہاں ہے کہ جماعت نے انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیاہے اور شوریٰ کی ان کارروائیوں سے متعلق ملک صاحب کی معلومات کا کیا ذریعہ ہے کہ شوریٰ میں امیر جماعت کو شکست ہوئی ہے اور شوریٰ انتخابات میں حصہ نہیں لینا چاہتی اور امیر جماعت اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔

استعفوں کا مطالبہ

۷۔ ملک صاحب نے فسطائی ہتھکنڈوں کی مثال دیتے ہوئے یہ بھی فرمایاہے کہ "شوریٰ کے اجلاس کے بعد پچھلے ہی ہفتے امیر جماعت نے جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان کے نام خطوط کے ذریعے ان کے سارے کام کو ایک سازش قرار دیتے ہوئے ان سے مرکزی شوریٰ سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ دستور میں اس کی کوئی گنجایش نہیں ہے اور نہ کسی جمہوری جماعت میں ایسی حرکات کا تصور کیا جاسکتا ہے"۔ شاید ملک صاحب کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کسی جمہوری جماعت میں مجلس عاملہ یا ورکنگ کمیٹی اور جمہوری حکومتوں میں کیبنٹ (مجلس وزرا) ارکان کی منتخب کردہ نہیں ہوتی بلکہ صدر یا رئیس الوزرا ارکان میں سے خود نامزد کرتا ہے۔ لیکن جماعت اسلامی کے امیر کو اس مجلس شوریٰ کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے جسے ارکان اسے منتخب کر کے دیتے ہیں۔ اس مجلس کے متعلق جماعت اسلامی کے دستور کی دفعہ ۴۷ میں دو شقیں رکھی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ اگر امیر جماعت کے خلاف مجلس شوریٰ عدم اعتماد کی تجویز پاس کرے مگر استصواب عام میں ارکان کی اکثریت اسے نامنظور کر دے تو مجلس شوریٰ آپ سے آپ معزول ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ اگر امیر جماعت یہ محسوس کرے کہ مرکزی مجلس شوریٰ کو تبدیل کرنا ضروری ہے تو وہ ارکان جماعت سے استصواب کرے گا۔ اور اگر ارکان جماعت کی اکثریت اس سے متفق ہو تو مجلس معزول ہو جائے گی اور نئی مجلس شوریٰ کا انتخاب کیا جائے گا۔ اس دفعہ کی رو سے امیر جماعت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اگر وہ کسی وقت یہ محسوس کرے کہ وہ جماعت کے منتخب کردہ سب یا بعض ارکان شوریٰ کے ساتھ کام نہیں کر سکتا تو وہ جماعت سے ان کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کرے اور ارکان جماعت کے سامنے وہ وجوہ رکھ دے جن کی بنا پر وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے۔ امیر جماعت نے اپنے دستوری اختیار کو پچھلے پندرہ سال کی مدت میں پہلی مرتبہ استعمال کیاہے اور وہ بھی اس شکل میں کہ جن ارکان شوریٰ کے ساتھ کام کرنا وہ مشکل سمجھتے ہیں ان کو اپنی اس رائے کے وجوہ بتا کر انھوں نے یہ اختیار دیاہے کہ چاہیں تو وہ

خود مستعفی ہو جائیں اور چاہیں توان وجوہ کوارکان کے سامنے پیش کر کے استصواب کرالیں،اس چیز پر میں نہیں سمجھتا کہ کس قاعدے کے رو سے اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ ملک صاحب کی یہ بات بالکل غلط ہے کہ ان ارکان شوریٰ پرامیر جماعت نے سازش کرنے کاالزام لگایا ہے۔اسی خط میں یہ بات بالکل صاف الفاظ میں لکھی گئی ہے کہ امیر جماعت کوان پر سازش کا شبہ تک نہیں ہے۔

لیکن میں اس بات پر حیرت کااظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مذکورہ بالا چاروں ارکان کے نام جو خط بالکل بہ صیغۂ راز بھیجا گیا تھااور جس کے متعلق امیر جماعت، قیم جماعت اور امیر جماعت کے معاون کے سوا کوئی چوتھا شخص مرکز جماعت میں کچھ بھی نہ جانتا تھا اس کی اطلاع ملک صاحب کو پریس کانفرنس میں پیش کرنے کے لیے کیسے پہنچی اور کس نے پہنچائی۔

ملک سعید نے کتاب لکھی

۸۔ ملک صاحب نے رکنیت جماعت سے اپنی معطّلی کا ذکر بھی جس انداز میں کیا ہے وہ بھی بالکل خلاف واقع ہے۔ملک صاحب کے متعلق کئی مہینوں سے حلقہ راولپنڈی کی جماعت یہ شکایت کر رہی تھی کہ وہ مسلسل جماعت کے نظم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ مرکز جماعت اس کو ٹالتا رہااور کوشش کرتا رہا کہ ملک صاحب کسی طرح اپنا رویہ بدل لیں۔اس کے بعد انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے جماعت اسلامی کی ساری پالیسی سے بنیادی طور پر اختلاف کا اظہار کیا۔ وہ اس کتاب کو پریس کے حوالے کر چکے تھے کہ جماعت کو ان کی اس کارروائی کی اطلاع ہوئی۔ جماعت کے ذمہ دار لوگوں نے ان کو سمجھایا کہ رکن جماعت رہتے ہوئے وہ یہ کام نہیں کر سکتے۔البتہ جماعت سے الگ ہو کر وہ اس طرح کی تنقید کا حق استعمال کر سکتے ہیں۔ملک صاحب نے اس اعتراض کو تسلیم کیااور اشاعت روک دی۔

ان کے اس رویہ کی تحقیقات کے لیے مجلس شوریٰ نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے سپرد ان الزامات کی تحقیق بھی کر دی گئی جو ملک صاحب جماعت اسلامی کے مختلف لوگوں پر لگاتے تھے۔اس تحقیقات کے دوران میں حلقہ راولپنڈی کے امیر جماعت نے اس بنا پر ملک صاحب کو رکنیت سے معطل کر دیا کہ اب بھی وہ اپنی ان سرگرمیوں میں مصروف ہیں جن کی تحقیق کرنے کے لے کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔

جماعتی ضوابط کی رو سے امیر حلقہ کو ایسا کرنے کا حق تھا اور انہوں نے جو کچھ کیا اپنے اختیارات کی حد میں کیا۔ امیر جماعت نے ان کی معطلی کی توثیق ۵ جنوری کو کی ہے اور یہ وہی تاریخ ہے جس روز ملک صاحب نے پریس کانفرنس منعقد فرمائی ہے۔

مولانا مودودی کی امارت اور ارکان

ملک صاحب سے پریس کانفرنس میں سوال کیا گیا کہ آپ نے امیر جماعت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کیوں نہ پیش کی۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ جماعت میں حق رائے دہی تو ضرور دیا گیا ہے لیکن دباؤ ایسا ڈالا جاتا ہے کہ اس قسم کے خیالات کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ انہوں نے پریس کانفرنس میں شریک ہونے والوں کو یہ تصور بھی دلایا ہے کہ جماعت کی اکثریت ان کے ساتھ ہے لیکن مذہبی طبقوں میں شخصیت پرستی کے رجحان کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہی رجحان مولانا مودودی صاحب کو امارت سے الگ کرنے میں مانع ہے۔ اس طرح کی باتیں ملک صاحب کرنا چاہیں تو کریں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دستور جماعت اسلامی کی دفعہ ۴۳ میں امیر جماعت کی معزولی کا طریق کار واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس سے ہر وقت ہر رکن جماعت کام لے سکتا ہے۔ مولانا مودودی صاحب کو تشکیل جماعت کے وقت بالاتفاق امیر جماعت منتخب کیا گیا تھا۔ پھر دوسری مرتبہ ۱۹۵۰ء میں نظر بندی سے رہا ہونے کے بعد وہ ۴۸۲ بمقابلہ ۲ ووٹوں سے امیر جماعت منتخب ہوئے۔ اس کے بعد پھر نومبر ۱۹۵۵ء میں تیسری مرتبہ وہ ۹۴۹ میں ۹۳۴ ووٹ سے امیر جماعت منتخب ہوئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان ان کی امارت پر قریب قریب متفق ہیں۔ اب حلقہ وار اجتماعات پاکستان میں ہونے والے ہیں۔ جن میں ہر رکن جماعت شریک ہو کر اپنے خیالات پیش کرنے کی پوری پوری آزادی رکھتا ہے۔ جو شخص چاہے وہ امیر جماعت کی پالیسی، طریق کار اور امیر جماعت کی حیثیت سے ان کے کردار پر کھلم کھلا تنقید کر سکتا ہے اور اپنے نقطہ نظر کی تائید میں جماعت کی رائے کو ہموار کرنے کی ہر ممکن کوشش کر سکتا ہے۔ یہ ایک طرح سے پوری جماعت میں استصواب عام ہو گا۔ اس میں یہ بات خود معلوم ہو جائے گی کہ جماعت کی اکثریت کس کے ساتھ ہے۔ امیر جماعت نے فیصلہ کیا ہے کہ ان حلقہ وار اجتماعات میں ہر رکن جماعت شریک ہو سکتا ہے اور تقریر کر سکتا ہے۔ خواہ وہ اس حلقہ سے تعلق نہ رکھتا ہو جس کا اجتماع ہو رہا ہے۔

ملک سعید کا اپنا کردار

جب کہ ملک صاحب جماعت اسلامی کی ساری روایات کے خلاف یہ حرکت کر بیٹھے ہیں، مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ جماعت کے اندر ملک صاحب کے فتنہ پردازانہ کردار اور ان کے معاملات کی خرابیوں کی ساری تفصیلات پبلک کے سامنے رکھ دوں میں صرف اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ انہوں نے واقعات کو غلط صورت میں پیش کر کے پبلک کو دھوکا دینے کی جو کوشش کی ہے اس کی حقیقت بیان کر دوں۔

جماعت اسلامی میں قیادت کا مقام

سید ابوالاعلیٰ مودودی

جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی یہ تقریر ہم ان کے ٹائپسٹ جناب محمد حسین شمیم کے خصوصی شکریے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ اگر وہ اسے ریکارڈ پر نہ لاتے تو تحریک اسلام کی قیادت اور جماعت اسلامی کی امارت کے بارے میں مولانا مودودی کے تصورات کو اتنی وضاحت اور سہولت سے سمجھنا ممکن نہ ہوتا، جتنا کہ اس تقریر نے ممکن بنادیا ہے۔

جناب محمد حسین شمیم کی روایت کے مطابق اس تقریر کی نقول، مولانا مودودی نے جماعت کی امارت سے مستعفی ہونے کے چند روز بعد اور ماچھی گوٹھ کے کل پاکستان اجتماع ارکان سے تقریباً ایک ماہ پہلے تیار کروالی تھیں، مگر یہ کام مکمل رازداری کے ساتھ انجام دیا گیا تھا۔ اس رازداری کی وضاحت کرتے ہوئے شمیم صاحب لکھتے ہیں:

> ۱۰ جنوری ۱۹۵۷ء کو جب مولانا مودودی نے امارت سے استعفیٰ دے دیا تھا، اس کے چند دن بعد چودھری غلام محمد مرحوم (قائم مقام امیر جماعت) مولانا مودودی کا ان کے اپنے ہاتھ سے محررہ ایک مسودہ میرے پاس لائے اور فرمایا کہ اس کی نقول سائیکلوسٹائل کر دیں اور تاکید کی کہ اسے راز میں رکھیں۔ میں نے عرض کیا کہ ''مصباح الاسلام فاروقی کو بھی نہ بتاؤں'' انہوں نے فرمایا کہ ''ہاں ان کو بھی نہ دکھائیں''۔

اگرچہ اس تقریر کے مزاج سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے یہ کل پاکستان اجتماع ارکان کے سامنے جماعت کی امارت سے اپنے استعفے کی وجوہات بیان کرنے کے لیے لکھی گئی تھی، لیکن جس طرح اس کی نقول کی تیاری میں رازداری کا اہتمام کیا گیا تھا، اسی طرح اس کو ارکان جماعت تک پہنچانے کے لیے بھی رازدارنہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ مولانا مودودی نے اجتماع ارکان کے دوران باقاعدہ اجلاس میں سب کے سامنے اپنے یہ خیالات پیش کرنے کی بجائے اس تقریر کی نقلیں ایک بالائے دستور مجلس نمائندگان کو مطالعہ کے لیے فراہم کیں تاکہ وہ اپنے اپنے حلقے کے ارکان کو مولانا کے نقطہ نظر سے آگاہ کریں۔

اگر مولانا مودودی مرحوم اس تقریر میں بیان کردہ اپنی ان ''شرائط امارت'' کا اظہار اجتماع ارکان کے باقاعدہ اجلاس میں کرتے تو اس کے جواب میں مولانا امین احسن اصلاحی اور دیگر اہل علم حضرات کو بھی اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع ملتا۔ ان حضرات کی طرف سے شوریٰ کی بالادستی کا اسلامی اصول پورے دلائل کے ساتھ پیش کیا جاتا، جس کی روشنی میں جماعت کے دستور (۱۹۵۲ء) میں امیر جماعت کے لیے لازم قرار دیا گیا تھا کہ وہ اہم فیصلے شوریٰ کے مشورے سے کرے۔ اس مباحثے میں لامحالہ مولانا مودودی کے وہ تمام فیصلے، اقدامات اور ان کے نتائج بھی زیر بحث آتے جو انہوں نے شوریٰ کے مشورے کے بغیر کیے تھے یا جن میں شوریٰ کے مشوروں سے انحراف کیا گیا تھا۔ بطور امیر مولانا کی ذات اور اقدامات کے زیر بحث آنے کے بعد نہ مولانا کی امارت پر اس طرح غیر مشروط اظہار اعتماد ممکن ہوتا، جس کا اظہار کر کے ان سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی گئی تھی، اور نہ مولانا اپنی منصوبہ بندی کے مطابق اجتماع ارکان سے اپنی اس متنازع پالیسی کے حق میں متفقہ حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے، جو ان کے اور شوریٰ کے درمیان باعث نزاع تھی۔

اس رازدارانہ حکمت عملی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جماعت کے باہر بھی مولانا کو اپنے لیے اور جماعت کے لیے ایک جمہوری چہرے کی ضرورت تھی۔ اگر امیر جماعت کی طرف سے آمرانہ اختیارات کا یہ مطالبہ عام لوگوں کے سامنے آتا تو ان کی جمہوریت پسندی کا دعویٰ بھی سیاسی میدان میں قابل یقین نہ رہتا۔

جناب سعید ملک نے اپنے استعفے میں مولانا مودودی پر شوریٰ کے فیصلوں کی خلاف ورزی کرنے اور فسطائی طور طریقے اختیار کرنے کے جو الزامات عاید کیے تھے، قارئین مولانا کی اس تحریر یا تقریر کا مطالعہ کرنے کے بعد، ان کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ خود کر سکتے ہیں۔ (مرتب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم رفقاء!

میں نے اپنے ایک سے زیادہ بیانات میں آپ سے وعدہ کیا ہے کہ اس اجتماع کے موقع پر میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ میں جماعت کی امارت سے کیوں الگ ہونا چاہتا ہوں، اس منصب سے میری علیحدگی کیوں ضروری ہو گئی ہے، اور میرے خیال میں اب اس تحریک اور جماعت کے نظام کو چلانے کے لیے مناسب صورت کیا ہے۔

مجھے یہ معاملہ آپ کے سامنے ایک بڑے نازک موقع پر پیش کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک طرف میرا یہ فرض ہے کہ معاملے کا ہر پہلو آپ کے سامنے بے کم و کاست پیش کر دوں، کیونکہ اس کے بغیر آپ کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ مگر دوسری طرف مجھ پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ اسے پیش کرنے میں ہر ایسے طریقے سے اجتناب کروں، جو کسی خرابی کا موجب ہو، تاکہ آپ اس پر ایک تصفیہ طلب مقدمے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک حل طلب مسئلے کی حیثیت سے بے لاگ طور پر غور کر سکیں۔ میں اپنے بیان میں ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ مگر اس میں میری کامیابی ایک حد تک آپ حضرات کی مدد پر بھی منحصر ہے۔ آپ میری مدد اس طرح کر سکتے ہیں کہ جن امور کو میں آپ کے سامنے اجمال کے ساتھ پیش کروں، آپ ان کی تفصیل نہ مجھ سے دریافت کریں اور نہ خود ان کی کھوج میں لگ جائیں۔ میں ان کو صرف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ آپ پوری طرح اس صورت حال سے باخبر ہو جائیں، جو مجھے اور جماعت کو اس وقت در پیش ہے، اور اس غرض کے لیے ان کا صرف اجمالی بیان کافی ہے، بشرطیکہ آپ مجھ پر یہ اعتماد کریں کہ میں آپ کے سامنے حقیقی صورت حال رکھ رہا ہوں۔ یہ احتیاط آپ ملحوظ نہ رکھیں گے تو ہر چیز کی تفصیل ایک مقدمہ بن جائے گی اور آپ اپنے نصب العین کے لیے آگے کچھ کام کرنے کے بجائے انہی مقدمات میں الجھ کر رہ جائیں گے۔

اب میں آپ کے سامنے اصل معاملہ پیش کرتا ہوں:

آپ جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی، جس میں آپ شامل ہوئے ہیں، صرف ایک جماعت یا انجمن نہیں ہے، بلکہ ایک تحریک کی علمبردار جماعت ہے۔ یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ یہ جماعت جس تحریک کی علمبردار ہے، وہ کوئی محدود نوعیت کی تحریک نہیں، بلکہ پورے نظام زندگی میں ہمہ گیر تغیر و انقلاب اور اصلاح و تعمیر کی تحریک

ہے۔اس بات سے بھی آپ واقف ہیں کہ یہ تحریک کامیابی کی منزل پر پہنچ نہیں چکی، بلکہ جدوجہد اور کشمکش کے کٹھن مراحل سے گزر رہی ہے اور ابھی نہ معلوم کتنی مدت تک اسے انھی مراحل سے گزرنا ہے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ اس جدوجہد کا کوئی ایک محاذ نہیں، بلکہ بیسیوں محاذ ہیں، اور یہ کش مکش کسی ایک طاقت سے نہیں، بلکہ ان بے شمار اندرونی اور بیرونی طاقتوں سے ہے، جو اسلامی نظام زندگی کے قیام میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مزاحم ہیں۔ یہ سب حقیقتیں اگر آپ کے ذہن میں تازہ نہیں ہیں، تو براہ کرم اب تازہ کر لیجیے، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس مسئلے کی نزاکت پوری طرح محسوس نہیں کر سکتے، جسے میں آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔

جو جماعت اس طرح کی ایک تحریک چلا رہی ہو، اس میں قیادت کا مقام اگر کسی شخص کو دیا جائے تو اسے بیک وقت دو مختلف نوعیت کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ ایک تحریک کی رہنمائی، دوسری نظام جماعت کی سربراہی۔ یہ دونوں کام صرف نوعیت ہی میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں، بلکہ ان کے تقاضے بسا اوقات ایک دوسرے کی ضد ہو جاتے ہیں، اور ایک شخص کے لیے ہر حالت میں ان دونوں کو ایک ساتھ پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ ذرا تجزیہ کر کے دیکھیں تو دونوں کا فرق، اور ان کو ایک ساتھ نباہنے کی دشواری آپ کے سامنے واضح ہو جائے۔

نظام جماعت کو چلانا ایک انتظامی نوعیت کا کام ہے، وہ لامحالہ ایک دستور چاہتا ہے، خواہ وہ تحریری دستور ہو یا رواجی۔ اس کے سربراہ کی حیثیت ایک صدر انجمن، ایک ناظم، یا ایک ایگزیکٹو آفیسر سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ اس کو لازماً کچھ مقرر اختیارات دیے جائیں گے اور کچھ حدود کا پابند کیا جائے گا۔ وہ ان حدود اور اختیارات سے تجاوز بھی نہیں کر سکتا، اور ساتھ ہی اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر اسے انتظام چلانا ہے تو ان حدود کے اندر کسی نہ کسی وقت اپنے اختیارات کو استعمال بھی کرے۔ خواہ کسی کو گوارا ہو یا ناگوار، انتظام کے معاملے میں محبت کا کوئی سوال نہیں، وہ تو نظم کے تقاضے پورے کرنے کا طالب ہے۔ پھر جماعت کا نظام یہ چاہتا ہے کہ اس کے سب کام ایک لگے بندھے ضابطے پر چلیں۔ اس میں مشورے، اور معاملات کے فیصلے کا ایک طریقہ مقرر ہو۔ اس میں نیچے سے اوپر تک تمام متعلقہ اداروں اور ان سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے حدود، حقوق اور اختیارات معین ہوں۔ اور اس میں ناظم اعلیٰ سے لے کر ایک ابتدائی رکن یا کارکن تک کسی کو نہ اپنی حد سے نکلنے کا حق ہو، نہ دوسرے کی حد میں داخل ہونے کا۔ اس میں ہر فیصلے کے متعلق یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ وہ ضابطہ کے مطابق ہوا ہے یا نہیں۔ اس میں ہر حکم کے متعلق یہ بحث پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ قاعدے کے اندر ہے یا

باہر۔اس میں پیدا ہونے والی نزاعات نہ صرف جماعت کے اندر تصفیہ طلب ہو سکتی ہیں، بلکہ ملکی عدالتوں میں بھی جا سکتی ہیں اور پبلک میں بھی بحث کا موضوع بن سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک منظّم ادارے کی شکل میں کام کرنے کے قدرتی لوازم ہیں۔

علاوہ بریں اگر ایسے کسی ادارے کو جمہوری طرز پر چلنا ہو تو اس میں اختلافات کا دروازہ کھلا ہونا چاہیے۔ فروعی ہی نہیں، اصولی اختلاف کی بھی گنجایش ہونی چاہیے۔ اظہار رائے ہی کی نہیں، اپنے نقطہ نظر کے حق میں دوسروں کی رائے ہموار کرنے کی بھی آزادی ہونی چاہیے۔ اس میں پارٹیاں اور گروپ بننا جمہوریت کا فطری تقاضا ہے۔ اس میں اپوزیشن بھی ہو سکتی ہے اور سربراہ کی اپنی پارٹی بھی۔ نظم و نسق اکثریت کے ہاتھ میں بھی رہ سکتا ہے اور مخلوط بھی۔ فیصلے تقسیم آرا سے بھی ہو سکتے ہیں، اور مختلف گروپوں کی مصالحت سے بھی۔ ادارے کے سربراہ کا کام بہر حال اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جمہوری فیصلوں کو نافذ کرے۔ جمہوریت خود یہ چاہتی ہے کہ اس میں کسی کا بھی اتنا زور نہ ہو کہ وہ ایک جمہوری ادارے کو اپنی رائے کے مطابق چلائے۔ جو شخص بھی ایسا زور آور بنتا نظر آ رہا ہو، جمہوری مزاج خود بخود اس کا زور توڑنے پر مائل ہو جائے گا۔

ایک تحریک کا مزاج خصوصاً جبکہ وہ کش مکش اور جدوجہد کے مراحل میں ہو، اس سے بالکل مختلف ہے اور اس کو چلانے کے مقتضیات کچھ دوسرے ہیں۔ تحریکیں دستوروں پر نہیں چلا کرتیں۔ ضابطوں کی بندش میں نہیں جکڑی جا سکتیں۔ اختلافات، خصوصیت کے ساتھ اصولی اور نظریاتی اختلافات، ان کے لیے سم قاتل ہیں۔ اندرونی پارٹیوں اور گروپوں کا ظہور ان کے لیے پیغام موت ہے۔ ان کے اندر نزاعات کا پیدا ہونا ہی خطرناک ہے، کجا کہ کوئی نزاع ایک مقدمے کی صورت اختیار کرے اور تحریک کے چلانے والے اس میں ایک دوسرے کے مقابل فریق ہوں۔ تحریک کا مزاج وحدت فکر، وحدت قلب و روح، اور زیادہ سے زیادہ وحدت عمل چاہتا ہے۔ اس سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں اور دماغوں اور طبیعتوں میں جتنی ہم آہنگی اور سعی و حرکت میں جتنی مطابقت ہو، اتنی ہی وہ طاقتور ہے، اور جتنا ان کے درمیان فرق ہو اتنی ہی کمزور ہے۔ ایک تحریک کی ہوا اکھاڑ دینے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کے دو ترجمان دو مختلف زبانوں سے بولنا شروع کر دیں، یا ایک فکر پر چلتے چلتے یکایک اس میں دوسری فکر یا بہت سے مخلوط افکار کا رنگ جھلکنے لگے۔ تحریکوں میں اکثریت و اقلیت کا سوال پیدا ہونا سرے سے غلط ہے۔ جس تحریک میں یہ قاعدہ چلنے لگے کہ فیصلے اکثریت سے ہوں گے یا اقلیت و اکثریت کے درمیان سمجھوتے سے مخلوط پالیسیاں بنائی جائیں گی، اسے کوئی چیز شکست اور

ناکامی سے نہیں بچا سکتی۔ کامیابی کا امکان اگر ہے تو اسی تحریک کے لیے ہے، جس کا ہر قدم پوری جماعت کے قلبی فیصلے سے اٹھے۔ جس کے ہر فیصلے کو پوری جماعت ہی نہیں، اس کی فکر سے متاثر ہونے والا وسیع ترین حلقہ بھی یوں محسوس کرے کہ گویا یہ اس کے دل کی آواز اور اس کی روح کی مانگ ہے، اور جس سے تعلق رکھنے والوں کو دنیا ہر جگہ ہم رنگ، ہم زبان اور ہم مزاج پائے۔

یہ تو ہے ایک تحریک اور ایک جمہوری ادارے کے فرق کا ایک پہلو۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک تحریک کو چلانے والے رہنما کی حیثیت، اور اس کے کام کی نوعیت، ایک جمہوری ادارے کے سربراہ سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ تحریک کی فطرت ایک ایگزیکٹو آفیسر نہیں چاہتی، جو تحریک سے تعلق رکھنے والوں، یا ان کے نمائندوں کے فیصلے نافذ کیا کرے، بلکہ وہ ایک ایسا رہنما چاہتی ہے، جو اس کے فکر کا ترجمان اور نمائندہ مانا جائے، جس کو یہ حیثیت حاصل ہو کہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنی تحریک کی طرف سے بولے اور پوری تحریک اس کی آواز میں آواز ملا دے۔ اس کی جماعت میں اس کا زور کسی ضابطے اور نظام کے بل پر نہیں، بلکہ اس کی فکری قیادت اور اس کے اخلاقی اثر کے بل پر ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ جماعت کے لوگوں کا تعلق کسی دباؤ سے نہیں، بلکہ گہری محبت اور قلبی لگاؤ پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس کے ماتحت جماعت کا ڈسپلن امارت کی دھونس سے نہیں، بلکہ دل کی سمع وطاعت سے قائم ہونا چاہیے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس شخص کو جدوجہد اور کشمکش کے دور میں کسی تحریک کی راہنمائی کرنی ہو، وہ کبھی ان جمہوری طریقوں سے کام نہیں چلا سکتا، جو صرف انتظامی اداروں کی سربراہی کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ اس کے کام کی نوعیت اس کمانڈر کے کام سے ملتی جلتی ہوتی ہے، جو میدان جنگ میں فوج کی قیادت کر رہا ہو۔ وہ دیے ہوئے نقشوں پر فوج کو نہیں لڑا سکتا۔ اپنے نقشے اسے خود سوچنے اور بنانے پڑتے ہیں۔ وہ ہر وقت کونسلیں بلا کر اور ان سے پوچھ پوچھ کر کام نہیں کر سکتا۔ اس کو بسا اوقات فیصلہ کرنے کے لیے گھنٹوں اور منٹوں کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ وہ مشورے لے بھی سکتا ہے اور اسے مشورے دیے بھی جا سکتے ہیں، لیکن اگر تحریک اس کو چلانی ہے تو فیصلہ مشیروں کے ہاتھ میں نہیں، اس کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اگر پہل (Initiative) اس کے اختیار میں نہ ہو تو وہ کمانڈر نہیں، سپاہی ہے۔ اس کو فوج پر یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ اس کی اطاعت کرے گی اور فوج کو اس پر یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ بروقت اور صحیح فیصلہ کرے گا۔ اس کے اور فوج کے درمیان مشیر حائل نہیں ہو سکتے۔ مشترکہ کمانڈ کا حشر میدان جنگ میں وہ ہوا کرتا ہے، جو ساجھے کی ہنڈیا کا حشر چوراہے میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے اور فوج کے درمیان لگے

بندھے قاعدے اور ضابطے بھی حائل نہیں ہو سکتے۔ اسے یہ بھروسا ہونا چاہیے کہ جس وقت، جس کو بھی وہ پیچھے ہٹنے کو کہے گا، وہ ہٹ جائے گا اور جسے آگے بڑھنے کا حکم دے گا وہ بڑھ جائے گا۔ حالت جنگ میں اسے احکام کی وجہ بتانے پر مجبور نہ ہونا چاہیے، کجا کہ اس کو ان کی جواب دہی کرنی پڑ جائے اور جنگ چھوڑ کر وہ ساری فوج مقدمہ بازی میں لگ جائے۔ فوج اگر چاہے تو کمانڈر بدل سکتی ہے، لیکن اگر اسے لڑنا اور اپنے مقصود کو پہنچنا ہے تو جسے بھی وہ کمانڈر بنائے اس کو یہی اختیارات دینے ہوں گے، اور مجبوراً نہیں، بلکہ دلی رضا اور اعتماد کے ساتھ دینے ہوں گے، ورنہ بہتر ہے کہ وہ لڑائی کا خیال چھوڑ دے۔ اس فوج کو شکست ہی کے لیے نہیں، تباہی کے لیے بھی تیار ہو جانا چاہیے، جو عین حالت مقابلہ میں اپنی مخالف طاقتوں کو خبر دے کہ اس کا کمانڈر، کمانڈر نہیں بلکہ جنرل اسٹاف کا محض ایجنٹ ہے، اور جنرل سٹاف ایک مجلس مباحثہ (Debating Society) ہے، جس میں فوجی افسر تدابیر جنگ سے گزر کر خود مقصد جنگ ہی پر دس دس پندرہ پندرہ دن مناظرہ کرتے رہے ہیں، اور ہائی کمانڈ کے فیصلے اب فوجی افسروں کی اکثریت کے ووٹ، یا ان کے گروپوں کی مفاہمت پر موقوف ہو کر رہ گئے ہیں۔

تحریک کی قیادت اور جمہوری اداروں کی سربراہی میں ایک اور پہلو سے بھی فرق اور عظیم فرق ہے۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، جمہوریت یہ نہیں چاہتی کہ اس میں کوئی بھی اتنا زور آور ہو جائے کہ اس کی رائے جمہور کی رائے کے تابع ہونے کے بجائے اس کی حاکم بن جائے۔ ایسا زور جہاں بھی پیدا ہونے لگے گا، جمہوری مزاج اس کو ضرور توڑنا چاہے گا۔ ایک انگریز نے اپنی جمہوریت پسند قوم کے ذہن کی خوب ترجمانی کی ہے کہ "ہم ہیروز کی پرستش تو کرتے ہیں، مگر کسی ہیرو کی حکومت قبول نہیں کر سکتے"۔ یہ ہے جمہوریت کا مزاج۔ لیکن تحریک کے مزاج کا تقاضا اس کے بالکل برعکس ہے۔ کوئی تحریک اس کے بغیر نہیں چل سکتی کہ اس کو ایک شخصیت لے کر چلے، جسے تحریک کے اندر بھی دلوں اور دماغوں پر غیر معمولی اثر حاصل ہو، اور تحریک کے گردوپیش عام پبلک میں بھی اس کے اثرات پھیلتے چلے جائیں۔ دینی تحریک ہو یا دنیوی، ایک شخصیت کے بغیر اس کا کام نہیں چلتا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اسلامی تحریک کے لیے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں سامنے لا کر رکھ دیں اور ان کا غیر معمولی وزن اپنی مشیت ہی سے نہیں، اپنے احکام سے بھی قائم کیا۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد، جب اور جہاں بھی کوئی دینی تحریک اٹھی ہے ایک شخصیت کے بل پر اٹھی ہے، اور بڑی بڑی شخصیتوں نے کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں، بلکہ خدا کے دین کی خاطر یہ ایثار کیا ہے کہ اپنا سارا وزن اس کے

وزن میں شامل کرکے اس کا وزن بڑھایا، اور گردوپیش کی دنیا میں اس کا اثر قائم کیا۔ پچھلی ہی صدی میں خود ہمارا ملک ایک عظیم الشان تحریک جہاد کا نظارہ کر چکا ہے۔ اس نے جو کارنامہ انجام دیا اور جس وسیع پیمانے پر لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا، وہ اس کے کارکنوں کی خوبی سے زیادہ ایک شخصیت کے جادو کا اثر تھا اور اس جادو کو فروغ دینے میں شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئ اور بہت سی دوسری عظیم شخصیتوں نے حصہ لیا تھا۔ اسی صدی میں دو خالص دنیوی تحریکیں ہمارے برعظیم میں چل چکی ہیں۔ ایک نے برطانوی حکومت کا تختہ الٹ کر ہندوستان کو آزاد کرایا اور دوسری نے ہندوؤں کے حلق سے پاکستان اگلوالیا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ جو کچھ بھی کامیابی ان دونوں تحریکوں کو نصیب ہوئی، ایک ایک شخصیت کے بل پر ہی ہوئی اور یہ دیکھ لیجیے کہ وقت کے کیسے کیسے بڑے لوگوں نے اپنی شخصیتوں کو ان دونوں لیڈروں کی شخصیتوں میں گم کر دیا تھا۔ یہ تحریکوں کا فطری مزاج ہے۔ کسی کو دین عزیز ہو یا وطن عزیز ہو، یا قوم عزیز، بہر حال جس کو بھی کسی مقصد عزیز کے لیے کوئی تحریک چلانی ہو، اسے دل کی آمادگی کے ساتھ، یا سینے پر پتھر رکھ کر، ایک شخصیت گوارا کرنی پڑے گی، بلکہ خود بنانی اور دوسروں سے بنوانی پڑے گی۔ جمہوریت اس سے انکار کرتی ہے اور تحریک اس کا تقاضا کرتی ہے۔

میں نے تفصیل کے ساتھ یہ تجزیہ آپ کے سامنے اس لیے کیا ہے کہ آپ اس اجتماع ضدین کو اچھی طرح سمجھ لیں، جس پر جماعت اسلامی نے اپنے نظام کا ڈھانچہ اور اپنے کام کا نقشہ مرتب کیا ہے، اور ان مشکلات کو بھی سمجھ لیں جو آپ کی جماعت کے امیر کو دو بالکل مختلف اور متضاد حیثیتیں نباہنے میں لازماً پیش آتی ہیں۔ اور ایک طرف تو ایک جمہوری جماعت ہیں، جس کا سارا کام ایک لگے بندھے ضابطے اور ایک مقرر دستور پر چلتا ہے اور دوسری طرف آپ ایک تحریک لے کر چلتے ہیں، جو بہت سی مزاحم طاقتوں کے مقابلے میں ایک ہمہ گیر اصلاح و انقلاب کے لیے برسرپیکار ہے۔ ان دونوں کاموں کی سربراہی آپ ایک آدمی کے سپرد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جمہوری ادارے کے ناظم کی حیثیت سے وہ جمہوریت کے سارے تقاضے بھی پورے کرے، اور تحریک کے رہنما کی حیثیت سے ان تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہو، جو جمہوری تقاضوں کی عین ضد ہیں۔ آپ کی جماعت جس روز سے بنی ہے، میں آج تک ان دونوں حیثیتوں کو بھلی طرح یا بری طرح، بہر حال کسی نہ کسی طرح نباہتا رہا ہوں، اور اس پر کسی داد کا نہ طالب ہوں، نہ مستحق۔ جب تک میرے لیے کام کرنے کی کچھ بھی گنجایش رہی، میں نے خدمت سے منہ نہیں موڑا اور ہر طرح کے دردسر برداشت کیے۔ لیکن اب میرے لیے اس اجتماع ضدین کو نباہنا قریب ناممکن ہو چکا ہے۔ میں کسی نظریے اور قیاس کی بنا پر نہیں، بلکہ مسلسل تجربات کی بنا پر،

پوری طرح غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جماعت اسلامی میں جمہوریت اور تحریکیت کا تضاد، اور جماعت کی امارت میں نظم کی سربراہی اور تحریک کی رہنمائی کا تضاد جواب تک کسی نہ کسی طرح ایک مزاج میں سمویا جاتا رہا ہے، اب اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اگر حکمت اور معاملہ فہمی کے ساتھ اس کا علاج بروقت نہ کیا گیا تو یہ جماعت اور تحریک دونوں کو لے ڈوبے گا۔ اس معاملے میں میری ذمہ داری دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آپ سب لوگوں سے زیادہ سخت اور نازک ہے۔ میں بیس پچّیس سال سے اس تحریک کو چلاتا آرہا ہوں اور پندرہ سال سے جماعت کی سربراہی کا بار بھی میرے اوپر ہی رہا ہے، حتّٰی کہ قید کے زمانے میں بھی اس بار سے میں پوری طرح سبکدوش نہیں ہو سکا ہوں۔ میرے لیے یہ برداشت کرنا ممکن نہیں ہے کہ خدا کے دین کی خاطر اس کے بہت سے مخلص بندوں نے جس چیز کی تعمیر کا سربراہ کار مجھے بنایا تھا، اب میری ہی سربراہی میں اس کی تخریب ہو۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اولین فرصت میں تمام رفقائے جماعت کے سامنے وہ وجوہ بھی رکھ دوں، جن کی بنا پر منصب امارت کی دو گونہ اور متضاد ذمہ داریاں میرے سپرد رہنا اس کام کے لیے تباہ کن ہے، اور یہ بھی بتادوں کہ میرے نزدیک اب اس تضاد کے نقصانات سے جماعت اور تحریک کو بچانے کی کیا صورتیں ممکن ہیں۔

جماعت میں جمہوری میلانات اب اس رخ پر چل پڑے ہیں کہ جدوجہد ہی کے مرحلے میں اس کے اندر مختلف الخیال افراد کی گروہ بندی شروع ہو گئی ہے۔ جمہوری نقطہ نظر سے یہ چیز کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں، بلکہ عین تقاضائے جمہوریت ہے۔ آخر چند افراد، جو ایک خیال رکھتے ہوں، کیوں نہ ایک دوسرے سے ربط قائم کریں؟ کیوں نہ تحریر و تقریر اور بحث و گفتگو کے ذریعہ سے اپنے خیالات کی تبلیغ کریں؟ زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں؟ کیوں نہ جماعت کے عام ارکان اور بااثر لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں؟ کیوں نہ باہمی تعاون کے ساتھ جماعتی مشوروں پر اپنا اثر ڈالیں؟ ان میں سے کوئی چیز بھی نہ جمہوریت کے خلاف ہے، نہ اسے ناجائز ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جدوجہد کے مرحلے میں کسی تحریک کی علم بردار جماعت کے اندر جمہوریت کا یہ تجربہ سخت نقصان دہ، بلکہ مہلک ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک گروہ کے مقابلہ میں دوسرے گروہ بھی منظّم ہوں، جماعت کے اندر گروہوں کی کشمکش برپا ہو، امیر جماعت پوری تحریک اور جماعت کا لیڈر نہ رہے۔ بلکہ عملاً جماعت کے اندر اکثریت کا لیڈر بن کر رہ جائے، ایک جگہ اس کی ہدایات پر عمل ہو تو دوسری جگہ ان پر تنقید ہو رہی ہو اور ان کی تعمیل میں کم از کم سرد مہری برتی جائے، جماعت کے عام کارکنوں میں تذبذب،

بے اطمینانی اور دودلی کی کیفیت پیدا ہو جائے، عوام الناس کے سامنے جماعت کے لوگ خود اپنے ان اختلافات کو پیش کر کے اپنی تحریک کی ہوا اکھاڑ دیں۔ امیر جماعت اس حالت کو فروغ پانے دے تو ایک ایسے کام کی بربادی کا مظلمہ اپنی گردن پر لے جو بیس پچیّس سال کی مسلسل کوششوں سے اس ملک میں خدا کے دین کے لیے اس درجے کو پہنچا ہے کہ اب نہ صرف یہاں، بلکہ بیرونی دنیا میں بھی اسلام پسند لوگوں کی امیدیں اس کی کامیابی سے وابستہ ہو رہی ہیں، اور اگر وہ اسے روکنے کی کوشش کرے تو اس پر آمریت اور استبداد کے الزامات عائد ہوں۔ جماعت کے اندر اس کے اپنے دست و بازو اس کے خلاف خم ٹھونک کر کھڑے ہو جائیں۔ جماعت کے باہر علی الاعلان اس کے خلاف پراپیگنڈا شروع ہو جائے۔ اچھے اچھے ذمہ دار لوگ جماعت سے نکلنے پر تیار ہو جائیں۔ اور مخالف طاقتیں اس پھوٹ کو دیکھ کر جماعت کے ان عناصر کی پیٹھ ٹھونکنے لگیں، جن کے طرز فکر کو وہ اپنے مفاد کے لیے زیادہ مفید سمجھیں۔ جدوجہد کے دور میں جمہوریت کا یہ تجربہ ان نتائج کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا، اور بد قسمتی سے یہ نتائج رونما ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

میں نے خوب غور کر کے یہ رائے قائم کی ہے، اور آپ حضرات بھی جذبات سے قطع نظر کر کے غور کریں گے تو اسی رائے پر پہنچیں گے کہ اس حالت میں میرا امیر جماعت رہنا، جماعت اور تحریک کے لیے بہت خطرناک ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ابتدا سے اس تحریک اور اس جماعت کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت کیا رہی ہے، اور جماعت کے اندر ہی نہیں باہر سارے ملک میں، اور ملک سے بھی باہر دنیا میں مجھ کو کیا حیثیت دی جاتی رہی ہے۔ یہ حیثیت بجا ہے یا بے جا، اس سے یہاں بحث نہیں ہے۔ بہر حال یہ ایک امر واقعہ ہے، اور اس کی موجودگی میں یہ بات آپ کے لیے غور طلب ہے کہ اگر میری یہ حیثیت مجروح ہو جائے تو اس سے جماعت کی ساکھ اور اس تحریک کے نفوذ و اثر کو جو نقصان پہنچے گا، اس کی تلافی آپ اور کس طرح کر سکیں گے۔ میں امیر جماعت نہ رہوں اور میرے پاس میرے اخلاقی اثر اور میری دلیل کی طاقت کے سوا کوئی دوسری طاقت نہ ہو، تو میں بتدریج جماعت کو سمجھا کر جمہوریت کے اس قبل از وقت تجربے سے باز رکھ سکتا ہوں۔ لیکن نظام جماعت کا سربراہ بھی اگر اس وقت میں ہی رہوں، تو اس حالت کی اصلاح کے لیے جو کوشش بھی میں کروں گا وہ محض ایک اخلاقی سعی نہ ہو گی، بلکہ اس کے ساتھ نظم و ضبط کی طاقت بھی ہو گی۔ اس صورت میں لاکھ جتن بھی کروں تو میں نہ ایک فریق بننے سے بچ سکتا ہوں اور نہ اس شبہ ہی سے محفوظ رہ سکتا ہوں کہ اس ناوقت جمہوریت سے جماعت کو بچانے کے لیے میری کوشش دینی تحریک کے مفاد کے لیے نہیں، بلکہ اپنی

آمریت برقرار رکھنے کے لیے ہے۔ بیس پچّیس سال تک اس تحریک کی خدمت کرنے سے میری جو کچھ بھی حیثیت بن گئی ہے، وہ اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے، جبکہ جماعت اور اس کے حلقہ اثر کے ہر شخص کو مجھ پر اعتماد ہو۔ اور ہر ایک کے ساتھ میرا تعلق یکساں محبت و اخلاص کا ہو، اور میرا اخلاقی اثر ان لوگوں پر بھی باقی رہے، جو میری رائے سے اختلاف رکھتے ہوں۔ ایک فریق بن جانے اور طرح طرح کے شبہات والزامات سے متہم ہو جانے کے بعد مجھے یہ چیز حاصل نہ رہے گی، اور اس کا نقصان اس سے بہت زیادہ ہو گا، جو بظاہر آپ میرے امارت سے ہٹ جانے میں محسوس کرتے ہیں۔

ایک اور وجہ جو اس سے بھی زیادہ اہم، بلکہ میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ میری جو کچھ بھی شخصیت دین کی تھوڑی سی خدمت کرنے کی وجہ سے بن گئی ہے وہ اب دین کے کام آنے کے بجائے دین کی راہ میں حائل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ بہت سی باتیں جو پہلے جماعت کے حلقوں سے باہر، زیادہ تر مخالفین کی زبانوں سے سنی جاتی تھیں، اور خلاف واقعہ بدگمانی سمجھ کر نظر انداز کر دی جاتی تھیں، اب وہ خود جماعت میں اچھے اچھے ذمہ دار لوگوں کی زبان و قلم پر آنے لگی ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ ان کو بھی نظر انداز کیا جائے۔ جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، اور جن کو میں یقینی ذرائع سے جانتا ہوں، وہ یہ ہیں کہ "میری وجہ سے جماعت اسلامی میں شخصیت پرستی پیدا ہو رہی ہے۔ میری امارت دراصل ایک پیری کی گدی ہے، اور یہ جماعت میرے مریدوں کی جماعت ہے۔ اس جماعت میں میری بات میری دلیل کی طاقت اور میری رہنمائی پر ہوشمندانہ اعتماد کی وجہ سے نہیں چلتی، بلکہ میری شخصیت کے ساتھ لوگوں کی اندھی عقیدت کی وجہ سے چلتی ہے۔ اس میں کسی آزاد فکر اور مستقل رائے رکھنے والے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، کیونکہ وہ میرے مقابلے میں اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ جماعت میں جو کوئی میری بات کی تائید کرتا ہے، اس کی تائید کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ عقل و بصیرت کی بنا پر مجھ سے اتفاق رکھتا ہے، بلکہ دراصل یا تو وہ خوشامدی ہے یا اندھا مرید۔ مجھ سے اختلاف ایک خوبی ہے، کیونکہ وہ اخلاقی جرات اور استقلال رائے کی علامت ہے، اور میری تائید ایک برائی ہے، کیونکہ اس کی وجہ خوشامد یا اندھی عقیدت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس حالت میں ضمیر اور عقل و علم رکھنے والوں کے لیے دو ہی راستے رہ گئے ہیں یا تو وہ جماعت کو چھوڑ کر چلے جائیں، یا پھر جماعت میں رہ کر اس شخصیت کے بت کو توڑنے کی فکر کریں"۔

اپنے بہترین اور عزیز ترین رفقاء کے یہ خیالات جب سے میرے علم میں آئے ہیں، میں اس فکر میں لگ گیا ہوں کہ اب بت کو توڑنے کا اجر و ثواب ان سے پہلے میں خود لوٹ لے جاؤں۔ خدا کی لعنت اس شخصیت پر جو خدا کی راہ میں کام آنے کے بجائے اس کے راستے میں بت بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کو توڑنے کے لیے پہلا کام تو میں یہ کرتا ہوں کہ اس پیری کی گدی کو آپ کے سامنے لات مار کر عام ارکان کی صف میں آرہا ہوں۔ اس سے بھی کام نہ چلے گا تو زبان و قلم پر قفل چڑھا کر کسی گوشے میں بیٹھ جاؤں گا۔ پھر بھی یہ شخصیت راہ خدا میں حائل رہی تو ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں گا۔ میں اس شخصیت کو ختم کرنے کے لیے خود کشی تو نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ جائز نہیں ہے، اور یہ بھی نہیں کر سکتا کہ کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر کے اسے ذلیل کروں۔ البتہ دوسری ہر وہ تدبیر اختیار کرنے کے لیے تیار ہوں، جس سے شخصیت کا یہ بت خدا کے راستے سے ہٹ سکے۔

محترم رفقاء!

یہ ہیں وہ وجوہ، جنہوں نے مجھے اس بات پر مطمئن کر دیا ہے کہ میرا اب جماعت کی امارت سے ہٹ جانا ضروری ہے، اور اس پر ٹھہر نا نقصان دہ۔ کسی کو یہ غلط فہمی لاحق نہ ہونی چاہیے، کہ مجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہے، جس کی جوابدہی سے میں ڈرتا ہوں، اس لیے استعفیٰ دے کر اس پر پردہ ڈال رہا ہوں۔ جو شخص بھی ایسا خیال رکھتا ہو، میں اسے قسم دیتا ہوں کہ میری ذاتی زندگی کا جو عیب بھی اسے معلوم ہے، یا میرے زمانہ امارت کے جس کام کا بھی وہ انصاف، یا دیانت، یا دستور جماعت کے خلاف سمجھتا ہے، اسے یہاں پوری جماعت کے سامنے علی الاعلان پیش کر دے۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہ ہٹوں گا، جب تک اس کی جوابدہی نہ کر لوں اور جماعت کو خدا کا واسطہ دے کر کہوں گا کہ وہ میرے ساتھ کسی رعایت سے کام نہ لے، بلکہ اگر میرے اوپر کوئی الزام ثابت ہو تو میرا استعفیٰ قبول کرنے کے بجائے عدم اعتماد کی تجویز پاس کر کے مجھے معزول کرے۔

اسی طرح اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ میں اپنی کچھ باتیں منوانے کے لیے استعفیٰ کو دھمکی کے طور پر استعمال کر رہا ہوں، تو وہ بھی اپنے دل سے یہ خیال نکال دے۔ میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ میں نے یہ استعفیٰ واپس لینے کے لیے نہیں دیا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرا امیر جماعت رہنا اب اس کام کے لیے مفید نہیں، بلکہ الٹا نقصان دہ ہے، اور اس رائے کے وجوہ میں نے بے کم و کاست آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ اس پر بھی یہ گمانی باقی رہ جائے کہ جب دلیل نہیں چلتی تو میں استعفے کی دھمکی سے کام نکالتا ہوں، تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔

اب میں وضاحت کے ساتھ آپ کو یہ بتاتا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک آیندہ کے لیے کیا انتظام مناسب ہو گا۔

سب سے پہلے آپ کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ جماعت کی قیادت کے لیے کسی طرح کا انتظام پسند کرتے ہیں۔

اس کی ایک شکل یہ ہے کہ آپ امیر جماعت کو صرف نظم جماعت کا سر براہ بنا کر رکھیں اور تحریک کسی ایک شخص کی رہنمائی میں نہ چلے، بلکہ عام جمہوری اداروں کی طرح اجتماعی فیصلوں سے چلے، اور امیر جماعت کا کام ان فیصلوں کو نافذ کرنے سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ اس طرز پر تحریک چلانے کا تجربہ آپ کرنا چاہیں تو کر لیں۔ آپ جماعت میں درجنوں ایسے آدمی پا سکتے ہیں، جو اس حیثیت سے جماعت کے مرکزی صدر کی خدمت انجام دینے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔ میرے ہٹ جانے سے اس صورت میں سرے کوئی خلا واقع نہیں ہوتا۔

دوسری شکل یہ ہے کہ آپ امیر جماعت کو بہ یک وقت اپنے جمہوری نظام کا سر براہ بھی رکھنا چاہیں اور تحریک کا رہنما بھی۔ یہ اگر آپ کی مرضی ہو تو مجھے چھوڑ کر جماعت کے ذمہ دار بزرگوں میں سے جس کو مناسب سمجھیں اپنا امیر چن لیں۔ میں ہر اس شخص کی اطاعت اور وفادارانہ رفاقت کا عہد کرتا ہوں، جسے آپ امیر بنائیں۔ جو خدمت بھی مجھ سے لی جائے گی، اس کے بجالانے میں مجھے ذرا برابر تامل نہ ہو گا۔ میری شخصیت اگر آپ کے منتخب کردہ امیر کی مددگار بن سکے گی تو یہاں پائی جائے گی، ورنہ اس سے نجات پانے کے لیے آپ کو کسی فکر کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔ اس کا استیصال ان شاءاللہ میں خود کروں گا۔

تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نظام جماعت کی امارت اور تحریک اسلامی کی رہنمائی کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں۔ اس صورت میں جماعت کا سارا نظم دستور کے مطابق ایک امیر چلاتا رہے گا اور تحریک بھی اسی جماعتی مشینری کے ذریعے سے چلے گی، مگر تحریک کی رہنمائی ایک ایسا شخص کرے گا، جس کے لیے دستور میں کوئی نام اور کوئی منصب اور کوئی ضابطے کا اختیار و اقتدار نہ ہو گا۔ اس کی جگہ اگر ہو گی تو آپ کے دستور میں نہیں بلکہ آپ کے دلوں میں ہو گی۔ آپ اسے باقاعدہ منتخب نہ کریں، بلکہ محض اعتماد کی بنا پر اس کی رہنمائی قبول کریں گے۔ اس کے پاس اپنے فیصلے نافذ کرنے کے لیے کوئی طاقت نہ ہو گی، بلکہ آپ کا امیر اور آپ کی مجلس شوریٰ اور آپ سب اپنی مرضی سے خود چاہیں گے تو اس کے مشوروں پر چلیں گے اور اس کی قیادت میں کام کریں گے۔ جب تک آپ چاہیں اس کو رہنما بنا کر رکھیں اور اسے اپنا لیڈر مانتے رہیں۔ یہ بالکل آپ کا اپنا اختیاری فعل ہو گا

اور جب کبھی آپ اس سے جان چھڑانا چاہیں، تو یہ بات بالکل کافی ہو گی کہ اس کے کہے پر چلنا چھوڑ دیں۔ اس کے لیے سرے سے کسی جھگڑے اور کسی ضابطے کی کارروائی کا سوال پیدا ہی نہ ہو گا۔

اس آخری صورت کا تجربہ آپ کرنا چاہیں تو نظم جماعت کے لیے بس ایک امیر چن لیجیے۔ رہا رہنمائے تحریک تو وہ آپ کی رائے عام سے خود اس مقام پر آجائے گا۔ اس معاملہ میں کسی رائے دہی اور کسی انتخاب کی کوئی حاجت نہیں، کیونکہ یہ کوئی دستوری چیز نہیں ہے۔

لیکن ضروری تنبیہ کے طور پر میں دو باتیں پہلے ہی آپ سے عرض کیے دیتا ہوں۔ ایک یہ کہ جماعت کی موجودہ شخصیتوں میں سے جس کسی کو بھی آپ رہنمائی کا مقام دیں، وہ اسی صورت میں اس تحریک کی کوئی خدمت انجام دے سکے گا، جبکہ باقی تمام شخصیتیں اس کی پیش روی کو خواستہ یا ناخواستہ گوارا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ دینی لحاظ سے قطع نظر، دنیوی وجاہت و قابلیت اور ناموری کے لحاظ سے ہمارے درمیان شاید ہی کوئی شخصیت اس پائے کی ہو، جس پائے کی شخصیتیں کانگرس میں جمع ہوئی تھیں، مگر آپ نے دیکھا کہ ان لوگوں نے خدا کی خاطر نہیں، کسی اجر آخرت کی امید پر نہیں، صرف آزادی وطن کی خاطر گاندھی کی شخصیت کا نہ صرف تابع ہونا گوارا کیا، بلکہ اس کی بڑائی خود قائم کی اور اس کا نتیجہ آپ سب لوگ دیکھ چکے ہیں۔ ہم بھی اگر دنیا میں خدا کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں تو کسی ایک آدمی کو آگے کر کے سب کو اس کے پیچھے چلنا ہو گا، اور خدا ہی کی خاطر، اس کی شخصیت میں اپنی شخصیتوں کو گم کر دینا پڑے گا۔ یہ قربانی دینے کے لیے کوئی تیار ہو یا نہ ہو، میں اس کے لیے سچے دل سے تیار ہوں۔ آپ جس کو بالاتفاق اپنا رہنما مان لیں گے، میں خدا کو اور آپ سب کو گواہ کر کے اعلان کرتا ہوں کہ اپنا سب کچھ لا کر اس کے قدموں میں ڈال دوں گا۔

دوسری بات جو یہ کام کرنے سے پہلے آپ کو خوب سمجھ لینی چاہیے، وہ یہ ہے کہ کشمکش کے دور میں ایک تحریک کی رہنمائی کا کام ایک ڈرائیور کے کام سے ملتا جلتا ہوتا ہے، جس کے ہاتھ میں آپ موٹر کا اسٹیرنگ وہیل دے رہے ہوں۔ اس کے متعلق اچھی طرح اطمینان کر لیجیے اور چلنے سے پہلے یہ بھی طے کر لیجیے کہ کہاں جانا ہے اور کس طرف سے جانا ہے۔

مزید جو مشورے یا ہدایات بھی آپ دینا چاہیں آغاز سفر میں دے لیجیے۔ لیکن جب ڈرائیور اسٹیرنگ وہیل سنبھال کر پر ہجوم راستوں سے گاڑی لیے جا رہا ہو، اس وقت گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ چاہے، بجائے خود کیسے ہی ماہر ڈرائیور ہوں، اور چاہے خود موٹر کے بنانے والے انجنیئر ہی کیوں نہ ہوں، ڈرائیور کو بار بار مشوروں اور

ہدایات اور احکام اور نقد و تبصرے سے نواز کر صرف حادثہ ہی مول سکتے ہیں، بخیریت منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے کہ اس وقت صرف ڈرائیور ہی کی قوت فیصلہ یہ طے کر سکتی ہے کہ کس ہجوم سے گاڑی کو کس طرح نکالے، آتی جاتی گاڑیوں سے اپنی گاڑی کو کیسے بچائے، کس گاڑی کو آگے نکلنے دے اور کس سے خود آگے نکل جائے، اور ایک طرف سے اگر راستہ بند ہو تو دوسری طرف سے کس طرح اپنا راستہ نکالے۔ ایسے مواقع پر مشورے کی ضرورت ہو گی تو ڈرائیور خود اسے محسوس کر کے مشورہ لے گا، کچھ پوچھنا ہو گا تو وہ خود پوچھے گا، کوئی ہدایت طلب کرنی ہو گی تو خود طلب کرے گا، دوسروں کے لیے، اگر وہ بخیریت سفر کرنا چاہتے ہوں، اس کے سوا کوئی کام نہیں ہے کہ وہ صبر کے ساتھ چلے چلیں۔ حتیٰ کہ اگر حادثہ بھی ہوتا نظر آئے تو ضبط سے کام لیں، اس لیے کہ خطرے کے موقع پر شور مچانے یا اسٹیر نگ وہیل پر ہاتھ ڈالنے کے معنی یہ ہیں کہ حادثہ نہ ہوتا ہو تو ہو جائے۔ آپ ڈرائیور بدلنا چاہیں تو بدل دیں، مگر جسے بھی ڈرائیور بنائیں اس کو اطمینان کے ساتھ گاڑی چلانے دیجیے۔ جو شخص اسے آمریت سمجھ کر اس پر صبر نہ کر سکتا ہو، اس کا گاڑی سے اتر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ خود بھی حادثے سے دوچار ہو اور پوری موٹر کو بھی اس کے مسافروں سمیت خطرے میں مبتلا کرے۔ تاہم اگر آپ لوگ ایک دفعہ تمام موٹر نشینوں کی مشترک ڈرائیوری کا تجربہ کرنا چاہیں تو میں آپ کو اس سے منع نہیں کرتا۔ میں اس میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ جو کچھ آپ سب کا حشر ہو گا میرا بھی ہو جائے گا۔ البتہ اس صورت میں اسٹیر نگ وہیل ہاتھ میں لینے کی ذمہ داری آپ مجھ پر ڈالنا چاہیں گے بھی تو میں اسے کبھی قبول نہیں کروں گا۔ اس اسکیم میں میری جگہ محض ایک خاموش مسافر کی ہو گی، جو گاڑی اور اس کے مسافروں کی سلامتی کے لیے دعا کرنے کے سوا کچھ نہ کرے گا۔

(سید مودودی ـــــ پر عزم زندگی ـــــ گمنام گوشے)
از محمد حسین شمیم۔ ص ۷۷)